غالب اور
انقلابِ ستاون
ڈاکٹر سید معین الرحمٰن
غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

کتاب کا نام : غالب اور انقلاب ستاون
مصنف : ڈاکٹر معین الرحمٰن
سال طبع : ۱۹۸۸ء
مطبع : ثمر آفسٹ پریس۔ کلاں محل دہلی
قیمت : ساٹھ روپے۔

اہتمام : شاہد ماہلی

ناشر :
غالب انسٹی ٹیوٹ
ایوانِ غالب مارگ نئی دہلی

پیش لفظ

پاکستان کے اہلِ قلم میں ڈاکٹر معین الرحمن متعارف شخصیت کے مالک ہیں۔ اُن کی کتاب غالب اور انقلاب ستاون دو بار شائع ہو کر اہلِ نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ اس کتاب میں معین صاحب نے یہ بڑا کام کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے متعلق غالب کی تحریروں کے ضروری اجزا کو یکجا کر دیا ہے اور اس طرح اس واقعے سے متعلق غالب کے طرزِ عمل اور اندازِ فکر کے مختلف گوشے نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ بلا تکلف یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اپنے انداز کی یہ منفرد کتاب ہے۔ اس کتاب میں مرزا صاحب کی معروف فارسی تصنیف دستنبو کا اردو ترجمہ بھی شامل کیا گیا تھا بلکہ صحیح طور پر یوں کہیے کہ دستنبو کے مطالب و مقاصد کو واضح کرنے کے لیے ہی معین صاحب نے اس کتاب کو مرتب کیا تھا۔ (دستنبو کا فارسی متن اس کتاب میں شامل نہیں کیا گیا تھا)۔

اس کتاب کے مشتملات کی افادیت کے پیشِ نظر غالب انسٹی ٹیوٹ کی پبلیکیشن کمیٹی نے یہ طے کیا تھا کہ اس کتاب کو انسٹی ٹیوٹ کے سلسلۂ مطبوعات کے تحت شائع کیا جائے۔ مجھے مسرت ہے کہ میری درخواست پر مصنف نے بخوشی اس کی اجازت دے دی اور کتاب میں بعض ضروری ترمیمیں بھی کر دیں۔

انسٹی ٹیوٹ کے مقاصد میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مرزا صاحب کی جملہ تصانیف کو ضروری اہتمام کے ساتھ از سرِ نو شائع کیا جائے۔ اُن کی فارسی تصنیف دستنبو بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یوں یہ بھی مناسب خیال کیا گیا کہ اس نئی اشاعت میں دستنبو کا فارسی متن بھی شامل کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں شروع میں ایک یہ مشکل سامنے آئی کہ دستنبو کی پہلی اشاعت کے جو دو تین نسخے میرے علم میں یہاں ہیں، اُن کا حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ حُسنِ اتفاق سے رسالۂ

نقوش کے اڈیٹر محمد طفیل مرحوم کی برسی کے سلسلے میں میرا لاہور جانا ہوا اور وہاں پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں دستنبو کی اشاعتِ اوّل کا نسخہ محفوظ تھا۔ معین صاحب کی مدد سے اُس کا عکس حاصل کیا گیا اور اِس طرح یہ مشکل بھی حل ہو گئی اور اب یہ کتاب دستنبو کے فارسی کے متن کے اضافے کے ساتھ شائع ہو رہی ہے۔

یہاں دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ دستنبو کی اشاعتِ اوّل کا متن شائع کیا جا رہا ہے، جب کہ مرزا صاحب کی زندگی میں یہ کتاب اُس کے بعد بھی شائع ہوئی تھی اور بعض ترمیموں کے ساتھ (اِس سلسلے کی تفصیلات معین صاحب لکھ چکے ہیں) اگر اصولِ تدوین پیشِ نظر رکھی جائے تو مصنف کی زندگی میں شائع شدہ آخری اڈیشن کو شائع کیا جانا چاہیے تھا، مگر یہاں دانستہ اِس اصول سے انحراف کیا گیا ہے اور اِس انحراف کو ضروری سمجھا گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اصل مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں مرزا صاحب نے جب پہلی بار اِس کتاب کو لکھا تھا، تو اس کو اپنی پنشن وغیرہ کے سلسلے میں سفارشی دستاویز کے طور پر کس طرح تیار کیا تھا (اسے انگریزوں کے سامنے پیش کیا جانا تھا) اس لحاظ سے اِس کی وہی صورت شکل سامنے آنا چاہیے جو پہلی بار تھی۔ بعد کو اگر کوئی ترمیم کی گئی، تو اُس کی بجائے خود جو بھی اہمیت ہو، لیکن اس مقصود کے لحاظ سے اُس کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے۔ چوں کہ معین صاحب نے دستنبو کی مختلف اشاعتوں کا حوال تفصیل سے بیان کر دیا ہے، اِس لیے آخری نسخے کی تفصیلات بھی سامنے آ جاتی ہیں اور یوں کسی طرح کی کمی نہیں رہتی۔ اگر آخری اشاعت کے متن کا عکس اِس کتاب میں شامل کیا جاتا، تو خواہ اُصولِ تدوین کے لحاظ سے یہ بات درست ہوتی، مگر اصل واقعے کی مکمل وضاحت کے اعتبار سے یہ طریقۂ کار نادرست قرار پاتا۔

اشاعتِ اوّل کے متن کو عکسی صورت میں شاملِ کتاب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس طرح (الف) کتاب کی پہلی شکل صورت سامنے آ جائے گی، یعنی جس طرح مرزا صاحب نے پہلی بار اُسے شائع کیا تھا۔ (ب) اغلاطِ کتابت کا اضافہ نہیں ہو گا جس کا امکان دوبارہ کتابت کرانے کی صورت میں ہمیشہ رہا کرتا ہے۔

دوسری وضاحت طلب بات "بالمکند برہمن" کا نام ہے۔ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں دستنبو کی اشاعتِ اوّل کا جو نسخہ محفوظ ہے اُس کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اُس کے آخر میں غالب کے قلم سے یہ عبارت لکھی ہوئی ہے : "نورِ چشم بالمکند برہمن این رسالہ را بہ دفعِ چشم زخم و بہر تعویذ بازو سازند۔" اس تحریر کے نیچے غالب کے دستخط تو موجود نہیں، مگر اُن کی مہر موجود ہے۔ (اس لحاظ سے دستنبو کا یہ نادر نسخہ ہے) مرزا صاحب نے دستنبو کے آخر میں جہاں اُن ہندو احباب اور شاگردوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے پریشانی کے اُن دنوں میں مختلف اعتبارات سے اُن کی خبر گیری کی اور غم گسار رہے، اور اِس سلسلے میں مہیش داس کا نام لیا ہے (جنھوں نے مرزا صاحب کے لیے دیسی شراب فراہم کی تھی) اور ہیرا سنگھ کا ذکر کیا ہے (جو اُن بے کسی کے دنوں میں برابر اُن کے پاس آتے رہتے تھے) وہیں "شیوجی رام برہمن" اور اُن کے لڑکے بالمکند کا بھی ذکر کیا ہے :

"دیگر از مردمِ این شہرِ نیم ویران نیم آباد شیوجی رام برہمن برہما نژاد کہ جوانِ خردمند و مرا بجای فرزند است، این درویشِ دل ریش را کمتر تنہا می گزارد و بہ اندازۂ تاب و توانِ خویش فرمانبری و کارسازی بجا می آرد و پسرش بالمکند کہ نوجوانِ نیک خوی پارسا ست نیز ہمچوں پدرِ خویش در فرمان پزیری چُست و در رامندہ گُساری یکتا ست۔"

(دستنبو، طبعِ اوّل، ص ۷۱)

یہ وضاحت یوں بھی ضروری تھی کہ بالمکند نام کے مرزا صاحب کے ایک شاگرد بھی تھے جن کا تخلص بے صبر تھا اور جو سکندر آباد (ضلع بلند شہر) کے رہنے والے تھے، مگر وہ کایستھ تھے۔ بہ ظاہر یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ یہ "بالمکند برہمن" شاعر نہیں تھے، صرف معتقد اور نیاز مند تھے۔ "شیوجی برہمن" سے غالب کے مراسم کا تو ال کیا تھا، اِس کے متعلق مجھے کچھ بھی معلوم نہیں، غالب نے جس طرح اُن کا ذکر کیا ہے، اُس سے بہ ظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا صاحب اُن کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اور غالباً اسی نسبت سے اُن کا لڑکا بالمکند بھی مرزا صاحب کے نیاز مندوں میں شامل تھا۔ انھوں نے دستنبو کا ایک نسخہ

اپنی تحریر اور مُہر کے ساتھ جو بالمکند کو دیا. تو اس سے واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس خاندان سے مرزا صاحب کے خصوصی مراسم تھے اور بالمکند کو وہ بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

اس تحریر میں مرزا صاحب نے یہ جو لکھا ہے کہ: "این رسالہ را برای دفعِ چشم زخمِ دہر تعویذ بازو سازند" اس میں 'دہر' کی تخصیص گہری معنویت سے خالی نہیں۔ مطلب مرزا صاحب کا یہی ہے کہ یہ رسالہ اس زمانے میں انگریزی حکومت کے جبر و ستم سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ معین صاحب نے دستنبو کی غایتِ تصنیف کے ذیل میں جو بحث کی ہے اور جس میں یہ ثابت کیا ہے کہ مرزا صاحب نے اس کتاب کو روزنامچے کے طور پر نہیں لکھا تھا (جیسا کہ وہ دعوا کرتے رہے) بل کہ انھوں نے اسے انگریزوں کو اپنی بے گناہی اور وفاداری کا یقین دلانے کے لیے اور اپنے خطاب، خلعت، پنشن اور اعزاز کو واگزار کرانے کے لیے باقاعدہ تصنیف کیا تھا۔ اس بحث کی روشنی میں اس مختصر سی عبارت کو دیکھا جائے تو "چشم زخمِ دہر" کی تخصیص کی معنویت روشن ہو گی۔

مجھے توقع ہے کہ یہ کتاب مختلف اعتبارات سے غالب فہمی کی روایت کی توسیع میں معاون ثابت ہو گی۔

رشید حسن خاں　　　　۳۱ دسمبر ۱۹۸۷ء

مُندرجات :

اُستادِ محترم
پروفیسر ڈاکٹر غلام مُصطفےٰ خاں صاحب قبلہ
کی نذر

دیباچہ

پیشِ نظر کتاب کو چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصّہ انقلاب ۱۸۵۷ء سے متعلق غالب کے فارسی روز نامچے "دستنبو[1]" کے تعارف پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصّہ "دستنبو" کے فارسی متن اور اُردو ترجمے پر مبنی ہے۔ تیسرا حصّہ سنہ ستاون کے بارے میں غالب کے غیر رسمی نقطۂ نظر کا حامل ہے، اِس کا ماخذ غالب کے خطوط ہیں، اور آخری حصّۂ کتاب میں انقلابِ ستاون اور غالب کے شعری رویّے سے بحث کی گئی ہے۔

(۱)

دستنبو اپنے مضمون و موضوع اور اندازِ نگارش و گزارش ہر دو کی بنا پر تصانیفِ غالب میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ غالب نے یہ کتاب ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دنوں میں روز نامچے کے انداز میں لکھی۔ کتاب میں بعدِ توطیہ و تمہید ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ رجولائی ۱۸۵۸ء تک مصنّف کی سرگذشت بیان ہوئی ہے۔ بہ حیثیتِ اقتضائے مقام کتاب میں عام واقعات و حالات اور بر بنائے تقریب شہر و سپاہ کی روداد بھی آگئی ہے۔ اور یہ سرگذشت ایسی فارسیِ قدیم میں بیان ہوئی ہے جس میں نہ خود غالب کی کوئی اور کتاب لکھی گئی اور نہ دستنبو

---

[1] "دست انبو و دست انبوی": رک: "دست انبویہ" (یار دست انبو بہ تم داد و دستم بو گرفت)

"دست انبویہ" گلولہ اے باشد مرکب از عطریات کہ آنرا بجہتِ بوییدن بر دست گیرند و بہ عربی شمامہ خوانند۔ و ہر میوہ اے را کہ توان بوبید عموماً۔ و نباتی باشد کوچک و گرد و الوان شبیہ بخربزہ کہ آنرا دستنبوی گویند خصوصاً"۔

(بُرہانِ قاطع جلدِ دُوم، مرتّبہ: دکتر محمّد معین، تہران ۱۳۳۱ شمسی، ص ۸۵۶)

کے لکھے جانے کے بعد سے آج تک برِعظیم پاک و ہند میں کسی اور نے کوئی کتاب اِس زبان میں لکھی ۔

روداد نگاری کی کیفیت بیان کرتے ہوئے، غالبؔ نے دستنبو میں ایک موقع پر لکھا ہے کہ:

"اس کتاب میں شروع سے آخر تک اُن حالات کا ذکر ہے جو مجھ پر گزر رہے ہیں، یا اُن واقعات کا ذکر ہے جو سُننے میں آئے ہیں۔ میں نے جو شنیدہ حالات لکھے ہیں تو کوئی یہ خیال نہ کرے کہ میں نے جھوٹ باتیں سُنی ہوں گی یا کچھ کم کر کے لکھی ہوں گی۔ میں دار و گیر سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں، اور سچائی میں نجات ڈھونڈتا ہوں۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ نے خدا کی پناہ نہیں چاہی، بلکہ انگریز ناخداؤں کی پناہ چاہی، جنھوں نے دار و گیر کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ غالبؔ نے اپنی نجات ضرور ڈھونڈی، لیکن یہ فی الوقت انھیں سچائی میں دکھائی نہیں دیتی تھی، اِس لیے اُنھوں نے حالات کو جہاں تہاں نہ صرف "کچھ کم کر کے" بلکہ رنگ آمیزی کے ساتھ "بڑھا چڑھا کر" بھی پیش کیا۔

○

دستنبو پہلی بار نومبر ۱۸۵۸ء میں مطبع مفیدِ خلائق، آگرہ سے چھپی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پریس کی آزادی مسدود کی جا چکی تھی۔ ۱۳؍ جون ۱۸۵۷ء کو گورنر جنرل لارڈ کیننگ کے حکم پر جدّ و جہدِ آزادی کی تائید و ترغیب کے "جرم" میں ایک سخت پریس ایکٹ نافذ کر دیا گیا تھا۔ اخباروں پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ انضباطی کارروائیاں عمل میں آ رہی تھیں۔ طابع، ناشر اور اڈیٹر دار و گیر کا نشانہ بن رہے تھے۔ گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اپنے ایک مراسلے (مورخہ ۴؍ جولائی ۱۸۵۷ء) میں کورٹ آف ڈائریکٹرز کو بغاوت کے حالات

کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا:

"کلکتے کے ایک لیتھوگرافک پریس کا اجازت نامہ بھی ہم نے منسوخ کر دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ اس چھاپے خانے کا تمام سامان ضبط کر لیا جائے۔ یہ قدم ہم نے اِس وجہ سے اُٹھایا کہ اِسی چھاپے خانے میں ایک فارسی اخبار..... چھپتا تھا جس میں ..... دو انتہائی باغیانہ مضامین شائع ہوئے تھے[1]"

"باغیانہ مضامین" کی اشاعت پر مقدمات چلائے جا رہے تھے، پریس کے اجازت نامے منسوخ ہو رہے تھے، اخبار جبری بندش کی زد میں آ رہے تھے اور بجائے خود پریس بحقِ سرکار ضبط ہو رہے تھے۔ اِن حالات میں کسی ایسی کتاب کی اشاعت و طباعت کی ہند میں کیا گنجایش ہو سکتی تھی جو انگریز حکامِ عالی مدار کی تائید میں نہ ہو۔ چنانچہ جب ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب نے اپنے عزیز شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا کہ:

"میں نے آغازِ یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے سی و یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک کی رودادِ شہر یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے... اگر آگرے میں اس کا چھاپا ہو سکے تو مجھ کو اطلاع کرو۔"

تو تفتہ کا تذبذب میں پڑ جانا قدرتی اور یقینی امر تھا۔ غالب اُستادِ شاہ تھے، کہیں یہ رودادِ شہر بہادر شاہ کی تائید و تحسین اور کمپنی بہادر کے اقدامات کی تردید و تنقیص میں نہ ہو؟ تازہ عائد پریس ایکٹ کی موجودگی میں از قسم "باغیانہ" کسی تحریر اور وہ بھی کتابی حجم کی تحریر کی طباعت و اشاعت کے لیے کسی پریس کو آسانی سے کیوں کر تیار کیا جا سکتا تھا؟ تفتہ نے جواباً اس نوع کے خدشات کا

---

1. Parliamentary Papers, Vol. 44, Pt. I, P. 363.
(بحوالہ: اٹھارہ سو ستاون اور اخبارات، محمد عتیق صدیقی، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء، ص ۴۴)

اظہار کیا۔ اِس پر غالبؔ نے اُنھیں دستنبو کے اوراق بھیجے اور کتاب کے اندازِ نگارش و گزارش کی حقیقت اِن لفظوں میں بیان کی :

"چھاپے کے باب میں جو آپ نے لکھا، وہ معلوم ہُوا۔ اس تحریر کو جب دیکھو گے، تب جانو گے اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں اِس واسطے ہے کہ اُس میں سے ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر (لارڈ کیننگ) کی نذر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعہ اُن کے، جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر کروں گا۔ اَب سمجھ لو کہ طرزِ تحریر کیا ہوگی اور صاحبانِ مطبع کو اس کا انطباع کیوں نامطبوع ہوگا ؟ " (بہ نام تفتہ، ما بین ۷ اور ۲۳ اگست ۱۸۵۸ء)

اس معنی خیز اور اطمینان بخش وضاحت کے بعد کتاب کی اشاعت میں رُکاوٹ نہیں ہونی چاہیے تھی۔ بایں ہمہ احتیاطاً :

"صاحبِ مطبع نے بشمولِ سعیِ منشی ہرگوپال تفتہ (دستنبو کا مسوّدہ) آگرے کے حُکّام کو دکھایا، (چھاپنے کی) اجازت چاہی۔ حکّام نے بہ کمال خوشی اجازت دی۔

(بہ نام مجروح، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

اور کتاب دستنبو نومبر ۱۸۵۸ء میں چھپ گئی۔

اس پس منظر میں دیکھیے کہ دستنبو جون ۱۸۵۷ء کے جابرانہ پریس ایکٹ کے باوجود چھپ سکی، صاحبانِ مطبع کو اس کا انطباع نامطبوع نہ ہُوا اور انگریز حکّام نے پیشگی ملاحظے کے بعد "بہ کمالِ خوشی" اس کے چھاپنے کی اجازت دی تو اِسی بنا پر کہ دستنبو میں غالبؔ بہ قولِ شخصے انگریز کی زبان سے بولے ہیں اور انھوں نے مصلحت کے قلم سے اِسے لکھا ہے :

"دیوان کے دیکھنے نہ دیکھنے میں آپ کو اختیار ہے، مگر یہ چار جزو کا رسالہ (دستنبو) جواب بھیجا ہے، اس کا دیکھنا ضرور درکار ہے۔

فارسیِ قدیم اور پھر حُسنِ معنی اور صنعتِ الفاظ، بایں ہمہ ہر امر
کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ۔"

(غالب، بہ نام نواب محمّد یوسف علی خاں، والیِ رام پور، نومبر ۱۸۵۸ء)

حقیقت یہ ہے کہ کتاب یک طرفہ، مدحیہ، تائیدی اور تحسینی ہے۔ اس میں انگریز حکّام سے سوچی سمجھی وفاداری کا اظہار کیا گیا ہے اور غالب کا سارا زورِ بیان انگریزوں کی وکالت اور اپنی مدافعت میں صرف ہوا ہے۔

○

دستنبو کی غرضِ تصنیف قلعۂ معلّا سے اپنے تعلّق کے داغ کو مٹانا اور تحریکِ آزادی کو "رستخیزِ بے جا" قرار دے کر انگریز حکّام با اختیار کی نظر میں سُرخرو ہونا تھا۔ اور سُرخرو ہونا، محض سُرخرو ہونے ہی کے لیے نہیں تھا، حکّامِ وقت کو اپنی وفاداری کے یقین دلانے کی غایتِ اصلی پنسن کے اِجرا کی آرزو، اور خطاب و خلعت پانے کی تمنّا تھی۔

"کاش! میری ان تین خواہشوں، یعنی: خطاب و خلعت اور پنشن کے اِجرا کا حکم شہنشاہ فیروز بخت کے حضور سے آجائے، جن کے متعلق میں نے اس تحریر میں بھی (کچھ) لکھا ہے۔ میری آنکھیں اور میرا دل انھیں کی طرف لگا ہوا ہے۔۔۔۔۔۔ اگر ملکۂ عالم کی بخشش سے میں کچھ حاصل کرلوں گا تو اس دُنیا سے ناکام نہیں جاؤں گا۔"

(خاتمۂ دستنبو)

انگریز حکّام کے لیے دستنبو کی پُرتکلّف جلدوں کے اہتمام اور انصرام، قصیدۂ تہنیتِ فتحِ ہند کی تصنیف، اس کے شہرت پا جانے کی آرزو و تدبیر ملکۂ انگلستان اور عالی مقام حکّام تک کتاب پہنچانے کی جلدی اور ذی شان صاحبانِ انگریز سے روابط بڑھانے اور رہ و رسمِ مراسلت کی فکرِ تجدید کی تفصیلات سے غالب کے خط بھرے پڑے ہیں۔ یہ سب صورتیں اپنے مقصودِ اصلی

پنشن، خطاب اور خلعت کے لیے راہ ہموار کرنے کی ہی کڑیاں ہیں۔ چنانچہ ذاتی تحفظ اور فروغِ مراتب کی غرض سے لکھی گئی اس کتاب کے مندرجات کو "حقیقتِ واقعی" کے بہ منزلہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس سرگذشت کی تسوید و تحریر خاص مصلحتوں کی تابع رہی ہے، جس نے بطورِ کتابِ تاریخ اس کی اہمیت اور افادیت کو شدید ضعف پہنچایا ہے۔ بایں ہمہ اس کی یہ اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس سے غالب کے کچھ سوانح پر روشنی پڑتی ہے، اور بالخصوص اُن کے اُفتادِ مزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

○

"میں نے گیارھویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد نثر میں بعبارتِ فارسی ناآمیختہ بہ عربی لکھی ہے۔ دستنبو اس کا نام رکھا ہے۔"

(غالب، بہ نامِ انور الدولہ شفق، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"فارسی، بے آمیزشِ لفظِ عربی لکھی ہے اور فارسی بھی وہ فارسیِ قدیم کہ جس کا اب پارس کے بلاد میں نشان نہیں رہا، تابہ ہندوستان چہ رسد؟" (غلام نجف خاں (؟) ۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء)

"التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسیِ قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظِ عربی نہ آئے۔ جو نظم اس نثر میں درج ہے وہ بھی بے آمیزشِ لفظِ عربی ہے۔ ہاں، اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے۔ وہ عربی، انگریزی، ہندی، جو ہیں، وہ لکھ دیے ہیں۔"

(منشی ہرگوپال تفتہ، ۱۷ اگست ۱۸۵۸ء)

"بطریقِ لزومِ مالایلزم اس کا التزام کیا ہے کہ بزبانِ فارسیِ قدیم، جو دساتیر کی زبان ہے اُس میں یہ نسخہ لکھا جاوے اور سوائے اسما کے کہ وہ بدلے نہیں جاتے، کوئی لغتِ عربی اُس میں نہ آوے۔" (چودھری

عبدالغفور سرورؔ، ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء)

"نثرِ فارسی زبانِ قدیم میں ہے کہ جس میں کوئی لفظِ عربی نہ آئے۔"

(یوسف علی خاں عزیزؔ، ۱۸۵۹ء)

"کتابِ مستطابِ نایاب بہ زبانِ فارسیِ قدیم بے آمیزشِ لفظِ عربی۔"

(سرورقِ دستنبو، نومبر ۱۸۵۸ء)

○

کتابِ مستطاب بالاعلان قدیم فارسی میں پیش کرنا حکمت سے خالی نہیں تھا۔
اس روزنامچے کو دساتیر کی جناتی زبان میں لکھ کر غالبؔ نے دُہرا فائدہ اٹھایا۔ پہلی بات تو کمالِ فن کا اظہار و اشتہار، یعنی غالبؔ نے "دستنبو" کو اپنے اس احساس کے منہ بولتے ثبوت کے طور پر پیش کیا کہ وہ فارسی کے علم میں یکتا و یگانہ ہیں اور خالص فارسی زبان پر جیسی قدرت اور دسترس انھیں حاصل ہے، آج اس کی نظیر اور مثال، کیا ہند اور کیا پارس، کہیں نہیں۔

دوسری بات یہ کہ غالبؔ جس معاشرے کے فرد تھے، وہ پُرانے نظام کا حامی اور نئی عمل داری سے نفور تھا۔ جمیع اہلِ ہند، کیا ہندو کیا مسلمان، بہادر شاہ ظفرؔ سے کسی نہ کسی درجے میں عقیدت اور محبت رکھتے تھے اور ان کے دل بادشاہ کی عزت اور عظمت سے یکسر خالی نہ تھے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کی ذاتی اہلیت کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں، مگر اس میں شُبہ نہیں کہ: "اُس کی حیثیت ایک علامت اور ایک نشانی کی تھی۔ وہ ڈوبتا ہوا سورج سہی، لیکن وہ ایک ایسی صبح کی شام تھا جس میں ہندوستان نے اپنے سیاسی وقار اور تمدنی عظمت کے نادر جلوے دیکھے تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ طاقتیں تک جو کچھ عرصے سے سلطنتِ مغلیہ کے مدِمقابل آگئی تھیں، (۱۸۵۷ء) میں بہادر شاہ کے گرد جمع ہو گئیں۔"[۱]

۱۔ خلیق احمد نظامی، مقدمہ: ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۲۱۔

شاہ کے مقابلے میں فرنگیوں کے لیے اہلِ ہند کے دل میں گو پہلے بھی کوئی جگہ نہیں تھی، لیکن ۱۸۵۷ء کی دار و گیر نے اُن کے دلوں میں فاصلہ بہت ہی بڑھا دیا۔ انگریز حکّام کی بے جواز تائید و تحسین میں کتاب لکھنے کا نتیجہ معاشرے میں انگشت نمائی کا باعث ہوسکتا تھا۔ اس سے بچنے کے لیے غالب نے یہ سرگزشت مُتعارف اور مُروّجہ فارسی میں لکھنے کے بجائے، فارسیِ قدیم میں لکھی اور فارسی بھی وہ فارسیِ قدیم کہ جس کا ہندوستان کا تو کیا مذکور، پارس کے بلاد میں بھی نشان نہیں رہا تھا، تاکہ کتاب کے مندرجات بیش تر اہلِ ہند کے لیے سربستہ راز رہیں۔

مختصر یہ کہ اپنے عہد کی مُتعارف اور مُروّجہ فارسی کی جگہ، بعبارتِ فارسی ناآمیختہ بہ عربی میں یہ روداد لکھنے میں ایک حکمت تو یہ تھی کہ اس نادر و بے گانہ روشِ تحریر کو اپنے کمالِ فن کے طور پر پیش کرنا مقصود تھا اور دوسری مصلحت اُس میں یہ تھی کہ معاصر اہلِ ہند کے لیے کتاب، قفلِ ابجد ہو کر رہ جائے۔ انگریز حکّام کو تو، جو اس کتاب کے مخاطب تھے، بہر نوع اپنے فارسی خواں عملے کے ذریعے اِس قفل کو کھلوانا ہی تھا، غالب کی چال یہ تھی کہ کتاب اپنے ناآشنا طرزِ تحریر کی وجہ سے ہندوستانیوں کے لیے سربستہ راز رہے تاکہ وہ اُن میں ہدفِ ملامت بننے سے محفوظ رہیں۔

غالب کو اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیابی ہُوئی۔ ایک طرف انگریز حکّام نے اُن کے کمالِ فن کی داد دی۔ پنشن کی بحالی کی سفارش ہُوئی، عالی مقام حکّام سے رہ و رسمِ مراسلت بدستور جاری ہو گئی، اُن کی خوشنودی اور سرپرستی حاصل ہو گئی، قلعۂ مُعلّا سے تعلق کی صفائی ہو گئی، عذرِ بے گناہی مسموع ہُوا۔ اک گونہ سکون ہُوا۔ پنشن کا زرِ مجتمعہ سہ سالہ پائی پائی مل گیا۔ آئندہ کے لیے خرخشہ نہ رہا۔ پچھلا خلعت بحال ہو گیا اور دوسری طرف کتاب اہلِ ہند میں بالعموم نہیں سمجھی گئی۔

(۲)

"یہ جو تم نے لکھا ہے کہ صاحب نے سُن کر اس کو پسند کیا، میں حیران

بتوں کہ کون سا مقام تم نے پڑھا ہوگا۔ کیوں کر کہوں کہ صاحب
"دستنبو" کی اس عبارت کو سمجھے ہوں گے؟۔ اس کی جو حقیقت ہو مفصل
لکھو۔" (غالب بہ نام آرام ۲۱ راگست ۱۸۵۸ء)

"مبالغہ اس کتاب (دستنبو) کی تصحیح میں اس لیے کرتا ہوں کہ عبارت
کا ڈھنگ نیا ہے۔ صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے اگر غلط ہو جائے
تو پھر وہ عبارت نری خرافات ہے۔"

(بہ نام مہتر، ستمبر ۱۸۵۸ء)

"یہ کتاب (دستنبو) جو مُرسل الیہ کے مطالعے میں ہے، پھر بہ نسبت
اُس دوسری کتاب کے قسمت کی اچھی ہے۔ یعنی خود ملاحظہ فرمارہے
ہیں اور کہیں پوچھنا ہوگا تو یقین ہے کہ آپ سے پوچھیں گے۔"

(بہ نام بجنیتہ، دسمبر ۱۸۵۸ء)

"جن کو اس (دستنبو) کے دیکھنے کا حکم ہوا ہے، وہ اہلِ علم میں سے ہیں
لیکن یہ طرزِ تحریر، میں نہیں کہتا کہ یہ نادر ہے، مگر بے گانہ و ناآشنا
ہے۔ خدا کرے وہ جو اس کی سیر پہ مامور ہیں ان اوراق کو بہ مشورت
آپ کے دیکھا کریں اور کہیں کہیں آپ سے پوچھ لیا کریں۔"

(بہ نام بجنیتہ، دسمبر ۱۸۵۸ء)

غالب کا احساس یہ تھا کہ "دستنبو" کی عبارت کو محض دُرست پڑھنا بھی
بڑی بات ہے، فہمِ عبارت تو بہت دور کی بات ہے، سو وہ بھی ہر ایک کے بس کی
بات نہیں۔ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے اور طرزِ تحریر نادر نہ سہی، بے گانہ و ناآشنا
ضرور ہے، اس لیے اہلِ علم و فضل بھی اس عبارت پر سے سرسری گزر سکتے ہیں۔
اور ایسا ہی ہُوا کہ کتاب اچھے اچھوں کی سمجھ سے بالا رہی۔ یہ اسی شعوری کوشش
کے ساتھ لکھی بھی گئی تھی۔

"دستنبو" مُشیر الدولہ راے امید سنگھ بہادر کی مالی اعانت سے چھپنا شروع

ہوئی تھی۔ وہ دہلی کالج کے فارغ التحصیل اور والیِ اندور کے اتالیق تھے لیکن "دستنبو" کی عبارت فہمی، غالب کے نزدیک اُن تک کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ "دستنبو" رائے صاحب کو باقاعدہ پڑھائی جائے[۱]

غالب نے منشی ہرگوپال تفتہ، مرزا حاتم علی بیگ مہر، منشی شیونرائن آرام، منشی نبی بخش حقیر، اور اُن کے صاحبزادے منشی عبداللطیف پر مشتمل ایک "کونسل" تشکیل[۲] دے دی تھی، جو آگرے میں کتاب کی تحریر، تصحیح، تزئین، تصحیف، تجلید اور طباعت واشاعت کے لیے سرگرمِ عمل تھی۔ ترتیب وکتابت اور اشاعت و طباعت کی ساری جزئیات ان اصحاب کے باہم مشورے سے طے پاتی تھیں۔ ایک ایسی شہادت موجود ہے کہ یہ "کونسل" جو غالب کے بعد کتاب سے سب سے زیادہ متعلق تھی، کتاب کی "حقیقت" جاننے[۳] سے معذور رہی۔

عہدِ غالب میں، جب کہ ہر طرف فارسی ہی کا چلن تھا، کتاب فہمی کی یہ سطح اور شرح رہی ہو، تو روز بروز فارسی سے ناآشنا ہونے والی اُردو دنیا میں اب اس کے سمجھنے والے جتنے ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر مروجہ اور غیر متعارف فارسی میں ہونے کی بنا پر "دستنبو" عہدِ موجودہ کے لیے عملاً خزانۂ دربستہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے براہِ راست اخذِ مطالب کرنے والوں کی تعداد آج بہت زیادہ نہیں۔

اِس نُدرت اور ضرورت کے پیشِ نظر اگلے صفحات میں "دستنبو" کے تفصیلی تعارف کے ساتھ ساتھ پوری کتاب کا اُردو ترجمہ بھی شامل کیا جارہا ہے، تاکہ عام قاری بھی اس کتاب کے نہاں خانے میں جھانک کر جان سکے کہ غالب نے اس میں

۱۔ نامۂ غالب بہ نام تفتہ، مورخہ ۲۸ اگست ۱۸۵۸ء، یکم ستمبر ۱۸۵۸ء۔

۲۔ خطوطِ غالب، مولانا غلام رسول مہر، جلد اوّل، لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۷۰، ۷۴، ۱۹۲، ۱۹۵

۳۔ نامۂ غالب، بہ نام آرام، اواخر اکتوبر ۱۸۵۸ء۔

کہا گیا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ "دستنبو" کا اتنا مفصّل جائزہ اور اس کا اُردو ترجمہ کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

(۳)

"صاحب! کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے آ پڑا ہے ..... اور پھر کام کیسا، کہ جس میں میری جان اُلجھی ہوئی ہے اور میں نے اس کو اپنے بہت سے مطالب کے حُصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔ خدا کے واسطے پہلو تہی نہ کرو اور بہ دل "دستنبو" کی طباعت پر توجّہ فرماؤ۔"

(غالبؔ بہ نام تفتہ، ۳ ستمبر ۱۸۵۸ء)

غالبؔ نے "دستنبو" کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا اور بنایا، اور یہ مقاصد و مطالب انگریزوں سے وابستہ تھے، اس لیے انھوں نے انگریزوں کی معقولیت کے گُن گائے ہیں، اُن کے مظالم کے لیے جواز پیدا کیے ہیں، زیادتیوں کو بہت کچھ کم کر کے بیان کیا ہے اور اُن کی سختیوں کو فطری و معمولی قرار دیا ہے۔ جب کہ دیسی سپاہیوں کو شوریدہ سر، دیوانہ و آوارہ، بد باطن، بے رحم قاتل بتایا ہے اور انھیں خبیث، خنزیر اور نمک حرام فسادی ٹھہرایا ہے اور اُن کے طرزِ عمل کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ دراصل یہ کتاب قومی نقطۂ نظر سے لکھی ہی نہیں گئی۔ یہ اپنی مدافعت اور انگریز حکومت کی خیر خواہی میں ہے۔

اس کے برعکس ۱۸۵۷ء کے "فتنہ و فساد" کا ماتم کئی برس تک بطورِ خاص خطوطِ غالبؔ کا موضوع رہا جو زیادہ تر اس احساس کے بغیر لکھے گئے کہ یہ کبھی چھپیں گے بھی۔ اس لیے اس موضوع پر خطوں میں غالبؔ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بڑی حد تک اُن کی غیر رسمی اور سچّی رائے ہے جس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔

"دستنبو" اور خطوطِ غالبؔ میں موجود متعلقہ مواد کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ہم غالبؔ کو کشمکش کا شکار پاتے ہیں۔ جذبات کا مطالبہ اور تھا، مصلحت کا تقاضا

کچھ اور ..... خطوں میں انقلاب ۱۸۵۷ء سے متعلق غالب کے حقیقی جذبات اور اُن کا سوزِ دروں چھلکا پڑتا ہے۔ "دستنبو" میں حقیقی جذبات ہنگامی مصلحت کے بوجھ تلے دب گئے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ٹھیک کہا ہے کہ:

"گو ضرورت و احتیاج نے انھیں انگریز حکّام اور گورنروں کی چوکھٹ پر گرا دیا تھا، اور مدحیہ قصیدے (نظم و نثر میں) لکھوائے تھے؛ تاہم "میرزا صاحب مشفق و مہربان" کے خطابات اور ساٹھ ستّر روپے (کی پنشن) اور خلعت اُس زخمِ کاری کا مرہم نہیں ہو سکتا تھا؛ جو حوادثِ غدر سے اُن کے دل پر لگا ہوگا۔ ایک ضعیف الارادہ انسان وقت اور احتیاج سے مجبور ہو کر صدہا باتیں اُوپری دل سے کر بیٹھتا ہے، مگر کچھ اس سے دل کے اصلی محسوسات و جذبات مٹ نہیں سکتے، علی الخصوص ایسے حادثۂ کبریٰ اور مصیبتِ عظمیٰ کے موقعوں پر۔" (غالب اور ابوالکلام۔ عتیق صدیقی، دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۶۲)

یہ تفصیلات ایک ایسے شخص کے قلم سے ہیں جو پُرزور اسلوب کا مالک تھا، اس لیے متاثر اور متوجہ کرتی ہیں۔ یہ اس لیے بھی اہم ہیں کہ ہند اسلامی تمدّن کے آخری ترجمان کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ پھر یہ اطلاعات اس لیے بھی قابلِ توجہ ہیں اور عینی شہادت کا درجہ رکھتی ہیں کہ لکھنے والے نے دلّی میں بیٹھ کر، اُس وقت فراہم کی ہیں جب موجِ خوں سر سے گزر رہی ہے۔

یہ مواد بجائے خود تاریخ نہیں، لیکن تاریخ کے معتبر ماخذ کی حیثیت سے بے حد قیمتی ہے۔ یہ دہلی اور اہلِ دہلی کی تباہی کا دل گداز مرثیہ اور اُن کے طرزِ احساس کا نادر مرقع ہے، جس کے نقوش کی بُنیاد پر انقلابِ ستاون کی معروضی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔

جد و جہدِ آزادی کے ضمن میں خطوطِ غالب کے بیانات جا بجا "دستنبو" کے مندرجات سے مختلف اور متصادم ہیں، اور یوں دونوں کے تقابلی مطالعے سے غالب

کی سیرت و شخصیت کی تخمین و تعیین کا ایک نیا پیمانہ ہاتھ آتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے "حادثۂ کبریٰ" اور "مصیبتِ عظمیٰ" پر غالب کے دلی جذبات اور اصلی محسوسات کا اظہار اُن کے خطوں میں ہوا ہے۔ انقلابِ ستاون کی جو جستہ جستہ روداد خطوطِ غالب میں چھپی، لیکن منتشر ہونے کی بنا پر چھپی ہوئی تھی اور اس انقلاب کے اثراتِ مابعد کی جو جھلکیاں غالب کے خطوں میں محفوظ لیکن بکھری ہوئی تھیں، زیرِ نظر کتاب کے تیسرے حصے میں انھیں مرتب اور یک جا کر دیا گیا ہے۔

(۴)

آخری حصۂ کتاب میں اس امر کا جائزہ لیا گیا ہے کہ اس حادثۂ کبریٰ پر غالب کا شعری رویّہ کیا رہا اور اس مصیبتِ عظمیٰ کا اُن کے شعر اور بہ حیثیتِ مجموعی اُن کی شعرگوئی پر کیا اثر پڑا؟ غالب معروف معنوں میں اُردو شاعر اور نثر نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انقلابِ ستاون نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا، جب کہ نثر نگار غالب کا ظہور اس انقلاب کے بعد ہوا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ غالب کو اس تناظر میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اُمید ہے کہ کتاب کا یہ حصہ بھی شوق اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

○

انقلابِ ستاون کے موضوع پر غالب نے اپنے خطوں میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اس سے الگ دہلی کی تباہی کے بارے میں غالب کی فقط ایک اُردو تحریر ملتی ہے۔ یہ اُن کا ایک مختصر مضمون ہے جو انھوں نے دہلی سوسائٹی کے ایک جلسے (منعقدہ ۱۸ اگست ۱۸۶۵ء) میں سوسائٹی کے سرپرست کرنل ہملٹن کمشنر دہلی کے ایما پر پڑھا
اس نادر تحریر کو کتاب کے ضمیمۂ اوّل کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہند میں کمپنی راج کا خاتمہ ہو گیا اور ملکہ وکٹوریہ کے ایک اعلان کے مطابق برِّعظیم براہِ راست تاجِ برطانیہ کے زیرِ نگیں آ گیا۔ اس پر

غالب کا ردِ عمل ایک تہنیتی قطعے اور قصیدے کی صورت میں سامنے آیا جب کہ ملکۂ وکٹوریہ کے اعلان کے جواب میں اودھ کی ملکہ بیگم حضرت محل نے ایک ایسا فرمان جاری کیا جس کا ایک ایک حرف حضرت محل کی بیدار مغزی اور روشن ضمیری پر دلالت کرتا ہے۔ یہ اعلان اور فرمان دیدنی ہے۔ یہ دستاویزیں جس شکل میں مل سکیں ضروری حواشی کے ساتھ بطور ضمیمۂ دوم آخر کتاب میں شامل کر دی گئی ہیں۔ یقین ہے کہ یہ تحریریں توجہ سے پڑھی جائیں گی اور سامانِ بصیرت فراہم کریں گی۔

"دستنبو" کا تعارف

"دستنبو" غالب کی زندگی میں تین بار شائع ہوئی۔ دو بار جداگانہ اور ایک بار "کلیاتِ نثرِ غالب" کے ساتھ۔ ان تین اشاعتوں کے کتابیاتی کوائف یہ ہیں:

۱۔ طبعِ اوّل: مطبعِ مفیدِ خلائق آگرہ۔ نومبر ۱۸۵۸ء۔
نگرانِ اشاعت: تفتہ، حقیر، مہر اور آرام
ضخامت: ۸۰ صفحات ——— مسطر: ۱۲ سطری۔

۲۔ طبعِ دوم: مطبعِ لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ، بریلی، ۱۸۶۵ء۔
بہ اہتمام منشی پھندن لال۔
ضخامت: ۶۱ صفحات ——— مسطر: ۱۵ سطری۔

۳۔ طبعِ سوم در "کلیاتِ نثرِ غالب":
مطبعِ نولکشور، لکھنؤ، جنوری ۱۸۶۸ء
بہ اہتمام منشی نولکشور۔
ضخامت: ۲۳ صفحات (صفحہ ۱۸۹ تا ۲۱۲)۔ مسطر: ۲۹ سطری۔

"دستنبو" طبعِ اوّل (۱۸۵۸ء) کے سرورق پر کتاب کے موضوع اور حدِ موضوع کو ان کلمات سے ظاہر کیا گیا ہے:

"کتاب مستطاب نایاب..... جس میں مصنف نے اپنی سرگذشت ابتدائے ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک لکھی ہے۔"

پہلی بات تو یہ کہ غالب نے صرف "اپنی سرگذشت" ہی نہیں لکھی، بہ حیثیتِ اقتضائے مقام، کتاب میں عام واقعات و حالات اور بر بنائے تقریب شہر و سپاہ کی روداد بھی درج کی ہے اور دوسری بات یہ کہ اس سرگذشت کا آغاز ۱۸۵۷ء کی ابتدا سے نہیں ہوا، بلکہ کتاب بعدِ توطیہ و تمہید ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے شروع ہوتی ہے۔

"میں نے گیارھویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک

کی روداد نثر میں لکھی ہے۔ "دستنبو" اس کا نام رکھا ہے اور اس میں
صرف اپنی سرگذشت اور مشاہدے کے بیان سے کام رکھا ہے۔"
(نامۂ غالب بہ نام انورالدولہ شفق، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا۔ میں نے اسی دن گھر کا
دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کردیا۔ بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی
اپنی سرگذشت لکھنی شروع کی۔ جو سُنا گیا، وہ بھی ضمیمۂ سرگذشت کرتا گیا۔"
(چودھری عبدالغفور سرور، ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء)

---

[1] شفق کو (اُوپر) لکھ چکے ہیں کہ "دستنبو" میں اپنی سرگذشت اور "مشاہدے" سے کام رکھا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ فساد شروع ہونے کے پہلے دن ۱۱ مئی ہی سے انھوں نے گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا تھا، تو پھر "مشاہدے" کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ غالب نے قلعۂ مُعلّا کی حاضری بیک قلم ترک نہیں کی، جیسا کہ والیِ رام پور کے نام اُن کے ایک فارسی خط مورخہ ۴ر جنوری ۱۸۵۸ء سے ہویدا ہے۔ غالب کی مصلحت بیں طبیعت کے پیشِ نظر بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انھوں نے بیک آن ترکِ تعلق کر لیا ہوگا۔ بعض معاصر شہادتیں بھی اس امر کی موجود ہیں کہ غالب "فساد" کے ایام میں قلعے جاتے رہے ہیں۔ عبداللطیف اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں کہ، "۱۹ رمضان ۱۲ رمئی ۱۸۵۷ء صبح کے وقت مرزا اسدُ اللہ خاں غالب ایوانِ شاہی میں آداب بجالانے کے لیے حاضر ہوئے اور زمیں بوسی سے سُرخروئی حاصل کی اور ایک خرمہرہ پیش کیا۔ بادشاہ کے حکم سے ہر روز کے لیے مرتبہ "خانہ زادی" سے بہرہ اندوز ہوئے۔" (ترجمہ صفحہ ۱۲۳) "عبداللطیف نے ۱۹ ذی الحجہ، ۱۱ راگست ۱۸۵۷ء کی تاریخ میں لکھا ہے کہ نجم الدولہ نواب اسداللہ خاں غالب نے ایک قصیدہ لکھ کر سُنایا اور خلعت زیب تن کیا۔"

(۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ از عبداللطیف، مرتبہ و مترجمہ خلیق احمد نظامی دہلی ۱۸۵۸ء)
نیز رجوع کیجیے: غدر کی صبح شام، حسن نظامی، دہلی ۱۹۲۲ء، صفحہ ۱۴۹۔

"میں نے آغازِ یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے سی و یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک رودادِ شہر یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے۔"

(منشی ہرگوپال تفتہ۔ ۱۷ اگست ۱۸۵۸ء)

"مئی کی گیارھویں ۱۸۵۷ء سے جولائی کی اکتیسویں ۱۸۵۸ء تک پندرہ مہینے کا حال میں نے لکھا ہے۔"

(یوسف علی خاں عزیز، ۱۸۵۹ء)

"مئی سالِ گذشتہ سے جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد میں نے لکھی ہے۔ یکم اگست سے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔"

(ترجمہ۔ خاتمۂ دستنبو)

"یکم اگست ۱۸۵۸ء تک میں نے پندرہ مہینے کا حال لکھا اور آئندہ لکھنا موقوف کیا۔"

(میر مہدی مجروح، ۸ اگست ۱۸۵۸ء)

"میں نے بعدِ توطیہ و تمہید آغازِ مئی ۱۸۵۷ء سے اپنی سرگزشت لکھی ہے اور بہ حیثیتِ اقتضائے مقام وقائع بھی اس میں درج کیے ہیں۔"

(بہ نامِ نامعلوم: ۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء)

"میں نے سرکار کی فتح کا حال نہیں لکھا۔ صرف اپنی پندرہ مہینے کی سرگزشت لکھی ہے، تقریباً شہر و سپاہ کا بھی ذکر آگیا ہے اور وہ اپنی سرگزشت جو میں نے لکھی ہے، سوا ابتدائے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک لکھی ہے۔ شہر ستمبر میں فتح ہوا، اس کا بیان بھی ضمناً آگیا۔"

(منشی شیو نرائن آرام، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

غالب کے خطوں میں دوسری تصانیف کے مقابلے میں "دستنبو" کا ذکر اور اس کی اشاعت کی روداد بالتفصیل محفوظ ہے۔ اس کا ذکر سب سے پہلے ۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء

کے ایک خط میں آیا جس کے مکتوب الیہ کا نام معلوم نہیں[1] ———— غالب لکھتے ہیں:

"میں نے بعدِ توطیہ و تمہید آغاز مئی، ۱۸۵۷ء سے اپنی سرگزشت لکھی ہے اور بہ حیثیتِ اقتضائے مقام وقائع بھی اس میں درج کیے ہیں۔ شیوۂ لزومِ مالایلزم مرعی رکھا ہے۔ یعنی فارسی بے آمیزشِ لفظِ عربی لکھی ہے اور فارسی بھی وہ فارسیِ قدیم کہ جس کا اب پارس کے بلاد میں نشان بھی نہیں۔ "تا بہ ہندوستان چہ رسد"؟ چالیس صفحے لکھ چکا ہوں۔ اتمام میں انتظار یہی ہے کہ پنسن کا مقدمہ طے ہو چکے، ملے یا جواب ملے اور میں بہر حال کسی جگہ اقامت گزیں ہو لوں۔ ہاں اس کے وقوع تک جو کچھ قابلِ تحریر جوانب اجانب سے معلوم ہوگا، وہ ناچار لکھوں گا۔ یہاں کوئی چھاپہ خانہ نہیں ہے اگر اجازت دو گے تو بعدِ اختتام ان اوراق کو تمھارے پاس بھیج دوں گا تاکہ ہزار جلدیں طبع ہو کر اُجڑی ہوئی قلمروِ ہند میں پھیل جائیں۔"

---

[1] رسالہ "تصویرِ جذبات" کے اڈیٹر سید احمد عزیز کیفی نے اس خط کو اپنے رسالے کے شمارہ فروری ۱۹۴۳ء میں شائع کیا اور لکھا کہ یہ خط اُن کے جدِّ امجد کے نام ہے، لیکن اپنے دادا کا نام نہیں بتایا۔ اس رسالے سے صفدر مرزاپوری نے اس خط کو اپنی تالیف مرقعِ ادب (ج ۲، صفحہ ۲۴۔۲۵) میں نقل کیا اور اس طرح یہ خط غالب کے مختلف مجموعۂ مکاتیب کا حصہ بنا۔ فاضل لکھنوی نے (اُردوے معلّیٰ، صدی ایڈیشن، ص ۹۸۹۔۹۹۰) اسے شیو نرائن آرام کے نام قرار دیا ہے جو صریحاً غلط ہے، اس لیے کہ آرام سے غالب کا تعارف تفتہ کے ذریعے ہوا اور اس خط کی تاریخِ تحریر کے کئی ہفتے بعد ہوا۔ بعض داخلی شہادتوں کی بنا پر مجھے یہ خط حکیم غلام نجف خاں کے نام معلوم ہوتا ہے۔ یہ جس کسی کے نام بھی ہے، اُس سے غالب کی پرانی مراسلت ہے، نیا تعلق نہیں۔

۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء تک غالبؔ چالیس صفحے لکھ چکے تھے۔ اتمام میں انتظار یہ تھا کہ پنشن کا معاملہ طے ہو لے اور عزم یہ تھا کہ وقوع تک جو کچھ قابلِ تحریر جوانب اجانب سے ہوگا وہ اُسے قلم بند کریں گے۔ لیکن اُنھی ایام میں منشی اُمید سنگھ اندور والے دلّی آئے۔ ایک دوست انھیں غالبؔ کے ہاں لے آئے۔ انھوں نے مسودہ دیکھا اور مالی اعانت سے کتاب چھپوانے کا قصد ظاہر کیا۔ اس ہنگامِ رستخیز میں طباعت کا انتظام ہونا عجائبات میں سے تھا۔ غالبؔ نے اسی وجہ سے منشی اُمید سنگھ کی اس پیش کش کو غنیمت خیال کیا اور پنشن کے مقدمے کے طے پانے کا انتظار کیے بغیر، اس تحریر کو علی الاطلاق ۳۱ر جولائی ۱۸۵۸ء پر ختم کر دیا:

"منشی امید سنگھ اندور والے، دلّی آئے تھے۔ سابقۂ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست اُن کو میرے گھر لے آیا۔ انھوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا (آگرہ میں)...... بھائی! میں نے ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے اور خاتمے میں اس کی اطلاع دے دی ہے..... کیا کرتا، اگر تحریر موقوف نہ کرتا! منشی امید سنگھ اندور جانے والے تھے، اگر ختم کر کے مسودہ اُن کے سامنے آگرہ نہ بھیج دیتا تو پھر چھپواتا کون؟" (بہ نام میر مہدی مجروحؔ، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

مجروحؔ کے نام ایک خط مرقومہ ۸ر اگست ۱۸۵۸ء میں غالبؔ لکھتے ہیں کہ:

"صاحب! ہم نے گھبرا کر اِس تحریرِ فارسی کو تمام کیا۔ دفتر بند کیا اور یہ لکھ دیا کہ یکم اگست ۱۸۵۸ء تک میں نے پندرہ مہینے کا حال لکھا اور آئندہ لکھنا موقوف کیا۔"

"دستنبو" کے سلسلے کا پہلا مفصّل خط تفتہؔ کے نام ہے۔ یہ ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء کا ہے۔ اِن معنوں میں اہم ہے کہ اس سے "دستنبو" کے قلمی نسخے کے کتابیاتی کوائف احاطۂ علم میں آتے ہیں اور کتاب کے انداز و اہتمامِ نگارش اور اشاعتِ کتاب کے

بارے میں غالب کی توقعات اور ہدایات کا پتا چلتا ہے:

"اب ایک اور امر سنو، میں نے آغاز یازدہم مئی، ۱۸۵۷ء سے سی ویکم جولائی ۱۸۵۸ء تک روئیداد شہر یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ "دساتیر" کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے، جو نظم اس نثر میں درج ہے وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام بدلے نہیں جاتے۔ وہ عربی، انگریزی، ہندی جو ہیں وہ لکھ دیے ہیں۔ یہی میرا خط جیسا اس رقعے میں ہے، نہ چھدرا، نہ گنجان، اوراقِ بے مسطر پر اس طرح کہ کسی صفحے میں بیس سطر اور کسی میں بائیس سطر بلکہ کسی میں اُنیس سطر بھی آئے۔ چالیس صفحے یعنی بیس ورق ہیں اگر اکیس سطر کے مسطر سے کوئی گنجان لکھے تو شاید دو جزو میں آ جائے یہاں کوئی مطبع نہیں ہے۔ سُنتا ہوں کہ ایک ہے، اس میں کاپی نگار خوش نویس نہیں ہے۔ اگر آگرے میں اس کا چھاپا ہو سکے تو مجھ کو اطلاع کرو، اس تہی دستی اور بے نوائی میں پچیس کاپیں بھی خریدار ہو سکتا ہوں۔ لیکن صاحب مطبع اتنے پہ کیوں مانے گا اور البتہ چاہیے کہ اگر ہزار نہ ہوں تو پانچ سو جلد تو چھاپی جائے۔ یقین ہے کہ پان سات سو جلد چھاپنے کی صورت میں تین یا چار آنے قیمت پڑے۔ کاپی تو ایک ہی ہو گی، رہا کاغذ، وہ بھی بہت نہ لگے گا۔ لکھائی متن کی تو آپ کو معلوم ہو گئی، حاشیے پر البتہ لغات کے معنی لکھے جائیں گے۔ بہ ہر حال اگر ممکن ہو تو اس کا تکملہ کرو اور حساب معلوم کر کے مجھ کو لکھو۔ ضرور! ضرور! ضرور!"

تفتہ نے کتاب کا مسودہ دیکھا نہیں تھا۔ غالب نے بہت کچھ لکھا لیکن کانٹے کی اس بات کی وضاحت رہ گئی کہ "روئیدادِ شہر" کس کے نقطۂ نظر سے

لکھی گئی ہے؟ یہ نئی عمل داری کی تنقیص میں ہے، یا قلعۂ معلّٰی کی تائید میں؟ جس سے غالب کا تعلق ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ۵ دسمبر، ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں غالب تفتہ کو لکھ چکے تھے کہ:

"مُفصّل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ مُلازمانِ قلعہ پر شدّت ہے بازپُرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔"

اور یہ بازپرس اور دار و گیر افراد و اشخاص ہی سے خاص نہیں تھی، طباعتی ادارے اور اخبار بھی شدّت اور دار و گیر کا نشانہ بن رہے تھے۔ ۱۳ جون، ۱۸۵۷ء کو اخبارات پر پابندی لگا دی گئی۔ اور اخباروں کے اُن قواعد اور قوانین کو منسوخ کر کے جو ۱۸۳۵ء سے بلا کسی ضرورتِ ترمیم کے نافذ چلے آ رہے تھے اور جن کے نتیجے میں آغازِ نفاذ سے مئی، ۱۸۵۷ء تک کے قریب بائیس برس کے طویل عرصے میں "اخباروں کے اِڈیٹروں اور حکومت کے افسروں میں تصادم کا کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا"[1] ایک نیا سخت پریس ایکٹ نافذ کر دیا گیا۔ اس کارروائی کے پسِ پُشت گورنر جنرل کا یہ ذہن اور احساس کام کر رہا تھا کہ:

"اس بات کو لوگ نہ تو جانتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں کہ گذشتہ چند ہفتوں میں دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ یہ کام بڑی مستعدی، چالاکی اور عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔"

(گورنر جنرل لارڈ کیننگ، ۱۳ جون، ۱۸۵۷ء)

جیسا کہ محمد عتیق صدّیقی نے لکھا ہے "دارُالحکومت کلکتہ جو انگریزی اور دیسی اخباروں کا بھی بہت بڑا مرکز تھا اور جو دار و گیر کی دوڑ میں بھی کسی اور علاقے

---

[1] محمد عتیق صدّیقی، ہندوستانی اخبار نویسی، انجمن ترقی اُردو ہند، علی گڑھ، دسمبر ۱۹۵۷ء، صفحہ ۲۵۸

سے پیچھے نہ رہا تھا، وہاں کے متعلق پارلیمنٹری کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ:

"بہت سے ہندوستانی اڈیٹر اس ایکٹ (پریس ایکٹ) کی زد میں آئے۔ باغیانہ مضامین چھاپنے کے جرم میں دوربین، سلطان الاخبار اور سماچار سدھا بھرشن کے طابع و ناشر پر سوپریم کورٹ میں مقدمات چلائے گئے..... ایک اور اخبار "گلشنِ نو بہار" کا چھاپہ خانہ بہ حقِ سرکار ضبط کر کے اخبار بند کر دیا گیا۔"[1]

"باغیانہ مضامین" کی اشاعت پر مقدمات چلائے جا رہے تھے، پریس ضبط ہو رہے تھے اور اخبار جبری بندش کی زد میں آ رہے تھے۔ اس پس منظر میں کسی ایسی کتاب کی طباعت و اشاعت کی ہند میں کیا گنجائش ہو سکتی تھی جو کمپنی بہادر کے حکام کی تائید میں نہ ہو۔ چنانچہ جب ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء کے مذکورہ خط میں اُستادِ شاہ غالب نے تفتہ سے کہا کہ:

"میں نے..... رودادِ شہر یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے..... اگر آگرے میں اس کا چھاپہ ہو سکے تو مجھ کو اطلاع کرو۔"

تو منشی ہرگوپال تفتہ جو خود بھی غالب کے شاگرد تھے، تذبذب اور مشکل میں پڑ گئے ہوں تو عجب نہیں کہ یہ روداد، انگریز عمل داری کی تنقیص میں نہ ہو؟ تازہ عائد پریس ایکٹ کی موجودگی میں از قسم "باغیانہ" کسی تحریر اور وہ بھی کتابی حجم کی تحریر کی طباعت، اشاعت کے لیے کسی پریس کو آسانی سے کیوں کر تیار کیا جا سکتا تھا؟ غالباً تفتہ نے اس نوع کے اندیشوں کا اظہار کیا تو جواباً غالب نے انھیں "دستنبو" کے اوراق بھیجے اور لکھا کہ:

---

1. Natarajan: History of Indian Journalism P. 68 also: Burns: Indian Empire P. 267 (بحوالہ ہندوستانی اخبار نویسی ایضاً ص ۲۰۴)

"چھاپے کے باب میں جو آپ نے لکھا ہے، وہ معلوم ہُوا۔ اس تحریر
کو جب دیکھو گے تب جانو گے۔ اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے
میں اس واسطے ہے کہ اُس میں سے ایک جلد نواب گورنر جنرل
بہادر کی نذر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعہ اُن کے جناب ملکہ
معظمہ انگلستان کی نذر کروں گا۔ اب سمجھ لو کہ طرزِ تحریر کیا ہوگی؟
اور صاحبانِ مطبع کو اس کا انطباع کیوں نہ مطبوع ہوگا؟"

اس معنی خیز اور اطمینان بخش وضاحت کے بعد تفتہ کے خدشات جاتے
رہے اور کتاب کا مسودہ انھوں نے طباعت کے لیے مطبع مفید خلائق، آگرہ کے
مالک و مہتمم منشی شیو نرائن آرام کے سپرد کیا:

صاحب! عجب تماشا ہے تمھارے کہنے سے منشی شیو نرائن صاحب
کو خط لکھا تھا، سو کل اُن کا خط آیا اور انھوں نے "دستنبو" کی رسید
لکھی۔ ڈاک کا ہرکارہ تو اُن کے پاس لے نہ گیا ہوگا، آخر تمھیں نے
بھیجا ہوگا۔ یہ کیا تم نے مجھ کو اس کی رسید اور میرے خط کا جواب
نہ لکھا۔ مجھے تو صورت ایسی نظر آتی ہے کہ گویا تم الگ ہوگئے ہو،
کتاب مطبع میں حوالے کر دی۔"

یہ محض وہم تھا تفتہ الگ نہیں ہوئے، وہ کتاب کی طباعت سے تا آخر وابستہ
رہے اور کتاب اُن کی نگرانی میں چھپی۔ کتاب کے مندرجات اور "اندازِ تحریر"
سے تفتہ کے اطمینان کے باوصف، صاحبِ مطبع نے چھاپنے سے پہلے احتیاطاً مسودۂ
کتاب آگرے کے حکّام کو بھی دکھالیا اور کتاب حکّام کے پیشگی ملاحظے کے بعد
ان کی اجازت سے چھپنا شروع ہوئی:

"صاحبِ مطبع نے بہ شمولِ سعی منشی ہرگوپال تفتہ چھاپنا شروع کیا،
آگرہ کے حکّام کو دکھایا، اجازت چاہی۔ حکّام نے بہ کمالِ خوشی
اجازت دی۔" (مجروح، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

اس سے پہلے ۱۰ ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں مجروح کو کتاب کا نام تجویز کرلینے کی اطلاع دے چکے ہیں :

"کتاب کا نام دستنبو رکھا گیا۔ آگرے میں چھاپی جاتی ہے۔"

انورالدولہ شفق کے نام اکتوبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"میں نے گیارھویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد لکھی ہے اور وہ پندرہ سطرے چار جزو کی کتاب آگرے کو مطبع مفید خلائق میں چھپنے کو گئی ہے۔ دستنبو اس کا نام رکھا ہے۔"

مجروح کے نام غالب کے ایک خط مرقومہ اکتوبر ۱۸۵۸ء سے معاملات کی بعض اور جزئی تفصیلات سامنے آتی ہیں :

"میاں کیا باتیں کرتے ہو، میں کتابیں کہاں سے چھپواتا؟ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں، لحاف توشک کی فکر ہے، کتابیں کیا چھپواؤں گا۔ منشی امید سنگھ نے وہ نسخہ دیکھا چھپوانے کا قصد کیا، آگرے میں میرا شاگردِ رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا، اس کو میں نے لکھا۔ اس نے اس اہتمام کو اپنے ذمے لیا۔ مسودہ بھیجا گیا۔ آٹھ آنے فی جلد قیمت ٹھہری۔ پچاس جلدیں منشی امید سنگھ نے لیں۔ پچیس روپے چھاپے خانے میں بطورِ ہنڈوی بھجوادیے۔۔۔۔ پانسو جلد چھاپی جاتی ہے۔"

کتاب والیِ اندور کے اتالیق راے امید سنگھ کی، ان معنوں میں مالی اعانت سے چھپ رہی تھی کہ وہ پچاس جلدوں کے پیشگی خریدار ہوئے تھے، جن میں سے چالیس انھوں نے غالب کو ہدیۃً دے دینا تجویز کیا تھا۔ راے صاحب کے آگرہ پہنچنے کی اطلاع دیتے ہوئے ۲۸ اگست ۱۸۵۸ء کے خط میں غالب نے تفتہ کو ہدایت کی ہے کہ :

"تم اس رقعہ کو دیکھتے ہی اُن کے پاس حاضر ہونا اور جب تک وہاں

رہیں ، حاضر ہوا کرنا اور "دستنبو" کے باب میں تو ان کا حکم ہو بجا لانا،
اُن کو "دستنبو" پڑھا بھی دینا اور فی جلد کا حساب سمجھا دینا پچاس
جلد کی قیمت عنایت کر دیں گے ، وہ لے لینا ۔ جب کتاب چھپ چکے ۔
دس جلدیں راے صاحب کے پاس اندور بھیج دینا اور چالیس
جلدیں بہ موجب اُن کے حکم کے میرے پاس ارسال کرنا "
یکم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تفتہ ہی کو لکھتے ہیں :
"جانتا ہوں کہ تم راے امید سنگھ سے بھی نہ ملے ہو گے ۔ عیاذاً باللہ!
میں ان سے شرمندہ رہا کہ میں نے کہا تھا کہ ہاں مرزا تفتہ "دستنبو" کو
اچھی طرح پڑھا دیں گے "
۳۱ اگست ۱۸۵۸ء کے ایک خط بہ نام منشی شیو نرائن میں بھی ان راے صاحب
کا ذکر خیر آیا ہے :
"ایک خریدار پچاس جلد کے وہاں پہنچے ہیں ۔ واسطے خدا کے مرزا
تفتہ سے کہیے کہ اُن کو ملیں ، یعنی امید سنگھ بہادر اندور والے ، وہ
چھلی اینٹ میں پولیس کے پچھواڑے رہتے ہیں "
تفتہ ، راے صاحب سے مل لیے اور کاربراری میں کامیاب ہوئے :
"راے اُمید سنگھ نے مجھ پر عنایت اور مطبع کی اعانت کی ۔ حق تعالےٰ
ان کو اس کارسازی اور فقیر نوازی کا اجر دے "
(تفتہ ، ۲ ستمبر ۱۸۵۸ء)
۳۱ اگست ۱۸۵۸ء کے خط میں منشی شیو نرائن آرام کو کتاب کی تزئین اور
تصحیح کے بارے میں لکھتے ہیں :
"بات یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ کتاب دو جزو یا چار جزو کی ہو ۔
چھے جزو سے کم نہ ہو ۔ مسطر دس گیارہ سطر کا ہو ، مگر حاشیہ تین طرف
سے بڑا رہے ۔ شیرازے کی طرف کا کم ہو ۔ اس کے سوا یہ ہے کہ کاپی کی

تصحیح ہو۔ غلط نامے کی حاجت نہ پڑے۔ آپ خود متوجہ رہیے گا۔ اور منشی نبی بخش صاحب کو اگر کہیے گا تو وہ بھی شریک رہیں اور مرزا تفتہ تو مالک ہی ہیں۔ کاغذ "شیورام پوری" ہو۔ خیر، مگر سفید اور دبیرہ کیا ہوا اور لعاب دار ہو۔ پھر یہ کہ حاشیے پر جو لغات کے معنی لکھے جائیں تو اس کی طرز تحریر اور تقسیم دل پسند اور نظر فریب ہو۔ حاشیے کا قلم، بہ نسبت متن کے قلم کے خفی ہو۔۔۔۔"

یکم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں:

"مجھے تو صورت ایسی نظر آتی ہے کہ گویا تم الگ ہو گئے ہو۔ کتاب مطبع میں حوالے کر دی۔ اب اس کی تزئین و تصحیح سے کچھ غرض نہیں بس اگر یوں ہے تو میں اس انطباع سے درگزرا۔ سیکڑوں مطالب و مقاصد رہ جائیں گے۔"

"جمعہ سوم ستمبر ۱۸۵۸ء ہنگام نیم روز" تفتہ کو ارشاد ہوتا ہے:

"صاحب! کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے آپڑا ہے اور پھر کام کیسا کہ جس میں میری جان الجھی ہوئی ہے اور میں نے اس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔ خدا کے واسطے پہلو تہی نہ کرو، اور بہ دل توجہ فرماؤ۔ میں نے ہرگز نہیں لکھا کہ عبارت دو جزو میں آجائے۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ عبارت اس قدر ہے کہ دو جزو میں آجائے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ حجم زیادہ ہو۔ لغات کے معنی حاشیے پر چڑھیں۔ اس کی روش دل آویز اور تقسیم نظر فریب ہو۔"

تصحیح پر زور اس وجہ سے تھا کہ "عبارت کا ڈھنگ نیا ہے" اور تزئین کی فکر اس لیے تھی کہ کتاب کو حکام عالی مقام کی نظر گزارنا تھا:

"مبالغہ اس کتاب کی تصحیح میں اس واسطے کرتا ہوں کہ عبارت کا نیا ڈھنگ ہے۔ صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے اگر غلط ہو جائے تو

وہ عبارت نری خرافات ہے۔ بارے بہ سبب التفات بھائی منشی نبی بخش صاحب کے، صحتِ الفاظ سے خاطر جمع ہے۔ متوقع ہوں کہ وہ تکلیف سہیں اور ختم کتاب تک متوجہ رہیں۔ منشی شیو نرائن صاحب نے کاپی میرے دیکھنے کو بھیجی تھی، سب طرح میرے پسند آئی چنانچہ اُن کو لکھ بھیجا ہے، اگر ہو سکے تو سیاہی ذرا اور بھی رنگت کی اچھی ہو۔" (مرزا حاتم علی بیگ مہر، ستمبر ۱۸۵۸ء)

"حضرت! چار جلدیں یہاں کے حکّام کو دوں گا اور دو جلدیں ولایت کو بھیجوں گا۔ اللہ اللہ کیا غفلت ہے اور کیا اعتماد ہے زندگی پر، بہر حال یہ ہوس تھی اور شاید اب بھی ہو کہ ان چھ جلدوں کی کچھ تزئین و آرائش کی جاوے، آپ اور بھائی صاحب اور ان کا فرزند رشید منشی عبداللطیف اور منشی شیو نرائن، یہ چاروں صاحب فراہم ہوں اور بہ اجلاسِ کونسل یہ امر تجویز کیا جائے کہ کیا کیا جائے۔" (مرزا حاتم علی بیگ مہر، ستمبر ۱۸۵۸ء)

"خلاصہ یہ کہ ان جلدوں میں سے دو جلدیں ولایت کو جائیں گی۔ ایک جناب فیض مآب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر اور آقاے قدیم لارڈ الن برا بہادر کی نذر اور چار جلدیں یہاں کے چار حاکوں کی نذر کروں گا۔"

(منشی شیو نرائن آرام، ۱۳ اگست ۱۸۵۸ء)

آرام کے نام سوم ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تک غالبؔ کو یہ علم نہیں تھا کہ چھاپہ شروع ہو گیا یا نہیں اور اگر شروع نہیں ہوا تو کیا سبب " اس کے دو تین روز بعد غالبؔ کے پاس تین دو ورقے چھاپے کے پہنچے۔ غالبؔ نے ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تقطیع، شمارِ سطور، کاپی کے حسنِ ضبط، صحتِ الفاظ، غرض قلم، خط، طرزِ تصحیح اور جدول وغیرہ میں خوشنودی

کا اظہار کیا ہے اور کاغذ، کاپی کی سیاہی اور رنگت بیز جلدوں کی تزئین اور آرائش کے باب میں ضروری ہدایات دی ہیں:

"تین دو ورقے چھاپے کے پہنچے ہیں۔ شاید میرے دکھانے کے واسطے بھیجے گئے ہیں، ورنہ استعمال یوں ہے کہ پہلے صفحے پر کتاب کا نام اور مصنف کا نام اور مطبع کا نام چھاپتے ہیں اور دوسرے صفحے پر لوح سیاہ قلم سے بنتی ہے اور کتاب لکھی جاتی ہے۔ اس کا بھی چھاپا اسی طرح ہوگا۔ غرض کہ تقطیع اور شمارِ سطور اور کاپی کا حسنِ ضبط اور الفاظ کی صحت، سب میرے پسند۔ صحتِ الفاظ کا کیا کہنا ہے۔ واللہ بے مبالغہ کہتا ہوں کہ بھائی منشی نبی بخش صاحب بہ دل متوجہ ہوں تو اگر احیاناً اصل صفحے میں سہوِ کاتب سے غلطی واقع ہوئی تو اُس کو بھی صحیح کر دیں گے۔ خدا کرے انجام تک یہی قلم اور یہی خط اور یہی طرزِ تصحیح چلی جائے۔ جدول بھی مطبوع ہے۔ پہلے صفحے کی صورت اور دوسرے صفحے کی لوح بھی خدا چاہے تو دل پسند اور نظر فریب ہوگی۔ کاغذ کے باب میں یہ عرض ہے کہ فرنچ کاغذ اچھا ہے۔ چھ جلدیں جو نذرِ حکام ہیں، وہ اس کاغذ پر ہوں اور باقی چاہو شیورام پوری پر اور چاہے نیلے کاغذ پر چھاپو اور یہ بات کہ "دو جلدیں جو ولایت جانے والی ہیں، اس کاغذ پر چھاپی جائیں اور باقی شیورام پوری یا نیلے کاغذ پر" یہ تکلفِ محض ہے۔ یہاں کے حاکموں نے کیا گناہ کیا ہے کہ ان کی نذر کی کتابیں اچھے کاغذ پر نہ ہوں؟ مگر جو ایسا ہی صرف اور خرچ زائد پڑتا ہو تو خیر، دو جلدیں اس کاغذ پر اور چار جلدیں شیورام پوری پر ہوں باقی جلدوں میں تمھیں اختیار ہے۔ ہاں صاحب! اگر ہو سکے تو کاپی کی سیاہی ذرا اور سیاہ اور درخشندہ ہو اور آخر تک رنگ نہ بدلے"۔

لیکن خاص جلدیں جو حکام کی نذر کرنا تھیں، ایک مرحلے پر چھے کے بجائے سات ہو گئیں۔ ان کی تفصیل اور مرسل الیہ کے اسما کی تفصیل مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام غالب کے ایک خط مرقومہ ۲۰ ستمبر ۱۸۵۸ء سے معلوم ہوتی ہے:

"رات ایک بات اور خیال میں آئی ہے۔ لیکن چونکہ تحکّم و کارفرمائی ہے، کہتے ہوئے ڈرتا ہوں، ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ دو جلدیں طلائی لوح کی ولایت کے واسطے تیار ہوں گی اور وہ چار جلدیں جو یہاں کے حکام کے واسطے درکار ہوں گی، ان کی صورت یہی ٹھہری ہے کہ سیاہ قلم کی لوح اور انگریزی جلد۔ پھر سمجھا چاہیے کہ یہ چار جلدیں کس کس کی نذر ہیں؟ نواب گورنر جنرل بہادر، چیف کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر دہلی، ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی، یہ میری کیا بد وضعی ہے کہ جناب ایڈمنسٹن صاحب کی نذر نہ بھیجوں۔ آخر گورنمنٹ کی نذر انھیں کی معرفت بھیجوں گا۔ نہ صاحب، ایک جلد اُن کی نذر بہت ضروری ہے آپ گنجائش نکال کر جیسی یہ چار جلدیں بنوائیں ایک اور بھی ایسی ہی بنوالیں۔ یقین ہے کہ آپ اس رائے کو پسند فرمائیں گے اور چار کی جگہ پانچ بنوالیں گے۔ یہ عرض مقبول اور یہ گستاخی کہ بار بار آزار دیتا ہوں، معاف ہو۔"

کتاب کی تزئین و طباعت کی اطلاع ملی تو اشتیاقِ دید کو شاعرانہ اُسلوب میں اس طرح بیان کیا:

"کتاب کا حُسن کانوں سے سُنا، دل کو دیکھنے سے زیادہ یقین آیا ..... مگر آنکھوں کو رشک ہے کانوں پر اور کان چشمک زنی کر رہے ہیں آنکھوں پر، یہ ارشاد ہو کہ آنکھوں کا حق آنکھوں کو کب تک ملے گا؟"

(بہ نام تفتہ، ۱۶ اکتوبر ۱۸۵۸ء)

سات طلائی لوح کی پُرتکلف جلدوں کے علاوہ جو حکام عالی مقام کو نذر جانا تھیں، ایک مزید خاص نسخے کی فرمائش خاص اپنے لیے صاحب مطبع منشی شیو نرائن سے کی گئی، جنھیں ۱۹ اکتوبر کے خط میں لکھ چکے ہیں کہ "برخوردار منشی شیونرائن کو معلوم ہو کہ میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو؟ جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزندِ دل بند ہو۔"

"دو جلدیں پُرتکلف اور پانچ جلدیں بہ نسبت اُس کے کم پُرتکلف مرزا حاتم علی صاحب کے عہدۂ اہتمام میں ہیں۔ اس سے ہم کو اور تم کو کچھ کام نہیں۔ وہ جیسی چاہیں بنوا کر بھیج دیں۔ تم ایک جلد، بس زیادہ صرف کیوں کرو، اپنے طور پر اپنی طرف سے جیسی چاہو بنوا کر بھیج دو۔ میں تم کو اپنے پیارے ناظر بنسی دھر کی نشانی جانتا ہوں، اس کو تمھاری نشانی جان کر اپنی جان کے برابر رکھوں گا۔ باقی حال اپنے خاندان اور تمھارے خاندان کا اور باہم مل کر اپنا اور بنسی دھر کا بڑے ہونا سب تم کو لکھ چکا ہوں مکرر کیا لکھوں۔" (شیونرائن آرام، ۲۲ اکتوبر ۱۸۵۸ء)

غالبؔ کا اندازہ یہ تھا کہ کتاب کی طباعت اکتوبر میں انجام پا جائے گی:

"پرسوں خط تفتہؔ کا آیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ "دستنبو" کا ایک فرما چھپنا باقی رہا ہے۔ یقین ہے اسی اکتوبر میں قصہ تمام ہو جائے۔"

(مجروح، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

۲۲ اکتوبر ۱۸۵۸ء تک انھیں کتاب کے چھاپے کے خاتمے کی اطلاع نہیں ملی تھی:

"اب چھاپا تمام ہو گیا ہو گا۔ وہ پانچ اور دو سات کتابیں جو میرزا صاحب کی تحویل میں ہیں وہ، اور وہ ایک جلد جو تم نے مجھ کو دینی کی ہے، وہ سب لوح اور جلد کی درستی کے بعد

پہنچ جائیں گی، مگر وہ چالیس سرسری جو مجھے چاہییں، وہ تو
آج کل میں روانہ کردو۔ اور ہاں میری جان یہ چالیس کتابوں
کا پشتارہ کیوں کر پہنچے اور محصول اس کا کیا ہوگا؟ اور یہ بھی
تو بتاؤ کہ وہ دس جلدیں راے اُمید سنگھ کے پاس کہاں بھیجی
جائیں گی؟ مرزا تفتہ ...... اُن کا اندور نہ ہونا اور پھر شاید
آگرہ اور دلّی کا آنا مجھ کو لکھ چکے ہیں۔"

(بہ نامِ شیو نرائن آرام، ۲۳ر اکتوبر ۱۸۵۸ء)

کتاب کا چھاپا تمام ہو چکا، اب بے تابی سے اُن کا انتظار ہے تا خاص
وعام کو جا بجا بھیجی جائیں:

"صاحب! کتابیں کب روانہ ہوں گی؟ دوالی بھی ہولی۔ اگر گنگا
جانے کا قصد ہو تو بھائی میری کتابیں بھیج کر جانا اور ہاں، یہ
میں نہیں سمجھا کہ میرزا تفتہ کی منگوائی ہوئی سات کتابیں بھی اُنھیں
کے ساتھ بھیجو گے یا وہ اپنے طور پر جُداگانہ روانہ کریں گے؟ وہ
تم نے اپنی بنی ہوئی کتاب کا آٹھ دن کا وعدہ کیا تھا اور اس
وعدے سے یہ بات تراوش کرتی تھی کہ اور کتابیں پہلے روانہ
ہوں گی اور وہ ایک کتاب ہفتے کے بعد، سو وہ ہفتہ بھی گزر گیا
یقین ہے کہ اب وہ سب یکجا پہنچیں اور شاید کل پرسوں آجائیں۔"

(بہ نامِ شیو نرائن، ۹ر نومبر ۱۸۵۸ء)

"مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ تمھاری چالیس
کتابیں بعد لینے منہائی سات جلدوں کے اسی ہفتے میں تمھارے
پاس پہنچ جائیں گی۔ اب حضرت ارشاد کریں کہ سات جلدیں کب
آئیں گی؟ ہر چند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو،
مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو،

خدا کرے ان تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز آگے پیچھے
یہ سات جلدیں آپ کی عنایتی بھی آئیں ، تاکہ خاص و عام کو جا بجا
بھیجی جائیں ۔" (بہ نام حاتم علی بیگ مہرؔ، نومبر ۱۸۵۸ء)

کتاب بالآخر چھپ گئی اور غالبؔ کے حصۂ رسد کی چالیس کتابوں میں سے تینتیس انھیں ۱۲ر نومبر ۱۸۵۸ء کو مل گئیں ، بے حد خوش ہوئے اور تفتہؔ کو لکھا کہ :

"کل جمعے کے دن ۱۲ر تاریخ نومبر کی ، تینتیس جلدیں بھیجی ہوئی برخوردار شیو نرائن کی پہنچیں ۔ کاغذ ، خط ، تقطیع ، سیاہی ، چھاپا سب خوب ، دل خوش ہوا ، اور شیو نرائن کو دعا دی ۔"

لیکن اُن کا جی اُن سات کتابوں میں لگا ہوا تھا ، جن کا طلائی کام اور انگریزی جلد کے ساتھ تیار ہونا مقصود تھا ۔ ۱۲ر نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں حاتم علی بیگ مہرؔ کو لکھتے ہیں :

"بھائی صاحب ! تینتیس کتابیں ، بھیجی ہوئی برخوردار منشی شیو نرائن کی ، کل جمعے کے دن ۱۲ر نومبر کو پہنچیں کاغذ اور سیاہی اور خط کا حسن دیکھ کر میں نے ازروئے یقین جانا کہ طلائی کام پر یہ کتابیں طاؤس بہشت بن جائیں گی ۔ حوریں ان کو دیکھ کر شرمائیں گی ۔ یہ تو سب درست ، مگر دیکھیے کہ مجھ کو ان کا دیکھنا کب تک میسّر ہو ۔ آپ پر گمان تساہل کا گزرے ، یہ تو کیوں کر ہو ، ہاں صحّاف ، جلد کے بنانے کی نسبت سے میرے حق کا جلّاد نہ بن جائے ، یعنی مدتِ مناسب سے زیادہ دیر نہ لگائے ۔ اور ہاں حضرت ! کچھ ایسی پختگی ارسال کے وقت کر لیجیے گا کہ یہ پارسل آشوبِ تلف سے محفوظ رہے ۔ بہت عزیز اور بہت کام کی چیز ہے ۔ مجھ کو وہ ایک ایک مجلّد اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے

یا الٰہی! یہ خط راہ میں ہو، اور وہ ساتوں کتابوں کا پارسل تیرے حفظ و امان میں مجھ تک پہنچ جائے اور یہ نہ ہو تو بھلا یہ ہو کہ اس خط کا جواب لکھیے، اس میں مرقوم ہو کہ آج ہم نے کتابوں کا پارسل روانہ کیا ہے۔"

(خطوطِ غالب، مرتبہ پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء، جلد ا، صفحہ ۲۰۲)

خاص جلدیں ابھی پہنچی نہیں ہیں کہ کتاب کے سادہ نسخے تقسیم بھی ہو گئے۔ خاص نسخوں کی پل پل راہ تکی جا رہی ہے:

"صاحب تینتیس کتابیں پہنچ گئیں اور تقسیم بھی ہو گئیں۔ سات کتابیں مرزا تفتہ کی بھیجی ہوئی موافق اُن کی تحریر کے، آج شام تک اور مطابق منشی شیو نرائن کی اطلاع کے کل تک، میرے پاس پہنچ جائیں گی اور منشی شیو نرائن نے اندور کی کتابوں کی روانگی کی بھی اطلاع دی ہے۔"

(بہ نام تفتہ، ۱۸ر نومبر ۱۸۵۸ء)

"دیکھیے مرزا تفتہ (کتابیں) کب روانہ کرتے ہیں۔ اگر بھیج چکے ہیں تو یقین ہے کہ آج یہاں آ پہنچیں، آج نہ آئیں، کل آئیں۔ کل سے میں شام تک راہ دیکھتا ہوں۔"

(بہ نام شیو نرائن، ۱۸ر نومبر ۱۸۵۸ء)

یہاں تک کہ ۱۹ر نومبر ۱۸۵۸ء کو وہ سات خاص مجلد بھی غالب کو مل گئے منشی شیو نرائن کو مطلع کیا:

"کل جمعے کے دن ۱۹ر نومبر ۱۸۵۸ء کو سات کتابوں کے دو پارسل پہنچے، واقعی جیسا کہ میرا جی چاہتا تھا، اُسی روپ کی ہیں۔"

تفتہ کو لکھتے ہیں:

"کل جمعے کے دن ۱۹ر نومبر کو سات کتابوں کا پارسل بھیجا ہوا مولانا مہر

کا پہنچا۔ زبان نہیں جو تعریف کروں۔ شاہانہ آرائش ہے، آفتاب کی سی نمائش ہے۔"

مہر کو ان جلدوں کی تزئین اور آرائش پر بہت ہی کھلے دل سے داد دیتے ہوئے لکھا کہ:

"کل جو جمعہ روزِ مبارک و سعید تھا، گویا میرے حق میں روزِ عید تھا۔ چار گھڑی دن رہے نامۂ فرحت فرجام اور چار گھڑی کے بعد وقتِ شام:

سات جلدوں کا پارسل پہنچا
واہ کیا خوب برمحل پہنچا

آدمی کو موافق اُس کی تمنّا کے آرزو برآنی بہت محال ہے۔ میری آرزو ایسی برآئی کہ وہ برتر از وہم و خیال ہے۔ یہ بناو تو میرے تصوّر میں بھی نہیں گزرتا تھا۔ میں صرف اس قدر خیال کرتا تھا کہ جلدیں بندھی ہوئی، دو کی لوحیں زرّیں اور پانچ کی لوحیں سیاہ قلم کی ہوں گی۔ واللہ! اگر تصوّر میں بھی گزرتا ہو کہ کتابیں اس رقم کی ہوں گی۔ میرا مقصود یہ تھا کہ ایک کتاب مثل اُن چار کے بن جائے، نہ یہ کہ دو کتابوں کا سارنگ دکھلائے۔"

ایک جگہ سے کتاب کی رسید آئی، ۲۷ نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تفتہ کو اس کی اطلاع دیتے ہیں، نیز یہ کہ کچھ حکّام کو کتاب بھیج چکے اور کچھ اعلا حکّام کی نذر کے پارسل آج روانہ ہوں گے:

"ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب ممالکِ مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے صاحب ہیں۔ امن کے دنوں میں ایک مُلاقات میری اُن سے ہوئی تھی۔ میں نے ایک کتاب سادہ بے جلد اُن کو بھیجی تھی۔ کل اُن کا خط مجھ کو اس کتاب کی رسید میں آیا، بہت

تعریف لکھتے تھے کہ یہ "دستنبو" پہلے اس سے کہ تم بھیجو، مطبع مفید خلائق نے ہمارے پاس بھیجی ہے اور ہم اُس کو دیکھ رہے اور خوش ہو رہے تھے کہ تمھارا خط مع کتاب کے پہنچا۔ اُن کے اس لکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ مطبع میں سے گورنر کی نذر بھی ضرور گئی ہوگی کیا اچھی بات ہے کہ وہاں بھی میرے بھیجنے سے پہلے میرا کلام پہنچ جائے گا۔ میں چیف کمشنر پنجاب کو یہ کتاب بھیج چکا ہوں، اور نواب گورنر کی نذر اور ملکہ کی نذر اور سکریٹریوں کی نذر، یہ پارسل انشاء اللہ تعالیٰ آج روانہ ہو جائیں گے۔ دیکھوں چیف کمشنر کیا لکھتے ہیں اور گورنر کیا فرماتے ہیں:

"تا نہالِ دوستی کے بر دہد
حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

۳۰ر جنوری ۱۸۵۹ء کے ایک خط بنام منشی غلام غوث بے خبر سے پتا چلتا ہے کہ صدائے برنخاست:

"پیش گاہ گورنمنٹ کلکتہ میں جب کوئی کاغذ بھجوایا ہے، بہ قلم چیف سکرتر بہادر اس کا جواب پایا ہے۔ اب کی بار دو کتابیں بھیجیں: ایک پیش کش گورنمنٹ اور ایک نذرِ شاہی ہے، نہ اس کے قبول کی اطلاع، نہ اس کے ارسال سے آگاہی ہے۔ جناب ولیم میور صاحب بہادر نے بھی عنایت نہ فرمائی، ان کی بھی کوئی تحریر مجھ کو نہ آئی۔"

اگلے روز بے خبر ہی کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ:

"پیش گاہِ گورنمنٹ میں بتوسطِ چیف سکرتر بہادر سابق اور لیفٹیننٹ گورنر بہادر حال، دو مجلد پیش کیے ہیں۔ ایک نذرِ گورنمنٹ اور دوسری کے واسطے یہ سوال کہ میری عزت

بڑھائی جائے اور یہ مجلد حضورِ شہنشاہی میں بھجوائی جائے۔ ردّ و قبول، نفرین و آفرین کچھ بھی نہیں۔"

جہاں تہاں سے کتاب کی رسیدیں آنے لگیں اور غالب کے لیے یک گونہ خوشی اور خوش نفسی کا سامان فراہم کرنے لگیں:

"مجھ پر میرے اللہ نے ایک اور عنایت کی ہے اور اس غمزدگی میں ایک گونہ خوشی اور کیسی بڑی خوشی دی ہے۔ تم کو یاد ہوگا کہ ایک "دستنبو" نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر کی نذر بھیجی تھی آج پانچواں دن ہے کہ نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر کا خط مقامِ الہ آباد سے بہ سبیلِ ڈاک آیا۔ وہی کاغذِ افشانی، وہی القابِ قدیم، کتاب کی تعریف، عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات کبھی تم کو خدا یہاں لائے گا تو اس کی زیارت کرنا۔ پنسن کے بھی ملنے کا حکم آج کل آیا چاہتا ہے اور یہ بھی توقع پڑی ہے کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے۔"

(بہ نام مجروح، ۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء)

"حقیقت میری مجملاً یہ ہے کہ راہ و رسم مراسلت حکامِ عالی مقام سے بدستور جاری ہو گئی ہے۔ نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر غرب و شمال کو نسخہ "دستنبو" بہ سبیلِ ڈاک بھیجا تھا۔ ان کا خط فارسی مشعرِ تحسینِ عبارت و قبولِ صدقِ ارادت و مودّت بہ سبیلِ ڈاک آ گیا۔ پھر قصیدۂ بہاریہ تہنیت و مدحت میں بھیجا، اس کی رسید آ گئی۔ وہی "خان صاحب بسیار مہربانِ دوستان" القاب اور کاغذ افشانی۔ ازاں بعد ایک قصیدہ جناب رابرٹ منٹگمری صاحب لیفٹیننٹ گورنر بہادر قلمروِ پنجاب کی مدح میں

بہ توسط صاحب کمشنر بہادر دہلی گیا۔ اس کے جواب میں بھی خوشنودی نامہ بہ توسط کمشنر بہادر مجھ کو آ گیا۔ پنسن ابھی تک مجھ کو نہیں ملی۔"

(بہ نام چودہری عبدالغفور سرور، اپریل ۱۸۵۹ء)

"صاحب! بندے نے "دستنبو" جناب اشرف الاُمرا جارج فریڈرک ایڈمنسٹن صاحب بہادر لیفٹیننٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی نذر بھیجی تھی، سو اُن کا فارسی خط محررۂ دہم مارچ مشتمل بر تحسین و آفرین و اظہارِ خوشنودی، بہ طریقِ ڈاک آ گیا۔ پھر میں نے تہنیت میں لیفٹیننٹ گورنر کی قصیدہ فارسی بھیجا۔ اس کی رسید میں نظم کی تعریف اور اپنی رضامندی پر متضمن خط فارسی بہ سبیلِ ڈاک مرقومۂ چہاردہم آ گیا۔ پھر ایک قصیدہ فارسی مدح و تہنیت میں جناب رابرٹ منٹگمری صاحب بہادر دہلی بھیجا گیا تھا۔ کل ان کا مہری خط بذریعہ صاحب کمشنر بہادر دہلی آ گیا، پنسن کے باب میں ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ اسبابِ توقع فراہم ہوتے جاتے ہیں۔" (بہ نام مہر، مارچ، اپریل ۱۸۵۹ء)

"اسبابِ توقع" فراہم ہونے لگے لیکن "دستنبو" کی غایتِ تصنیف معمولی پنشن کی واگذاشت ہی نہیں تھی۔ وہ ملکہ وکٹوریہ انگلستان سے مزید خطاب و خلعت اور پنشن کے بھی اُمیدوار تھے، جس کے لیے وہ انقلابِ ۱۸۵۷ء سے پہلے زمین ہموار کر چکے تھے اور ان کی گزارشات پر ضروری کارروائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قلعہ معلّا سے تعلّق کے بعد غالب کے:

"۶،۵ برس آرام سے گزرے۔ پنسن کے سات سو پچاس روپے سالانہ، بادشاہ سے چھ سو روپے سالانہ، شہزادہ ولی عہد مرزا فخرو اُن کے شاگرد ہو گئے تھے، اُن سے چار سو روپے سالانہ۔ ۱۸۵۴ء کے آخر آخر غالب اس کی بھی سبیل پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ انھیں اودھ کے علم دوست اور فن کار بادشاہ واجد علی شاہ سے

بندھی ہوئی رقم مل جایا کرے۔ چنانچہ وہاں سے بھی پانچ سو روپے سالانہ مقرر ہو گئے۔ اِدھر اُدھر کی ریاستوں اور قدر دان امیروں کی طرف سے بھی "فتوح" پہنچ جایا کرتی تھی، لیکن یہ سب کچے ٹھکانے تھے اور غالب کو جو درباروں کے رازداں اور بدلتے ہوئے حالات کے نبّاض تھے، آگے کی طرف سے کھٹکا لگا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ اس تیزی سے ڈھلتی ہوئی عمر اور صحت کے ساتھ اپنے مستقبل کی حیثیت کا پکا بندوبست کر لینا چاہتے تھے اور اس کی خاطر انگریزی اقتدار کا خوش رکھنا اور گورنر جنرل کے دفتر میں مقام بنانا ضروری تھا۔[1]"

"۱۸۵۶ء کے ختم ہوتے ہوتے برطانوی اقتدار سے خود کو منوانے کی کوششیں سنجیدہ ہو گئیں اور انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کی تعریف میں پُر زور قصیدہ لکھ کر لندن بھیجا جس کا سارا زور حاجت روائی پر تھا اور ساتھ میں ایک عرضی بھی تھی کہ بادشاہوں کی شاعر نوازی کے چلن کے مطابق مجھے بھی خطاب، خلعت اور پنشن سے نوازا جائے۔ اس قصیدے اور عرضی کی رسید اُن کو ۱۸۵۷ء کے آغاز میں لندن سے مل گئی تھی اور نہ جانے کیسی کیسی اُمیدیں بندھ گئی تھیں کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو شمالی ہند میں برطانوی اقتدار کے خلاف سُلگتی ہوئی آگ بھڑک اٹھی۔[2]"

"دستنبو" میں اس کی تفصیل درج کرنے کے بعد، غالب نے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ:

> "اگر ہندوستان کا نظم و نسق (غدر میں) تباہ نہ ہوتا اور ناخدا ترس اور ناشکرے سپاہیوں کے ہاتھوں عدالتیں نہ اُجڑتیں تو گلستانِ انگلستان سے ایسا فرمان صادر ہوتا جس سے (خطاب، خلعت اور پنسن کی میری) مُرادیں پوری ہو جاتیں اور میری آنکھیں اور میرا دل دونوں ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے۔"

---

[1]، [2] ڈاکٹر ظ۔ انصاری، شاعر بمبئی، فروری مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ ۵۹۶۔

"دستنبو" کے خاتمے کی عبارت سے بھی غرضِ تصنیف پر روشنی پڑتی ہے:

"کاش! میری ان تین خواہشوں یعنی: خطاب، خلعت اور پنشن کے اجرا کا حکم شہنشاہِ فیروز بخت کے حضور سے آجائے، جن کے متعلق میں نے اس تحریر میں بھی (کچھ) لکھا ہے۔ میری آنکھیں اور میرا دل انھیں کی طرف لگا ہوا ہے۔ اگر ملکۂ عالم کی بخشش سے میں کچھ حاصل کرلوں گا تو اس دُنیا سے ناکام نہیں جاؤں گا۔"

خواجہ غلام غوث بے خبر کے نام غالب کے ایک خط مورخہ ۱۲ جنوری ۱۸۵۹ء سے "دستنبو" کی غرضِ تصنیف بالکل آئینہ ہو جاتی ہے:

"۷ دسمبر ۱۸۵۶ء کا لکھا ہوا حکم وزیرِ اعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ قصیدے کے صلے اور جائزے کے واسطے کہ بہ توسط لارڈ (کیننگ) سائل نے بھجوایا ہے، خطاب اور خلعت اور پنسن کی تجویز ضرور ہے جو حکم صادر ہو گا، سائل کو بہ توسط گورنمنٹ اس کی اطلاع دینی منظور ہے۔ یہ حکم مورخہ ۷ دسمبر ۱۸۵۶ء، آخر جنوری ۱۸۵۷ء میں، میں نے پایا۔ فروری، مارچ، اپریل خوشی اور توقع میں گزرے مئی ۱۸۵۷ء میں فلک نے یہ فتنہ اٹھایا۔ اب اس کتاب "دستنبو" اور دوسرے قصیدے (مشمولۂ "دستنبو") کے جا بجا نذر کرنے کا یہ سبب ہے کہ سائل، محکمۂ ولایت کو یاددہی کرتا ہے اور گورنمنٹ سے تحسین طلب ہے۔"

لیکن یہ "یاددہی" زود اثر نہ رہی اور نئے انعام اور اعزاز کا تو کیا مذکور، اشاعتِ کتاب کے ایک سال بعد تک غالب کو دستورِ قدیم کی بحالی کی طرف سے بھی اطمینان نہیں تھا:

"مانا کہ کوئی خیرخواہی نہیں کی جو نئے انعام کا مستحق ہوں، لیکن کوئی بے وفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستورِ قدیم کو برہم مارے۔"

(بہ نام نواب محمد یوسف علی خاں، ۲۷ نومبر ۱۸۵۹ء)

اور پھر خدا خدا کر کے پنشن مقرری مئی ۱۸۶۰ء[1] میں کھل گئی۔ زرِ مجتمعہ سہ سالہ یک مُشت پا لیا اور مارچ ۱۸۶۳ء میں پچھلے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم بھی آ گیا، لیکن ملکۂ انگلستان کے ہاں سے مزید خطاب و خلعت اور پنشن کی تجویز و تحریک جہاں کی تہاں رہ گئی۔

کتاب کی طباعت کے دوران میں غالب کو ایک اور سوجھی، ۲۱ ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں:

"بالما صاحب! ایک بات اور ہے اور وہ محلِ غور ہے میں نے حضرت ملکۂ معظمہ انگلستان کی مدح میں ایک قصیدہ ان دنوں میں لکھا ہے "تہنیتِ فتحِ ہند اور عمل داریِ شاہی" ساٹھ بیت کا ہے۔ منظور یہ تھا کہ کتاب کے ساتھ قصیدہ ایک اور کاغذِ مذہّب پر لکھ کر بھیجوں پھر یہ خیال آیا کہ دس سطر کے مسطر پر کتاب لکھی گئی ہے، یعنی چھاپا ہوئی ہے۔ اگر یہ چھ صفحے، یعنی تین ورق اور چھپ کر اس کتاب کے آغاز میں شامل ہو جائیں تو بات اچھی ہے۔ آپ اور منشی نبی بخش صاحب اور مرزا تفتہ، منشی شیو نرائن صاحب سے کہہ کر اس کا طور درست کریں اور پھر مجھ کو اطلاع دیں تو میں مسوّدہ آپ کے پاس بھیج دوں جب کتاب چھپ چکے تو یہ چھپ جائے۔ دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ یہ چھپے بعد کتاب کے اور لگایا جائے پہلے کتاب کے، دوسری یہ کہ اس کی سیاہ قلم کی لوح الگ ہو، اور پہلے صفحے پر جس طرح کتاب کا نام چھاپتے ہیں، اسی طرح یہ بھی چھاپا جائے کہ "قصیدہ در مدحِ جنابِ ملکۂ

---

[1] نظر بظاہر "دستنبو" ہی پنشن کے اجرا کا باعث ہوئی۔ رجوع کیجیے خط بہ نام میر مہدی مجروح، مارچ ۱۸۵۹ء۔

انگلستان خلد اللہ ملکہا ـــــــ میرا نام کچھ ضرور نہیں، کتاب کے صفحے پر تو ہو گا۔ اس مطلبِ خاص کا جوابِ باصواب یعنی نویدِ قبول جلد لکھیے۔"

دوسرے دن منشی نبی بخش حقیر کو اسی مضمون کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"بھائی جان! میں نے ایک قصیدہ جناب ملکۂ معظمہ انگلستان کی مدح میں لکھا ہے۔ ساٹھ شعر ہیں، چھ صفحے یعنی تین ورق پر چھپ کر "دستنبو" سے پہلے شیرازہ میں شامل کر دیے جائیں تو کتاب کو قصیدے سے عزت، اور قصیدے کو کتاب کے سبب شہرت ہو جائے گی۔ مہتمم مطبع کو اگر کچھ تامل ہو تو ہو، ورنہ بات آسان ہے۔"

۲۹ ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط موسومہ حاتم علی بیگ مہر میں لکھتے ہیں:

"قصیدے کا شاملِ کتاب ہونا بہت ضروری ہے، پر دیکھا چاہیے کہ صاحبِ مطبع کو کیا منظور رہے، اگر وہ کاغذ کی قیمت کا عذر کریں تو ہم پانچ سات روپے سے اور بھی ان کا بھرنا بھریں گے۔"

لیکن صاحبِ مطبع کی "منظوری" آگئی، ۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ء کو تفتہ کو لکھا:

"صاحب! قصیدے کے چھاپے جانے کی بشارت صاحبِ مطبع نے مجھ کو بھی دی ہے، خدا اُن کو سلامت رکھے۔"

تفتہ نے پوچھا تھا کہ اس قصیدے کو کتاب کا دیباچہ کیوں نہ بنا دیا جائے؟ لیکن یہ کتاب کے اِدّعاے تحریر کے منافی تھا۔ کتاب کی نثر و نظم فارسیِ قدیم میں تھی، یعنی بے آمیزشِ لفظِ عربی، اور قصیدہ فارسیِ متعارفہ و مُروّجہ میں تھا۔ غالب نے ان دونوں کے اجماع کی یہ صورت نکالی:

"قصیدے کا نثر سے پہلے لگانا ازراہِ اکرام و اعزاز ہے، ورنہ نثر میں اور صنعت اور نظم کا اور انداز ہے۔ یہ اس کا دیباچہ کیوں ہو؟ بلکہ صورت ان دونوں کے اجماع کی یوں ہو کہ سر رشتۂ آمیزش توڑ دیا جائے

اور قصیدے کے اور "دستنبو" کے بیچ میں ایک ورق سادہ چھوڑ دیا جائے۔"

(بہ نام تفتہ، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

یہ "قصیدۂ برگزیدہ" "دستنبو" طبع اوّل میں چھ صفحوں پر مشتمل ہے اور سرورق کے بعد آغازِ کتاب میں شامل ہے اور اس کے بعد نئے سرے سے صفحوں کا شمار ہوتا ہے۔

"دستنبو" طبعِ اوّل کے بیل دار سرورق کی سات سطری عبارت یہ ہے:

(سطر: ۱) العلمہ طاقتہ[1]

(سطر: ۲) کتاب مستطاب نایاب بہ زبانِ فارسی قدیم بے آمیزش لفظ عربی

(سطر: ۳) تصنیف فردوسی ہند نواب اسد اللہ خاں بہادر غالب تخلص دہلوی موسوم بہ

(سطر: ۴) دستنبو

(سطر: ۵) جس میں مصنف نے اپنی سرگزشت ابتدائے ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک

(سطر: ۶) لکھی ہے مع قصیدہ تہنیت فتح ہند کہ وہ بہ زبانِ فارسی متعارف زیرِ وجہ ہے۔

(سطر: ۷) مطبع مفید خلائق آگرہ میں واسطے افادۂ خاص و عام کے باہتمام شیو نرائن کے چھاپی گئی

سرورق کی پہلی سطر "العلمہ طاقتہ" پر مشتمل ہے۔ یہ نسبتاً جلی قلم سے ہے، اور صاحبِ مطبع منشی شیو نرائن آرام کی اپج ہے۔ اکتوبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب اُنھیں لکھتے ہیں: "العلمہ طاقتہ شوق سے لکھو"۔ اس کے علاوہ سرورق کی ساری عبارت جسے سات سطروں میں تقسیم کیا گیا ہے، غالب کی اپنی ترتیب اور ہدایت کے مطابق ہے۔ اس کا ابتدائی مسودہ آگرے میں تیار ہوا تھا جس میں غالباً انگریزوں کی فتح کے مفصل حالات کی طرف بھی اشارہ تھا۔ غالب نے اُسے خلافِ مضمونِ کتاب

---

[1] "العلمہ کی جگہ "العلم" چاہیے تھا، مگر مطبع مفید خلائق کی چھپی ہوئی "دستنبو" کی لوح پر بھی العلمہ طاقتہ ہی چھپا ہوا ہے۔"

(ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، خطوطِ غالب، مالک رام، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، ص: ۳۲۵)

قرار دیتے ہوئے آرام کو لکھا کہ خوب ہوا جو تم نے مجھ سے پوچھ لیا ورنہ بڑی قباحت ہوتی اور مطبع پر بات آتی :

" صفحے کے آخر[1] کی دو سطریں از روئے مضمون سراسر کتاب کے مضمون کے خلاف ہیں۔ میں نے سرکار کی فتح کا حال نہیں لکھا ۔ صرف اپنی پندرہ مہینے کی سرگزشت جو میں نے لکھی ہے سو ابتدائے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک لکھی ہے ۔ شہر ستمبر میں فتح ہوا ، اس کا بھی بیان ضمناً آگیا ۔ خوب ہوا جو تم نے مجھ سے پوچھ لیا ورنہ بڑی قباحت ہوتی ۔ اب میں جس طرح سے کہوں ، سو کرو ۔ پہلے سوچو کہ تقسیم یوں ہے کہ تین سطریں اوپر تین سطریں نیچے اور بیچ میں ایک سطر ، اس میں کتاب کا نام ۔ کیوں میاں ، تقسیم یوں ہی ہے ؟ اب میں دوسرے صفحے پر ساتوں[2] سطریں لکھ دیتا ہوں ، اس کو ملاحظہ کرو ، اور میرا کہا مانو ورنہ کتاب کی حقیقت غلط ہو جائے گی اور مطبع پر بات آئے گی ۔" (شیو نرائن آرام ، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

اواخر اکتوبر ۱۸۵۸ء کے ایک دوسرے خط میں غالبؔ نے آرام کو لکھا کہ :

"دستنبو" کے آغاز کی عبارت از روئے احتیاط دوبارہ ارسال کی ہے ۔ یقین ہے کہ پہنچ گئی ہوگی اور چھاپی گئی ہوگی ۔"

سرورق کی تقسیم غالبؔ کی ہدایت کے عین مطابق ہے ۔ یعنی تین سطریں اوپر ،

---

[1] سہواً اُردوئے معلّی میں "آخر کے صفحے" چھپا ہے ۔ یہ غالبؔ کا سہوِ قلم ہے یا کاتب کی لغزش یہ کہنا تو مشکل ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ غلطی "اُردوئے معلّی" کی پہلی طباعت سے اب تک چلی آرہی ہے ۔

[2] فاضل لکھنوی کو ان سات سطروں کے ضمن میں صریح التباس ہوا ہے ۔ ملاحظہ کیجیے اُردوئے معلّی ، مجلس ترقیِ ادب لاہور ، صدی ایڈیشن ، ص ۱۷۱

تین سطریں نیچے اور بیچ میں ایک سطر، اس میں کتاب کا نام، لیکن ۱۸۵۷ء سے پہلے "ار مئی" کا ٹکڑا سرورق کی مطبوعہ عبارت سے محذوف ہے۔ جس کی وجہ سے کتاب کی حقیقت کسی قدر غلط ہو گئی۔

دستنبو (طبع اوّل) کے سرورق پر مصنّف کا نام "نواب اسدُاللہ خاں بہادر غالبؔ" درج ہے۔ یہ غالبؔ کی اپنی پسند اور ہدایت کے مُطابق ہے۔ صاحب مطبع منشی شیو نرائن نے ایک خط کے لفافے پر "مرزا نوشہ صاحب غالبؔ" لکھ دیا تھا۔ غالبؔ اس سے بددل ہوئے اور یکم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں مرزا تفتہؔ کو لکھا کہ:

"صاحبِ مطبع نے خط کے لفافے پر لکھا ہے: "مرزا نوشہ صاحب غالبؔ" بِللہ غور کرو یہ کتنا بے جوڑ جملہ ہے۔ ڈرتا ہوں کہیں صفحۂ اوّل پر بھی نہ لکھ دیں۔ آیا فارسی کا دیوان، یا اُردو، یا پنج آہنگ یا مہرِ نیم روز چھاپے کی، یہ کوئی کتاب اس شہر میں نہیں پہنچی جو وہ میرا نام دیکھ لیتے، تم نے بھی ان کو میرا نام نہیں بتایا، صرف اپنی نفرت عرف سے وجہ اس واویلا کی نہیں، بلکہ سبب یہ ہے کہ دلّی کے حکّام کو تو عرف معلوم ہے مگر کلکتہ سے ولایت تک یعنی وزرا کے محکمے میں اور ملکۂ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا۔ بس اگر صاحبِ مطبع نے "مرزا نوشہ صاحب غالبؔ" لکھ دیا تو میں غارت ہو گیا، کھویا گیا، میری محنت رائیگاں گئی۔ گویا کتاب کسی اور کی ہو گئی۔"

سوم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تفتہؔ کو بتاکید لکھتے ہیں کہ:

"منشی شیو نرائن کو سمجھا دینا کہ زنہار عرف نہ لکھیں، نام اور تخلّص بس۔ اجزائے خطابی کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر ہے۔ مگر ہاں، نام کے بعد لفظ "بہادر" کا، اور "بہادر" کے بعد تخلّص "اسدُاللہ خاں بہادر غالبؔ"۔

تفتہؔ نے پوچھا تھا کہ آیا کتاب پر نام محمد اسداللہ خاں لکھا جائے؟ نیز "مرزا" و

"مولانا" و "نواب" میں سے کیا لکھا جائے ؟ ۷، ستمبر ۱۸۵۸ء کو جواباً لکھتے ہیں کہ :

"سنو صاحب! لفظِ مبارک میم، حا، میم، دال (محمّد) اس کے ہر حرف پر میری جان نثار ہے، مگر چونکہ یہاں سے ولایت تک حکام کے ہاں سے یہ لفظ یعنی "محمد اسد اللہ خان" نہیں لکھا جاتا، میں نے بھی موقوف کر دیا ہے۔ رہا "میرزا" و "مولانا" و "نواب" اس میں تم کو اور بھائی کو اختیار ہے جو چاہو سو لکھو۔"

۳۰، ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں تفتہ کو کھلی چھٹی دے دی کہ "نام میرا جس طرح چاہو لکھ دو" لیکن اکتوبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں خود شیو نرائن کو بڑی ملائمت سے سمجھاتے ہیں کہ :

"سنو میری جان! نوابی کا مجھ کو خطاب ہے "نجم الدولہ" اور اطراف و جوانب کے اُمرا سب مجھ کو "نواب" لکھتے ہیں، بلکہ بعض انگریز بھی۔ چنانچہ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے جو ان دنوں میں ایک روبکاری بھیجی ہے تو لفافے پر "نواب اسد اللہ خان" لکھا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ نواب کے لفظ کے ساتھ "میرزا" یا "میر" نہیں لکھتے۔ یہ خلافِ دستور ہے۔ یا "نواب اسد اللہ خان" لکھو۔ یا "میرزا اسد اللہ خان" لکھو اور "بہادر" کا لفظ تو دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔"

"دستنبو" (طبعِ اوّل) کا متن صفحہ ۹۷ پر ختم ہو جاتا ہے۔ آخر میں "تمام شد" کے الفاظ کے بعد یہ جملہ ثبت ہے :

"اس کتاب کو بغیر اجازت مہتمم مفید خلائق کے کوئی صاحب چھاپنے کا ارادہ نہ کریں، فقط۔"

یہ امر بھی خطوں میں زیرِ غور رہا ہے۔ تفتہ کے نام سوم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں

اس کی طرف اشارہ ملتا ہے:

"اوروں کے چھاپنے کی ممانعت ضرور ہے، مگر اس کی عبارت کیا بتاؤں؟ صاحبِ مطبع اس اَمر کو اُردو میں آخرِ کتاب پر لکھ دیں... خاتمے پر ممانعت کا حکم صاحبِ مطبع سے لکھوا دو۔"

اس کے بعد ایک دوسرے خط میں تفتہ ہی کو لکھتے ہیں:

"بھائی تم نے بھی اور منشی شیو نرائن صاحب نے بھی لکھا، میں ایک عبارت لکھتا ہوں، اگر پسند آئے تو خاتمۂ کتاب میں چھاپ دو:

نامہ نگار غالبؔ خاکسار کا یہ بیان ہے کہ یہ جو میری سرگزشت کی داستان ہے، اس کو میں نے مطبع مفید خلائق میں چھپوایا ہے اور میری رائے میں اس کا یہ قاعدہ قرار پایا ہے کہ اور صاحبانِ مطابع جب تک مجھ سے طلب رُخصت نہ کریں، اپنے مطبع میں اس کے چھاپنے کی جرأت نہ کریں۔

اس کے سوا اگر کوئی طرح کی تحریر منظور ہو تو منشی شیو نرائن صاحب کو اجازت ہے کہ میری طرف سے چھاپ دیں۔ یہ پہلے بھی لکھ چکا ہوں"

چنانچہ غالبؔ کی "میں" زدہ عبارت کے بجائے "مہتممِ مفیدِ خلائق" کی جانب سے ممانعت کا وہ مختصر اور موثر جملہ چھاپا گیا، جو اوپر نقل ہوا ہے۔

دستنبو (طبعِ اوّل) میں آخری صفحے پر دو قطعاتِ تاریخ ہیں۔ ایک آغازِ کتاب کا، اور دوسرا انجامِ کتاب کا:

۱۔ قطعۂ تاریخ

آغازِ کتاب از میرزا حاتم علی بیگ مہرؔ تخلص سلّمہ اللہ تعالیٰ

اسداللہ خان غالب مہر	جُستہ از در رقم چہ دستنبو
نامہ خود سالِ خویش داد نشاں	ید بیضا ستم چہ دستنبو

۱۸۵۷ء

۲ - قطعۂ تاریخ

انجامِ کتاب از میرزا تفتہ سلّمہ اللہ تعالیٰ

کتابے زد رقم غالب کہ آں را | بجان و دل جہانے گشت طالب
نوشتم تفتہ سالِ اختتامش | بیا بنگر چہ دستنبوے غالب

۱۸۵۸ء

ان قطعات کا ذکر بھی خطوں میں موجود ہے۔ میرزا تفتہ کو ان لفظوں میں قطعۂ تاریخ پر داد اور اصلاح دی ہے:

"بندہ پرور! آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ آپ کی مہرانگیز اور محبت خیز باتوں نے غم بےکسی بھلایا۔ کہاں دھیان لڑا ہے! کہاں سے "دستنبو" کی مناسبت کے واسطے "ید بیضا" ڈھونڈ نکالا ہے! آفریں! میرا مصرع اگر یوں ہو تو فقیر کے نزدیک بہت مناسب ہے:

نامہ خود سالِ خویش داد نشاں "

دستنبو کے مطبوعہ قطعۂ تاریخ میں مصرع کی یہی روایت چھپی ہے۔ میرزا تفتہ کو مادۂ تاریخ کے سقیم ہونے کے بارے میں کچھ وہم رہا ہوگا۔ قطعہ موزوں کرنے سے پہلے انھوں نے اس بارے میں غالباً ایک دو بار استفسار کیا۔ ۲۹ ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں انھیں لکھتے ہیں:

"مادۂ تاریخ میں کیا بُرائی ہے جو تمھارے جی میں یہ بات آئی ہے کہ مجھ سے بار بار پوچھتے ہو؟ مادہ اچھا ہے: قطعہ لکھو اور خاتمۂ کتاب پر لگا دو۔ ایک قطعہ مرزا صاحب (تفتہ) کا، ایک قطعہ تمھارا، یہ دونوں قطعے رہیں اور اگر وہاں کوئی اور صاحب شاعر ہوں تو وہ کہیں۔
اس عبارت سے یہ نہ سمجھنا کہ روے سخن ساری خدائی کی طرف ہے، بلکہ خاص یہ اشارہ بھائی (نبی بخش حقیر) کی طرف ہے مولانا حقیر کو توجہ اس باب میں چاہیے اور ان کا نام بھی اس کتاب میں چاہیے۔"

۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں تفتہ کو بھی لکھا ہے کہ:

"بھائی میرزا تفتہ! ایک قطعہ میرزا صاحب (حاتم علی بیگ مہر) کا، ایک قطعہ تمھارا، بلکہ ایک حقیر سے بھی لکھواؤ۔"

لیکن حقیر کا کوئی قطعہ "دستنبو" میں شاملِ اشاعت نہیں۔ اس طرح ان کا نام تو جیسا کہ غالب چاہتے تھے، کتاب میں نہیں آسکا۔ لیکن اس کتاب کے سلسلے میں ان کا نام ان معنی میں ناگزیر ہے کہ کتاب کی کاپیاں پڑھنے، تصحیح کرنے اور غلطیاں بنانے کی سراسر ذمّے داری انھی کی رہی۔

"کاپی کی تصحیح ہو، غلط نامے کی حاجت نہ پڑے، آپ خود متوجہ رہیے گا اور منشی نبی بخش صاحب کو اگر کہیے گا تو وہ بھی شریک رہیں گے۔"

(بہ نام شیو نرائن، ۳۱ اگست ۱۸۵۸ء)

"صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے، اگر غلط ہو جائے تو پھر وہ عبارت نری خرافات ہے۔ بارے بہ سبب التفات بھائی منشی نبی بخش صاحب کے صحتِ الفاظ سے خاطر جمع ہے۔ متوقع ہوں کہ وہ تکلیف سہیں اور ختمِ کتاب تک متوجہ رہیں۔"

(بہ نام حاتم علی بیگ مہر، ستمبر ۱۸۵۸ء)

"کاپی کی تصحیح کا ذمّہ بھائی (نبی بخش حقیر صاحب) کا ہو گیا ہے۔ جلدوں کی آراستگی کا ذمّہ برخوردار عبداللطیف کا کر دو۔ میری طرف سے دعا کہو اور کہو کہ تصحیح بھائی کریں، تزئین تم کرو۔ بھتیجے کی دست کاری اور صناعی اور ہوشیاری ان کی میرے کس دن کام آئے گی۔"

(بہ نام ہرگوپال تفتہ، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"بھائی نبی بخش صاحب کی شفقت کا حال پوچھنا ضروری نہیں۔ مجھ پر مہربان اور حسنِ کلام کے قدر دان ہیں۔ اس کی تصحیح میں بے پروائی کریں گے تو کیا میری تفضیح کے روادار ہوں گے؟"

(بہ نام تفتہ، مابین سوم و ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"صحتِ الفاظ کا کیا کہنا ہے۔ واللہ بے مبالغہ کہتا ہوں کہ بھائی منشی نبی بخش صاحب بہ دل متوجہ ہوں تو اگر احیاناً اصل نسخے میں ہو کاتب سے غلطی واقع ہوئی تو اس کو بھی تصحیح کر دیں گے۔ خدا کرے انجام تک یہی طرزِ تصحیح چلی جائے۔"

(بہ نام تفتہ، ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"بھائی صاحب (منشی نبی بخش حقیر) کو کاپی کی تصحیح سے فراغت ہوگئی؟ بھائی صاحب کو بعد از سلام کہیے گا کہ حضرت اپنے مطلب کی تو مجھ کو جلدی نہیں ہے، آپ کی تخفیفِ تصدیع چاہتا ہوں، یعنی اگر کاپی کا قصہ تمام ہو جائے تو آپ کو آرام ہو جائے۔"

(بہ نام تفتہ، ۱۶ اکتوبر ۱۸۵۸ء)

غرض یہ کہ کاپی کی تصحیح کا ذمہ منشی نبی بخش حقیر کا تھا اور وہ اُس میں پورے اُترے کہ "دستنبو" غلط نامے کی حاجت سے بے نیاز رہی۔ گو دو تین غلطیاں پھر بھی رہ گئیں۔[1] اور یہ کوئی ایسی بات نہیں اس لیے کہ مولانا غلام رسول مہر کے لفظوں میں:

"ہمارے ہاں طباعت کے انتظامات ابھی تک اس اعلا پیمانے پر نہیں پہنچ سکے کہ صحتِ متن کے متعلق فارغ البالی کا وثیقہ حاصل

---

[1] نامۂ غالب بہ نام شیو نرائن، مرقومہ ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء۔

کر لیا جائے [1]۔"

غالب نے "دستنبو" کو بہ زبانِ فارسیِ قدیم لکھنے کا ادّعا کیا ہے، یعنی التزام یہ رکھنا چاہا ہے کہ تمام کی تمام عبارت خواہی نظم ہو، خواہی نثر جو متنِ کتاب میں آئے بے آمیزشِ لفظِ عربی ہو۔ "دستنبو" طبعِ اوّل کے سرِ ورق پر اپنے اس کمالِ فن کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے:

"کتابِ مستطاب نایاب بہ زبانِ فارسیِ قدیم، بے آمیزشِ لفظِ عربی۔"

کتاب کی اشاعت سے پہلے مختلف خطوں میں فارسیِ قدیم کی خود اختیاری قید کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:

"فارسی، بے آمیزشِ لفظِ عربی لکھی ہے اور فارسی بھی وہ فارسیِ قدیم کہ جس کا اب پارس کے بلاد میں نشان نہیں، تا بہ ہندوستان چہ رسد؟"

(بہ نامِ نامعلوم، ۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء)

"التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسیِ قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظِ عربی نہ آئے، جو نظم اس نثر میں درج ہے، وہ بھی بے آمیزشِ لفظِ عربی ہے۔ ہاں، اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے، وہ عربی، انگریزی، ہندی، جو ہیں، وہ لکھ دیے ہیں۔"

(بہ نامِ منشی ہرگوپال تفتہ، ۱۷ اگست ۱۸۵۸ء)

"میں نے گیارھویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد نثر میں بعبارتِ فارسی ناآمیختہ بہ عربی لکھی ہے۔ "دستنبو" اس کا نام رکھا ہے۔" (بہ نامِ انور الدولہ شفق، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

---

[1] نقوش لاہور، غالب نمبر ۲، ۱۹۷۱ء، صفحہ ۳۱۔

کتاب چھپ جانے کے بعد لکھتے ہیں:

"بطریقِ لزومِ مالایلزم اس کا التزام کیا ہے کہ بہ زبانِ فارسیِ قدیم، جو دساتیر کی زبان ہے۔ اُس میں یہ نسخہ لکھا جاوے اور سوائے اسما کے، کہ وہ نہیں بدلے جاتے، کوئی لغتِ عربی اس میں نہ آوے۔"

(بہ نام چودھری عبدالغفور سرور، ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء)

"نثرِ فارسی زبانِ قدیم میں ہے کہ جس میں کوئی لفظِ عربی نہ آوے۔"

(بہ نام یوسف علی خاں عزیز، ۱۸۵۹ء)

کتاب کی طباعت کے دوران میں غالبؔ کو احساس ہُوا کہ وہ ایک عربی لفظ "نہیب" استعمال کر گئے ہیں۔ یہ اُن کے ادّعائے تحریر کے منافی تھا، چنانچہ انھیں صبر کہاں، وہ بے چین ہو گئے:

"ایک اور کام آپ کو کرنا چاہیے کہ شاید تیسرے صفحے کے آخر میں، یا چوتھے صفحے کے شروع میں یہ فقرہ ہے: اگر دردم دیگر بہ نہیب مباش بہم زند۔ "نہیب" کا لفظ عربی ہے۔ یہ سہو سے لکھا گیا ہے۔ اس کو چھیل ڈالیے گا اور اس کی جگہ "نوائے مباش" بنا دیجیے گا۔ "نہیب" کی جگہ "نوائے" کا لفظ بنا کر مجھ پر عنایت کیجیے۔"

(بہ نام شیو نرائن، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"بہت ضروری یہ اَمر ہے اور میں منشی شیو نرائن صاحب کو آج صبح لکھ چکا ہوں، تیسرے صفحے کے آخر یا چوتھے صفحے کے اوّل یہ جملہ ہے: اگر دردم دیگر بہ نہیب مباش بہم زند۔ "نہیب" کی جگہ "نوائے" بنا دیا "بہ نوائے مباش بہم زند"۔ "نہیب" لفظِ عربی ہے۔ اگر یہ رہ جائے گا تو لوگ مجھ پر اعتراض کریں گے۔ تیز چاقو کی نوک سے "نہیب" کا لفظ چھیلا جائے

اور اسی جگہ "نوائے" لکھ دیا جائے۔"

(بہ نام تفتہ، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"نہیب" کے لفظ کو چھیل کر "نوائے" بنا دیا ہو گا؟"

(بہ نام تفتہ مابینِ سوم و ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"آنکہ ہمہ را در یک دم بہ نوید بشو پدید آورد، اگر در دم دیگر بہ نہیب مباش بہم زند الخ "اس میں "نہیب" کا لفظ کچھ میری سہل انگاری سے اور کچھ سہوِ کاتب سے رہ گیا ہے۔ اس کو تیز چاقو سے چھیل کر "بہ نوائے" لکھ دینا یعنی "بہ نوائے مباش بہم زند" ضرور، ضرور، اور اس کا انتظار نہ کیجیو کہ جب یہاں چھاپا آئے گا بنا دیں گے۔ نہ اصل کتاب میں غلط رہے، نہ چھاپے میں غلط ہو۔ اگر اجزائے اصل میرا میر علی صاحب کاپی نویس کے پاس ہوں تو ان کو یا بھائی نبی بخش صاحب کو یہ رقعہ دکھا کر سمجھا دینا اور بنوا دینا۔"

(بہ نام تفتہ، ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء)

اس داویلے کے باوجود معلوم ہوا کہ "نہیب" کی درستی نہیں ہو سکتی۔ وہ حصۂ کتاب جس میں یہ لفظ آیا ہے، چھپ چکا۔ اس پر اپنی تہی دستی کے باوجود غالب نے بہت حساس ہونے کا ثبوت دیا:

"اچھا میرا بھائی! "نہیب" والے دو ورقے چار سو ہوں، پانسو ہوں، سب بدلوا ڈالنا۔ کاغذ کا جو نقصان ہو وہ مجھ سے منگوا لینا۔ اس لفظ کے رہ جانے میں ساری کتاب نکمّی ہو جائے گی اور میرے کمال کو دھبّا لگ جائے گا۔ یہ لفظ عربی ہے۔ ہر چند مسودے میں بنا دیا تھا لیکن کاتب کی نظر سے رہ گیا۔ "نہیب" کے نہیب سے مرا جاتا ہوں، اس

کی دُرستی کی خبر بھیجو۔"

(بہ نام تفتہ، ۱۶ ستمبر ۱۸۵۸ء)

یہاں تک کہ بالآخر اس غلطی کی دُرستی ہوگئی:

"نہیب کی جگہ "نوا" بن جانے سے خاطر جمع ہوگئی۔ بھائی! میں فارسی کا محقق ہوں۔ کاتب ان اجزا کا، جن کی رو سے کاپی لکھی جاتی ہے (یعنی غالب) فارسی کا عالم ہے، علم اس کا غیاث الدین رام پوری اور حکیم محمد حسین دکنی سے زیادہ ہے۔ تصحیح سے غرض یہ ہے کہ کاپی سراسر موافق ان اوراق کے ہو، نہ یہ کہ فرہنگوں میں دیکھا جائے۔"

(بہ نام تفتہ ۲۱ ستمبر ۱۸۵۸ء)

لیکن اس اہتمام و کاوش، حزم و احتیاط اور "نفسِ مطمئنہ" کے باوجود وہ اس التزام میں تمام و کمال پورا نہیں اُتر سکے کہ "بہ زبانِ فارسیِ قدیم" جو دساتیر کی زبان ہے، اُس میں یہ نسخہ لکھا جاوے اور سوائے اسما کے کہ وہ نہیں بدلے جاتے، کوئی لغتِ عربی اس میں نہ آوے۔" "نہیب" کی ہر قیمت پر انھوں نے صحت کر دی تھی، بایں ہمہ بعض لغات ان کی نظر سے رہ گئے، جن سے سید جمیل الدین نے اپنے ایک مقالے میں جو "دستنبو کا ایک خاص نسخہ" کے زیرِ عنوان سہ ماہی "نوائے ادب" بمبئی کی چار اشاعتوں[1] میں قسط وار چھپا ہے، بہت اچھی بحث کی ہے۔ ان میں سے کچھ عربی کلمات مثلاً ماتم، زمزمہ، شرر، صاحب، قلعہ، کیسہ، غوغا، خنجر کی مثال دی جا سکتی ہے۔ پنجاب

---

[1] (الف) جلد ۶ شمارہ ۱، جنوری ۱۹۵۵ء، ص ۲۱۔

(ب) جلد ۶ شمارہ ۲، اپریل ۱۹۵۵ء، ص ۲۷۔

(ج) جلد ۶ شمارہ ۳، جولائی ۱۹۵۵ء، ص ۵۱۔

(د) جلد ۷ شمارہ ۳، جولائی اکتوبر ۱۹۵۶ء، ص ۳۱۔

یونیورسٹی شعبۂ فارسی کے صدر پروفیسر ڈاکٹر عبدالشکور احسن کے بقول:

"ان میں سے بعض الفاظ بہ ظاہر فارسی کے ہیں۔ یہاں تک کہ لفظ "خنجر" کے بارے میں تو رضا قلی ہدایت کو لکھنا بھی پڑا کہ "اگرچہ دراشعارِ پارسی بسی مشہور است اما عربیست و دشنہ پارسیِ آنست[1]" مگر ان سب کی اصل عربی ہے۔ بہر حال چند مستثنیات کے سوا کتاب کی زبان وہ ہے جسے میرزا غالب نے خالص فارسی سمجھا ہے اور جس کے لکھنے میں انھوں نے بڑی کاوش سے کام لیا ہے۔"

(مقدمہ: دستنبو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲۸ - ۲۹)

کاوش ہی سے کام نہیں لیا، اس پر بجا یا بے جا فخر بھی کیا ہے:

"دیوان کے دیکھنے نہ دیکھنے میں آپ کو اختیار ہے، مگر یہ چار جزو کا رسالہ (دستنبو) جو اب بھیجا ہے، اس کا دیکھنا ضرور درکار ہے۔ فارسیِ قدیم اور پھر حسنِ معنی اور صنعتِ الفاظ۔ بایں ہمہ ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ۔"

(بنام نواب محمد یوسف علی خاں، نومبر ۱۸۵۸ء)

اس عبارت کا خط کشیدہ ٹکڑا رُکنے پر مجبور کرتا ہے اور معنویت سے بھرپور ہے۔ "ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ" رکھا گیا، تب ہی یہ کتاب ۱۸۵۷ء کے تازہ عائد سخت پریس ایکٹ کی موجودگی میں حکام کے پیشگی ملاحظے کے بعد چھپ سکی اور صاحبانِ مطبع کو اس کا انطباع نامطبوع نہیں ہوا۔ انگریز حکام نے "بہ کمال خوشی" اس کے چھاپنے کی اجازت دی تو اسی بنا پر کہ اس کا طرزِ تحریر یک طرفہ، مدحیہ، تائیدی اور تحسینی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ "دستنبو" میں غالب بہ قولِ شخصے انگریز کی زبان سے بولے ہیں اور انھوں نے مصلحت کے قلم سے اُسے لکھا ہے۔

---

[1] فرہنگِ انجمن آرای ناصری، تہران، ۱۲۸۸ھ

کتاب کو بالقصد اور بالاعلان فارسی قدیم میں پیش کرنا بھی حکمت سے خالی نہیں تھا۔ یہ مصلحتوں کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے۔ اس روزنامچے کو دساتیر کی جناتی زبان میں لکھ کر غالب نے دُہرا فائدہ اٹھایا۔ پہلی بات تو کمالِ فن کا اظہار داشتہ بماراِعنی غالب نے "دستنبو" کو اپنے اس احساس کے منھ بولتے ثبوت کے طور پر پیش کیا کہ وہ فارسی کے علم میں یکتا و یگانہ ہیں اور خالص فارسی زبان پر جیسی قدرت اور دسترس انھیں حاصل ہے، آج اُس کی نظیر اور مثال، کیا ہند اور کیا پارس، کہیں نہیں۔

اس سلسلے کی دوسری بات یہ کہ غالب جس معاشرے کے فرد تھے، وہ پُرانے نظام کا حامی اور نئی عمل داری سے نفور تھا۔ جمیع اہلِ ہند، کیا ہندو کیا مسلمان، بہادر شاہ ظفر سے کسی نہ کسی درجے میں عقیدت اور محبت رکھتے تھے اور ان کے دل بادشاہ کی عزت اور عظمت سے یکسر خالی نہیں تھے۔ بہادر شاہ کی ذاتی اہلیت کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں، مگر اس میں شبہ نہیں کہ "اُس کی حیثیت ایک علامت اور ایک نشانی کی تھی۔ وہ خود بجھا ہوا سورج سہی، لیکن وہ ایک ایسی صبح کی شام تھا جس میں ہندوستان نے اپنے سیاسی وقار اور تمدنی عظمت کے نادر جلوے دیکھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ طاقتیں تک جو کچھ عرصے سے سلطنتِ مغلیہ کے مدِ مقابل آگئی تھیں، (۱۸۵۷ء) میں بہادر شاہ کے گرد جمع ہو گئیں[1]"۔

شاہ کے مقابلے میں فرنگیوں کے لیے ہندوستانیوں کے دل میں گو پہلے بھی کوئی جگہ نہیں تھی، لیکن ۱۸۵۷ء کی دار و گیر نے اُن کے لیے دلوں میں فاصلہ بہت ہی بڑھا دیا۔ انگریز حکام کی بے جواز تحسین و تائید میں کتاب لکھنے کا نتیجہ معاشرے میں انگشت نمائی کا باعث ہو سکتا تھا، اس سے بچنے کے لیے غالب نے یہ سرگذشت متعارف اور مروجہ فارسی میں لکھنے کے بجائے فارسیِ قدیم میں لکھی اور فارسی بھی وہ فارسیِ قدیم کہ جس کا ہندوستان کا تو کیا مذکور، پارس کے بلاد میں بھی نشان نہیں رہا تھا، تاکہ کتاب کے مندرجات بیش تر

---

[1] خلیق احمد نظامی، مقدمہ: ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ندوۃ المصنفین دہلی ۱۸۵۸ء صفحہ ۳۱۔

اہلِ ہند کے لیے سربستہ راز رہیں۔

مختصر یہ کہ اپنے عہد کی متعارفہ اور مُروّجہ فارسی کی جگہ، یہ عبارتِ فارسی ناآمیختہ بہ عربی میں یہ روداد لکھنے میں ایک حکمت تو یہ تھی کہ اس نادر و بے گانہ روشِ تحریر کو اپنے کمالِ فن کے طور پر پیش کرنا مقصود تھا اور دوسری مصلحت اُس میں یہ تھی کہ معاصر اہلِ ہند کے لیے کتاب قفلِ ابجد ہو کر رہ جائے۔ انگریز حکّام کو تو جو اس کتاب کے مناطب تھے، بہر نوع اپنے فارسی خواں عملے کے ذریعے اس قفل کو کھلوانا بھی تھا۔ غالب کی چال یہ تھی کہ کتاب اپنے ناآشنا طرزِ تحریر کی وجہ سے ہندوستانیوں کے لیے سربستہ راز رہے تاکہ وہ ان میں معصوم رہیں اور ہدفِ ملامت بننے سے محفوظ رہیں۔

غالب کو اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ ایک طرف انگریز حکّام نے اُن کے کمالِ فن کی داد دی، پنشن کی بحالی کی سفارش ہوئی، عالی مقام حکّام سے رہ و رسم مراسلت بدستور جاری ہو گئی، اُن کی خوشنودی اور سرپرستی حاصل ہو گئی قلعۂ معلّا سے تعلّق کی صفائی ہو گئی۔ غالب کی ہی مسموع ہوا، اک گونہ سکون ہوا۔ پنشن کا زرِ مجتمعہ سہ سالہ پائی پائی مل گیا۔ آئندہ کے لیے خرخشہ نہ رہا، پچھلا خلعت بحال ہو گیا اور دوسری طرف کتاب اہلِ ہند میں بالعموم نہیں سمجھی گئی۔ غالب کے ایک سے زیادہ خطوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "دستنبو" اچھے اچھوں کی سمجھ سے بالا رہی۔

غالب کا احساس یہ تھا کہ "دستنبو" کی عبارت کو محض درست پڑھنا بھی بڑی بات ہے یہ آسان نہیں، فہمِ عبارت تو بہت دور کی بات ہے اور ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے اور یہ طرزِ تحریر نادر نہ سہی، بے گانہ و ناآشنا ضرور ہے، اس لیے اہلِ علم و فضل بھی اس عبارت پر سے سَرسَری گزر سکتے ہیں:

> "مبالغہ اس کتاب کی تصحیح میں اس واسطے کرتا ہوں کہ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے۔ صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے، اگر غلط ہو جائے تو پھر وہ عبارت نری خرافات ہے۔" (بہ نام مرزا حاتم علی بیگ مہر، ستمبر ۱۸۵۸ء)

"یہ کتاب "دستنبو" جو مُرسل الیہ (لیفٹیننٹ گورنر صوبہ غرب و شمال) کے مطالعہ میں ہے، قسمت کی اچھی ہے یعنی خود ملاحظہ فرما رہے ہیں اور اگر کہیں پوچھنا ہوگا تو یقین ہے کہ آپ سے پوچھیں گے۔"

(خواجہ غلام غوث بے خبر، دسمبر ۱۸۵۸ء)

"جن کو اس (دستنبو) کے دیکھنے کا حکم ہوا ہے، وہ اہلِ علم و فضل میں سے ہیں، لیکن یہ طرزِ تحریر، میں نہیں کہتا کہ یہ نادر ہے، مگر بیگانہ ذرا آشنا ہے۔ خدا کرے کہ وہ جو اس کی سیر پر مامور ہیں، ان اوراق کو بہ مشورت آپ کے دیکھا کریں اور کہیں کہیں آپ سے پوچھ لیا کریں۔"

(خواجہ غلام غوث بے خبر دسمبر ۱۸۵۸ء)

کتاب چھپنے سے پہلے "آرام نے" دستنبو" کے بعض حصے غالباً ایلن براؤن کو سنائے تھے اور اس کا ذکر اپنے خط میں کیا[1]، اس پر غالب ۱۲ اگست ۱۸۵۸ء کے خط میں آرام سے پوچھتے ہیں کہ:

"یہ جو تم نے لکھا ہے کہ صاحب نے سُن کر اس کو پسند کیا۔ میں حیران ہوں کہ کون سا مقام تم نے پڑھا ہوگا۔ کیوں کر کہوں کہ صاحب اس عبارت کو سمجھے ہوں گے؟ اس کی جو حقیقت ہو مفصل لکھو۔"

اس کی تفصیل پہلے آچکی کہ اندور کے راے اُمید سنگھ کی دل چسپی اور مالی اعانت سے "دستنبو" کا ڈول ڈلا ــــــ مولانا غلام رسول مہر کے بقول[2] راے اُمید سنگھ نے دہلی کالج میں تعلیم پائی، پھر مہاراجہ ہلکر والیِ اندور کے اتالیق مقرر رہے۔ ہلکر

---

[1] مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلدِ اوّل، لاہور، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱۴۶۔

[2] ایضاً، صفحہ ۶۲۔

نے عنانِ حکومت سنبھالی تو اُمید سنگھ کو مشیر الدولہ کا خطاب دیا۔" رائے صاحب کے آگرہ پہنچنے کی اطلاع دیتے ہوئے، غالب نے تفتہ کو ہدایت کی تھی کہ:

"رائے صاحب مکرم و معظم رائے اُمید سنگھ بہادر کے پاس حاضر ہونا، اور جب تک وہاں (آگرہ میں) رہیں، تب تک حاضر ہوا کرنا اور "دستنبو" کے باب میں جو اُن کا حکم ہو، بجالانا، ان کو پڑھا بھی دینا۔"

(۲۸ اگست ۱۸۵۸ء)

چار روز بعد کے ایک خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں کہ:

"جانتا ہوں کہ تم رائے امید سنگھ سے بھی نہ ملے ہوں گے۔ عیاذاً باللہ! میں اُن سے شرمندہ رہا کہ میں نے کہا تھا کہ ہاں مرزا تفتہ "دستنبو" کو اچھی طرح پڑھا دیں گے۔" (یکم ستمبر ۱۸۵۸ء)

مشیر الدولہ رائے امید سنگھ نہ صرف یہ کہ دہلی کالج کے فارغ التحصیل تھے، بلکہ والیِ اندور کے اتالیق بھی تھے لیکن "دستنبو" کی عبارت فہمی غالب کے نزدیک اُن تک کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ "دستنبو" رائے صاحب کو باقاعدہ پڑھائی جائے۔

غالب نے تفتہ، مہر، آرام، حقیر اور ان کے صاحب زادے منشی عبداللطیف پر مشتمل ایک "کونسل"[1] تشکیل دے دی تھی جو آگرے میں کتاب کی طباعت و اشاعت کتابت، تصحیح، تصحیف، تزئین اور تجلید کے لیے سرگرم عمل تھی۔ ترتیب و کتابت اور اشاعت و طباعت کی ساری جزئیات ان اصحاب کے باہم مشورے سے طے پاتی تھیں۔ ایک ایسی شہادت موجود ہے کہ یہ "کونسل" جو غالب کے بعد کتاب سے سب سے زیادہ متعلق تھی، کتاب کی "حقیقت" جاننے سے معذور رہی۔ کتاب کے سرورق کی عبارت آگرے میں تجویز ہوئی۔ اس کا مسودہ آرام نے غالب کے ملاحظے اور مشورے کے لیے بھیجا، جس

---

[1] خطوطِ غالب، ایضاً، صفحہ ۷۰، ۷۶، ۱۹۲، ۱۹۵ وغیرہ وغیرہ۔

ہیں کتاب کو انگریزوں کی فتح کے مفصّل حالات کی حامل ظاہر کیا گیا تھا۔ غالبؔ نے اسے خلافِ مضمونِ کتاب قرار دیتے ہوئے لکھا کہ :

"آخر ..... کی ..... سطریں از روئے مضمون سراسر کتاب کے خلاف ہیں۔ میں نے سرکار کی فتح کا حال نہیں لکھا، صرف اپنی پناہ در دیبینے کی سرگزشت لکھی ہے، تقریباً شہر و سپاہ کا بھی ذکر آگیا ہے اور وہ اپنی سرگزشت جو میں نے لکھی ہے؛ سو ابتدا ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک لکھی ہے شہر ستمبر میں فتح ہوا؛ اس کا بیان بھی ضمناً آگیا۔ خوب ہوا کہ تم نے مجھ سے پوچھا؛ ورنہ بڑی قباحت ہوتی۔ اب میں جس طرح سے کہوں سو کرو ..... میں دوسرے صفحے پر ساتوں سطریں لکھ دیتا ہوں اس کو ملاحظہ کرو اور میرا کہنا مانو، ورنہ کتاب کی حقیقت غلط ہو جائے گی اور مطبع پر بات آئے گی۔"

(بہ نام شیو نرائن آرام، اواخر اکتوبر ۱۸۵۸ء)

غالبؔ دلّی میں تھے اور کتاب آگرے میں چھپ رہی تھی۔ نظراور شہر سے دور، آگرے میں کتاب چھپنے کا باعث یہ تھا کہ دلّی میں اُن دنوں نہ طباعت و کتابت کا انتظام تسلّی بخش رہا تھا اور نہ صحّافی و نقّاشی کا :

"یہاں کوئی مطبع نہیں ہے۔ سُنتا ہوں ایک ہے، اُس میں کاپی نگار خوش نویس نہیں ہے۔ اگر آگرے میں اس کا چھاپا ہو سکے تو مجھ کو اطلاع کر دو۔" (بہ نام تفتہ، ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء)

"میرزا تم بڑے بے درد ہو، دلّی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا، بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں نیچہ بند تو میسّر نہیں، صحّاف اور نقّاش کہاں؟ شہر آباد ہوتا تو میں آپ کو کیوں تکلیف دیتا؟ یہیں سب درستی میری آنکھوں کے سامنے ہو جاتی۔"

(بہ نام تفتہ، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء ہنگام نیم روز)

کتاب اپنی نظر اور اپنے شہر سے دور چھپ رہی تھی، ایک قباحت ـــــــ پھر یہ کہ بہ وجوہ غالب کتاب کی خوبصورت، صحیح اور جلد تر اشاعت کے متمنی تھے اس ضمن میں "روز" ہی انھیں کوئی نہ کوئی فکر لاحق ہو جاتی تھی اور کسی نہ کسی تجویز، وضاحت اور ہدایت یا استفسار کی ضرورت پیش آجاتی تھی۔ ۲۲ ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب، حقیر کو لکھتے ہیں:

"یہ ہم تم اور میرزا تفتہ میں مراسلت، گویا مکالمت ہو گئی ہے، روز باتیں کرتے ہیں۔ اللہ اللہ! یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ خط سے خط لکھے گئے ہیں۔ مجھ کو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا تو لفافے بناؤں گا۔ غنیمت ہے کہ محصول آدھ آنہ ہے، ورنہ باتیں کرنے کا مزا معلوم ہو جاتا!"

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا، غالب نے آگرے میں جہاں کتاب زیر طبع تھی، میرزا ہرگوپال تفتہ، مرزا حاتم علی بیگ مہر، منشی شیو نرائن آرام، منشی نبی بخش حقیر اور ان کے صاحب زادے منشی عبد اللطیف پر مشتمل ایک "کونسل" قائم کر دی تھی۔ ایک سرسری اندازے کے مطابق "دستنبو" کی تجویز (جولائی ۱۸۵۸ء) سے اس کی اشاعت (نومبر ۱۸۵۸ء) تک کی تہائی سال کی مدت میں غالب نے "کونسل" کو چالیس پینتالیس خط لکھے۔ لکھے یقیناً اس سے بہت زیادہ، لیکن محفوظ اتنے ہی رہ سکے۔

اس مراسلتِ ہر روزہ نے وہ مواد فراہم کر دیا جس نے آگے چل کر "عودِ ہندی" اور پھر "اُردوئے معلیٰ" کی خشتِ اوّل کا کام کیا۔ تھوڑی سی مدت میں ایک جگہ، ایک حلقے میں غالب کے بہت سے خط جمع ہو گئے۔ غالب کا جی کتاب کی اشاعت میں گڑا ہوا تھا، اس لیے اشاعتِ کتاب کے سلسلے کے یہ خط بڑے پُر زور ہیں اور کھلے دل سے لکھے گئے ہیں۔ مکتوب الیہم کے حق میں جو نسبتاً گم نام اصحاب تھے، غالب کی یہ تحریریں سرٹیفکیٹ کا درجہ رکھتی تھیں، انھوں نے اسے اپنی بڑی پونجی خیال کیا۔ انھیں احتیاط سے رکھا اور اس کی اشاعت کی طرف دھیان دیا۔ ان کی اشاعت میں مکتوب الیہم کو اپنی شہرت کا پہلو

بھی دکھائی دیا ہو تو عجب نہیں ۔ اس طرح کچھ ان خطوں کا حسن ذاتی اور کچھ اپنے کو نامور بنانے کی شخصی اور فطری کمزوری اس خیال کا باعث ہوئی کہ انھیں چھاپا جائے چنانچہ جب نومبر ۱۸۵۸ء کے پہلے ہفتے میں آرام "دستنبو" کی طباعت سے فارغ ہوئے ۔ تو انھوں نے خطوطِ غالب چھاپنے کی فکر کی ۔ غالب کے لیے یہ تشہیر تھی اور زائد بات تھی ، انھوں نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے بڑے واضح لفظوں میں شیو نرائن آرام کو لکھا کہ :

"اُردو کے خطوط جو آپ چھاپنا چاہتے ہیں ، یہ بھی زائد بات ہے ۔ کوئی رُقعہ ایسا ہوگا کہ میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہو گا ورنہ صرف تحریر سرسری ہے ۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے ۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں ۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا میرے خلافِ طبع ہے ۔"

یہ ۱۸ر نومبر ۱۸۵۸ء کا خط ہے ۔ اُردو خطوں کی اشاعت کی اس تجویز میں منشی ہرگوپال تفتہ بھی شیو نرائن کے شریک تھے اور بضد تھے کہ خط ضرور چھاپے جائیں ۔ ۲۰ر نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب نے تفتہ کو لکھا کہ :

"رُقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے ۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو اور اگر تمھاری خوشی اسی میں ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو تم کو اختیار ہے ۔ یہ امر میرے خلافِ رائے ہے ۔"

اسی روز یعنی ۲۰ر نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک دوسرے خط میں غالب نے اپنے پچھلے خط کے حوالے سے شیو نرائن کو لکھا کہ :

"رقعوں کے چھاپنے کے باب میں ممانعت لکھ چکا ہوں ۔ البتہ اس باب میں میری رائے پر تم کو اور میرزا تفتہ کو عمل کرنا ضرور ہے ۔"

آرام اور تفتہ کی یہ تحریک و تجویز جسے ۱۸۵۸ء میں زائد بات کہہ کر جھٹک دیا گیا تھا ، ٹھیک دس برس بعد ۱۸۶۸ء میں "عودِ ہندی" کے نام سے حقیقت بن کر

اُبھری اور اس کی خوشبو چار دانگ عالم میں پھیل گئی۔ "عودِ ہندی" بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی اور اس کے بعد غالب کے اُردو مکاتیب کی جمع و ترتیب کے کام کا ایک تار بندھ گیا، جس کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں عہدِ موجودہ تک چلا آتا ہے، لیکن جب بھی اس سلسلے کے آغاز کی جستجو کی جائے گی، بات "دستنبو" تک پہنچے گی۔ "دستنبو" کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

منشی شیو نرائن کتاب باہتمام چھاپ تو رہے تھے، لیکن کم و بیش ہر طابع کی طرح انھیں یہ فکر بھی رہی ہو تو کچھ عجب نہیں کہ کتاب پڑی ہی نہ رہ جائے۔ تفتہ نے اس طرف توجہ دلائی یا خود غالب کا دھیان اس طرف گیا۔ صورت خواہ کچھ بھی رہی ہو، ۱۶ر ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں تفتہ سے پوچھتے ہیں:

"ہمارے منشی شیو نرائن صاحب اپنے مطبع کے اخبار میں اس کتاب کے چھاپے کا اشتہار کیوں نہیں چھاپتے تاکہ درخواستیں خریداروں کی فراہم ہو جائیں۔"

اشتہار اور اس کے مضمون کی طرف اشارہ شیو نرائن کے ایک خط مرقومہ اکتوبر ۱۸۵۸ء میں بھی ملتا ہے:

"دستنبو" کے آغاز (سرورق) کی عبارت از روئے احتیاط دوبارہ ارسال کی ہے۔ یقین ہے کہ پہنچ گئی ہوگی اور چھاپی گئی ہوگی اور آپ نے اسی عبارت سے اشتہار بھی اخبار میں چھاپا ہوگا یا چھاپیے گا۔"

غالب کے خطوں میں ایسا کوئی حوالہ میری نظر سے نہیں گزرا کہ کتاب کا یہ مجوّزہ اشتہار مطبعِ مفیدِ خلائق آگرہ کے اخبار میں چھپا یا نہیں، لیکن کتاب کے چھپ چکنے کے بعد غالب کے ایک خط بہ نام شیو نرائن کا یہ جملہ صورتِ حال کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے:

"یہ صاحب لوگ اطراف و جوانب سے مجھ پر فرمائشیں بھیجتے ہیں، تم سے بہ قیمت کوئی نہیں منگواتا۔" (۴ر جنوری ۱۸۵۹ء)

غالب کے ایک خط سے "دستنبو" کی نکاسی کے بارے میں کتاب کے طابع

شیو نرائن کی ایک تجویز ہویدا ہے (جو ضروری نہیں کہ بر بنائے تشویش ہی ہو) کہ غالب ہنری اسٹورٹ ریڈ سے جو صوبۂ غرب و شمال میں محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے، "دستنبو" کی خریداری کی تحریک کریں۔ غالب نے جواباً لکھا کہ ریڈ صاحب نے مجھ سے اُردو میں کتاب مرتب کرنے کی فرمایش کر رکھی ہے وہ پوری ہو تو "دستنبو" کی خریداری کے لیے لکھوں۔ غالب کے خطوں کے الفاظ یہ ہیں:

"جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب کو ابھی میں خط نہیں لکھ سکتا۔ ان کی فرمایش ہے اُردو کی نثر، وہ انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں۔"

(بہ نام شیو نرائن ۱۱ر دسمبر ۱۸۵۸ء)

"ریڈ صاحب کے باب میں میں نے یہ لکھا تھا کہ جب اُردو کی نثر ان کے واسطے لکھ لوں گا تو "دستنبو" کی خریداری کی خواہش کروں گا۔"

(بہ نام شیو نرائن ۱۵ر دسمبر ۱۸۵۸ء)

یہاں "خریداری کی خواہش" سے مراد ہے کہ ہنری اسٹورٹ ریڈ اپنے محکمے یعنی مدارس وغیرہ کے لیے "دستنبو" کی کچھ جلدوں کی اکٹھی خریداری کا انتظام کر دیں، نہ یہ کہ وہ "اپنے لیے" ایک نسخہ خریدیں؛ اُن کے ذاتی ملاحظے کے لیے تو شیو نرائن اور غالب دونوں الگ الگ "دستنبو" کا ایک ایک نسخہ ہدیہ کر چکے تھے:

"ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب ممالکِ مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے صاحب تھے۔ امن کے دنوں میں ایک ملاقات میری اُن کی ہوئی تھی۔ میں نے اب ایک کتاب سادے جلد ان کو بھیجی تھی۔ کل اُن کا خط مجھ کو اس کتاب کی رسید میں آیا۔ بہت تعریف لکھتے تھے۔ اور ہاں بھئی ایک تماشا اور ہے۔ مجھ کو لکھتے تھے کہ یہ "دستنبو" پہلے اس سے کہ تم بھیجو، مطبع مفیدِ خلائق نے ہمارے پاس

بھیجی ہے اور ہم اس کو دیکھ رہے اور خوش ہو رہے تھے کہ تمھارا خط مع کتاب کے پہنچا۔"
(بہ نام تفتہ ۲۷ نومبر ۱۸۵۸ء)

ظاہر ہے شیو نرائن کہ "دستنبو" کے ناشر تھے، جائز طور پر اس بات کی فکر میں تھے کہ کتاب پڑی نہ رہ جائے، جلد نکل جائے۔ غالب نے ۱۱ دسمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں انھیں لکھا کہ:

"ایک قرینے سے مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ شاید گورنمنٹ سو دو سو "دستنبو" کی خریداری کرے گی اور ان نسخوں کو ولایت بھیجے گی۔ کیا بعید ہے کہ ہفتے دو ہفتے میں الٰہ آباد سے تمھارے پاس حکم پہنچے۔"

شیو نرائن کو "قرینے" کی جستجو ہوئی جو قدرتی بات تھی لیکن غالب سے بات بنائے نہیں بنی:

"میاں! کیا قرینہ بتاؤں گورنمنٹ کی خریداری کا؟ ایک بات ایسی ہے کہ ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ خدا کرے اس کا ظہور ہو جائے۔ ابھی مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔"
(مرقومہ ۱۸ دسمبر ۱۸۵۸ء)

کوئی بات اگر "واقعی" تھی بھی تو اس کا "ظہور" بہرحال نہیں ہوا، اس لیے کہ شیو نرائن کے نام غالب کا ایک خط مرقومہ ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء اس بات کا مظہر ہے کہ کتاب کا اڈیشن اپریل ۱۸۵۹ء میں سب کا سب نکل گیا اور اس میں غالب کی کسی کوشش کو دخل نہیں تھا:

"کتب "دستنبو" کے بک جانے سے میں خوش ہوا۔ خدا کرے جس کسی کو دی ہو، دو تین غلطیاں جو معلوم ہیں، وہ بنا دی ہوں۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ صاحب لوگوں نے خریدیں یا ہندوستانیوں نے لیں؟ تم مجھ کو یہ بات ضرور ضرور لکھو۔ میں ایسا جانتا ہوں کہ یا تو صاحبانِ انگریز کی خریداری آئی ہوگی، یا پنجاب کے ملک کو یہ کتابیں گئی ہوں گی، پورب میں کم بکی ہوں گی۔"

غالب کا قیاس صحیح نکلا۔ ۲۲ اپریل ۱۸۵۹ء کے خط میں آرام کو لکھتے ہیں:

"دستنبو کی خریداری کا حال معلوم ہو گیا۔ میرا بھی یہی گمان تھا کہ لاہور کے ضلع میں گئی ہوں گی۔"

کتاب کا اڈیشن ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء سے پہلے نکل گیا تھا لیکن پھر اس کا ایک نسخہ ولایت بھیجنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ آرام، آگرہ سے دہلی آ رہے تھے، چنانچہ ۲۲ جولائی ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں غالب نے انھیں لکھا کہ:

"اگر دستنبو باقی ہوں تو دو اپنے ساتھ لے آنا۔"

آرام کے نام ۱۷ اگست ۱۸۵۹ء، ۲۰ اکتوبر ۱۸۵۹ء اور ۲۷ اکتوبر ۱۸۵۹ء کے خطوں میں بھی کتاب "دستنبو" اور ولایت کے لیے انگریزی عرضی کا ذکر آیا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اُس وقت تک غالب کو فراہم نہیں ہوئی تھیں اور اگلے برس غالباً وسطِ جنوری تک یہ کہیں اُنھیں مل سکیں، اس لیے کہ ۲ مارچ ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں جو غالب نے رام پور کے دورانِ قیام میں آرام کو لکھا ہے، کتاب اور عرضی کا ذکر ان لفظوں میں آیا ہے:

"کتاب اور عرضی اواسطِ ماہِ جنوری میں ولایت کو روانہ کر کے یہاں آیا ہوں۔"

اپریل ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں رام پور سے دہلی لوٹ آنے کے بعد آرام کو لکھا گیا ہے، غالب کہتے ہیں:

"۱۹ یا ۲۰ جنوری ۱۸۶۰ء کو کتاب اور دونوں عرضیاں ولایت کو روانہ کر کے رام پور گیا ہوں۔"

گویا ولایت بھیجنے کے لیے "دستنبو" کے ایک نسخے کی فراہمی کی جو فرمایش غالب نے جولائی ۱۸۵۹ء میں کی تھی، آرام اُسے چھے ماہ کے بعد پورا کر سکے۔ تاخیر بہ ظاہر اسی بنا پر واقع ہوئی ہو گی کہ کتاب آرام کو تلاشِ بسیار کے باوجود، اس درمیان میں نہ مل سکی ہو گی۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ "دستنبو" کا پہلا اڈیشن جو نومبر ۱۸۵۸ء میں چھپا

اشاعت کے قریب آٹھ نو ماہ کے اندر اندر سب کا سب نکل گیا تھا اور اسی زمانے میں اس کا ہاتھ آنا آسان نہیں رہا تھا۔

○

"دستنبو" میں غالب نے انگریزوں کی چیرہ دستیوں کے لیے عذر وضع کیے ہیں اور ان مظالم کے لیے جواز پیدا کر کے انھیں بے اثر اور پردہ پوش کرنے کی کوشش کی ہے:

"غضب ناک شیروں (انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے ہی بے سر و سامان لوگوں کو قتل کرنا اور مکانوں کو جلانا جائز سمجھا۔ ہاں جس مقام کو لڑ کر فتح کرتے ہیں، لوگوں پر ایسی ہی سختیاں کی جاتی ہیں۔"

"یہ جو گھر بار اور جان و مال محفوظ رہنے کی ذمہ داری نہیں لی گئی ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بے گناہوں اور گناہ گاروں میں امتیاز رہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ اس یلغار میں حکم یہ ہے کہ جو شخص اظہارِ اطاعت کرے اُس کو قتل نہ کیا جائے، مال چھین لیا جائے اور جو شخص مقابلہ کرے، مال کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی بھی چھین لی جائے۔ مقتولین کے متعلق یہ خیال ہے کہ انھوں نے یقیناً اطاعت نہیں کی، اسی وجہ سے اُن کو قتل کر دیا گیا۔"

غالب نے ایک طرف تو انگریزوں کی سختیوں کو امرِ معمولی قرار دیا ہے، دوسری طرف ان کے لیے سپر فراہم کرنے اور پناہ گاہیں تراشنے میں بھی مستعدی دکھائی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ غالب نے انگریز سپاہیوں کے مظالم کو کم کر کے پیش کیا ہے، اور ان کی معقولیت اور امن پسندی کے گن گائے ہیں:

"........انگریز بے گناہوں کو قتل نہیں کرتے ہیں۔"

"(انگریز سپاہی) عموماً سامان لوٹ لیتے ہیں، قتل نہیں کرتے بہت کم ایسا ہوا ہے اور وہ بھی صرف دو تین کوچوں میں کہ پہلے قتل کر دیا، پھر سامان لوٹ لیا۔ (البتہ) بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کا قتل روا نہیں رکھا ہے۔"

"انگریزوں کو دیکھو کر جب دشمن کا (بدلہ لینے) کے لیے لڑنے اُٹھے، اور گناہ گاروں کو سزا دینے کے لیے لشکر آراستہ کیا، چوں کہ (وہ) شہر والوں سے بھی برہم تھے تو موقع تو اس کا تھا کہ شہر پر قابض ہونے کے بعد کتے بلی (تک کو) زندہ نہ چھوڑتے، (لیکن انھوں نے) ضبط کیا (اگرچہ) اُن کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی، عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔"

غالب کے یہ بیانات صریحاً انگریزوں کی تائید میں ہیں، لیکن خود غیر جانب دار انگریز مورخین کی شہادتیں اس کے برعکس ہیں۔ دلی کے شہریوں پر انگریز سپاہیوں کے جاں سوز مظالم کے بارے میں لارڈ الفنسٹن، سر جان لارنس کو لکھتے ہیں کہ:

"(دہلی کے) محاصرے کے ختم ہونے کے بعد سے ہماری فوج نے جو ظلم کیے ہیں، انھیں سُن کر دل پھٹنے لگتا ہے۔ بغیر دوست یا دشمن میں تمیز کیے، یہ لوگ سب سے یک ساں بدلا لے رہے ہیں۔ لوٹ میں تو حقیقت میں ہم نادر شاہ سے بھی بڑھ گئے۔"

[Life of Lord lawrence, by: Basworth Smith, vol. 11 P. 262]

پنڈت سندر لال کا بیان ہے کہ:

"محاصرے کے دنوں میں قلعے کے چھتے میں بیمار اور زخمی سپاہیوں کا ایک اسپتال تھا۔ کمپنی کی فوج جس وقت قلعے کے اندر گھسی، جتنے زخمی اور بیمار اسپتال کے اندر دکھائی دیے، اُن سب کو، اُن سب نے اپنی گولیوں سے ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیا۔ اسی طرح اور بھی کئی جگہ جہاں زخمی اور بیمار پائے گئے، قتل کر دیے گئے۔"

(سن ستاون، ص ۱۶۲، بحوالہ: تاریخ ہند، منشی ذکاء اللہ خاں، ص ۶۴۶)

اہلِ دہلی کے قتلِ عام کے بارے میں مانٹ گمری مارٹن لکھتا ہے کہ:

"جس وقت ہماری فوج شہر میں داخل ہوئی تو جتنے شہری، شہر کی دیواروں کے اندر پائے گئے۔ انھیں اُسی جگہ سنگینوں سے مار ڈالا گیا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اُن کی تعداد کتنی زیادہ رہی ہوگی۔ جب میں آپ کو یہ بتاؤں کہ ایک ایک مکان میں چالیس چالیس اور پچاس پچاس آدمی چھپے ہوئے تھے یہ لوگ بلوائی نہ تھے۔ بلکہ شہر کے باشندے تھے، جنھیں ہماری مشہور نرم دلی اور معافی پر بھروسا تھا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ انھیں مایوسی ہوئی۔"

[Letter in the Bombay Telegraph, by: Montgomery Martin]

ایک دُوسرا انگریز مؤرّخ لکھتا ہے کہ:

"دلّی کے باشندوں کے قتلِ عام کا کھلا اعلان کر دیا گیا، حالانکہ ہم جانتے تھے کہ اُن میں سے بہت سے ہماری فتح چاہتے ہیں۔"

[The Chaplain's Narrative of the Seige of Delhi, quoted by: Kaye]

اس خوفناک قتل عام کے دنوں میں صرف ایک دن کے منظر کو بیان کرتے ہوئے لارڈ رابرٹس لکھتا ہے کہ:

"ہم صبح کو لاہوری دروازے سے چاندنی چوک گئے تو ہمیں شہر حقیقت میں

مُردوں کا شہر نظر آتا تھا۔ کوئی آواز سوائے ہمارے گھوڑوں کے سُنائی
نہیں دیتی تھی۔ کوئی زندہ آدمی نظر نہیں آیا۔ سب طرف مُردوں کا بچھونا
بچھا ہُوا تھا۔ جن میں سے کچھ مرنے سے پہلے پڑے سسک رہے تھے۔"
"چلتے ہُوئے بہت دھیرے دھیرے بات کرتے تھے، اس ڈر سے کہ کہیں
ہماری آواز سے مُردے نہ چونک پڑیں۔ ایک طرف مُردوں کی لاشوں
کو کُتّے کھا رہے تھے اور دوسری طرف لاشوں کے آس پاس گدھ جمع تھے
جو ان لاشوں کو نوچ نوچ کر مزے سے کھا رہے تھے اور ہمارے چلنے کی
آواز سے اُڑ اُڑ کر تھوڑی دور جا بیٹھتے تھے۔"
"خلاصہ یہ کہ ان مُردوں کی حالت بیان نہیں ہو سکتی۔ جس طرح ہمیں
ان کے دیکھنے سے ڈر لگتا تھا، اسی طرح ہمارے گھوڑے انھیں دیکھ کر ڈر
سے بدکتے اور ہنہناتے تھے۔ لاشیں پڑی سڑتی تھیں، اُن کے سڑنے سے
ہوا میں بیمار کرنے والی بدبو پھیل رہی تھی۔"

[Forty Years in India, by: Lord Roberts]

ان میں سے بہت سے لوگوں کو طرح طرح کی تکلیفیں دے دے کر مارا گیا۔
لیفٹیننٹ ماجنڈی نے اپنی آنکھوں دیکھا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ سکھوں اور گوروں
نے مل کر ایک زخمی آدمی کے چہرے کو پہلے اپنی سنگینوں سے بار بار بیندھا اور پھر دھیمی
آنچ کے اُوپر اُسے زندہ بھون دیا:

"اُس کا گوشت چٹخا، لپٹوں میں کالا ہو گیا اور جلتے گوشت کی سڑی بدبو
نے اوپر اُٹھ کر ہوا کو زہریلا بنا دیا۔"

[Up Among the Pandies, by: Lieut. Majendie, P. 187]

ٹائمز اخبار کے نامہ نگار سر ولیم رسل نے لکھا ہے کہ:

"میں نے اس شخص کی جلی ہُوئی ہڈیاں کئی دن بعد میدان میں پڑی ہُوئی دیکھیں۔"

[My Diary in India in the year 1858-59, Vol. 1, P. 301-302]

گا بریٹ تامسن نے سر ہنری کاٹن سے کہا تھا کہ دلّی میں کچھ مسلمانوں کو ننگا کرکے زمین سے باندھ کر، سر سے پانو تک جلتے ہوئے تانبے کے ٹکڑوں سے اچھی طرح داغ دیا گیا تھا۔

[Indian and Home Memories, by: Sir Henry Cotton, P. 143]

ان لوگوں کو مارنے سے پہلے کبھی کبھی بے دین کرنے کے لیے بھی کوشش کی جاتی تھی ایک انگریز پادری کی بیوہ نے لکھا ہے کہ :

"بہت سے لوگوں کو پکڑ کر پہلے ان سے سنگینوں کے بل گرجا میں جھاڑو دلوائی گئی اور پھر سب کو پھانسی دے دی گئی "۔

[A lady's Escape from Gwalior, P. 243]

رسل لکھتا ہے کہ کبھی کبھی :

"مسلمانوں کو مارنے سے پہلے انھیں سور کی کھالوں میں سی دیا جاتا تھا، اُن پر سور کی چربی مل جاتی تھی۔ اور پھر اُن کے جسم جلا دیے جاتے تھے، اور ہندوؤں کو زبردستی دھرم سے گرایا جاتا تھا"۔

[Russel's Diary, vol. II, P 43]

پنڈت سُندر لال نے ٹھیک کہا ہے کہ"ان دردناک واقعات کے بارے میں زیادہ مثالیں دینا بہت تکلیف دہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار ساری دلّی خالی اور ویران ہو گئی بلکہ اُن اِنے گنے گھرانوں کو چھوڑ کر جن سے کمپنی کی فوج کو مدد مل رہی تھی باقی سب شہریوں کو جو قتل یا پھانسی سے بچ سکے، زبردستی شہر سے باہر نکال دیا گیا۔[1]

مورّخ ہومس لکھتا ہے :

"دلّی کے باشندوں نے باغیوں کے جرموں کا کئی گنا کفارہ ادا کر ڈالا دسوں ہزار مرد، عورت اور بچے بغیر گھر بار کے اِدھر اُدھر کے علاقے میں گھوم رہے تھے، جنھوں نے کوئی خطا نہیں کی تھی۔ اپنا جو کچھ مال اسباب وہ

---

[1] سنہ ستاون، انجمن ترقی اُردو ہند، علی گڑھ، دسمبر ۱۹۵۷ء، ص ۱۴۴۔

شہر میں پیچھے چھوڑ گئے تھے، اُس سے وہ ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو چکے تھے، کیونکہ سپاہیوں نے گلی گلی اور گھر گھر جا کر ہر قیمتی چیز کو ڈھونڈ کر نکال لیا تھا اور جو کچھ سامان وہ اُٹھا کر نہ لے جا سکے، اسے انھوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔"

[A History of the Indian Mutiny, by: Holmes, P 386]

سر جان لارنس نے، انگریزی کمانڈر کے نام دسمبر ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں اعتراف کیا ہے کہ:

"مجھے یقین ہے کہ ہم نے جس طریقے سے بلا امتیاز تمام طبقوں کو لوٹا ہے، اس کے لیے ہم پر ہمیشہ لعنت بھیجی جائے گی اور یہ فعل حق بہ جانب ہوگا۔"

[Life of Lord Lawrence, by: Bosworth Smith, vol. II P. 158]

خود انگریزوں کے ان اعترافات کے بعد، غالب کے اُن بیاناتِ صفائی کی کیا وقعت رہ جاتی ہے جو "دستنبو" میں انھوں نے انگریزوں کے ضبط و تحمل کے ذیل میں دیے ہیں۔ غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ انگریزوں نے:

"بوڑھوں، عورتوں اور بچّوں کا قتل روا نہیں رکھا۔"

"...... عورتوں اور بچّوں کو ذرا نہیں ستایا۔"

انگریز مورّخین ہی کی شہادتوں سے غالب کے اس بیان کی جو صریحاً انگریزوں کی مدافعت میں ہے تردید ہو جاتی ہے: "انگریز فوج کے سپاہی جہاں گھستے، جتنے آدمی انھیں راستے میں ملتے، انھیں وہ بغیر کسی امتیاز کے تلوار کے گھاٹ اُتار دیتے تھے یا گولی سے اُڑا دیتے تھے۔ جگہ جگہ پر پھانسی کے تختے کھڑے کیے گئے۔ جن پر چوبیس چوبیس گھنٹے برابر کام جاری رہتا تھا۔ جب ان سے بھی کام نہ چلا تو انگریز افسروں نے درختوں کی شاخوں سے پھانسی کا کام لینا شروع کیا۔"

[Narrative of the Indian Revolt, P. 69]

کے اور مالسن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ جو لوگ پھانسی پر لٹکائے جاتے تھے،

اُن کے ہاتھوں اور پیروں کو تفریح کے لیے انگریزی کے آٹھ اور نو (8 اور 9) ہندسوں کی شکل میں باندھ دیا جاتا تھا۔ جب یہ ترکیبیں بھی کافی نہ دکھائی دیں تو انگریز افسروں نے گاؤں کے گاؤں جلانے شروع کر دیے۔ گاؤں کے باہر توپیں لگا دی جاتی تھیں اور سب مردوں عورتوں اور بچوں اور جانوروں سمیت گاؤں کو آگ لگا دی جاتی تھی۔ کئی انگریز افسروں نے بڑے فخر کے ساتھ ان دردناک نظاروں کو اپنے خطوط میں بیان کیا ہے۔ آگ اتنی ہوشیاری سے لگائی جاتی تھی کہ ایک بھی گاؤں والا نہ بچ سکے۔

[Kaye and Malleson's History of the Indian Mutiny,
Vol. II, P 177]

چارلس بال لکھتا ہے کہ:

"مائیں اپنے دودھ پیتے بچوں سمیت اور بے شمار بوڑھے مرد اور عورتیں جو اپنی جگہ سے ہل نہ سکتے تھے، جھونپڑوں کے اندر جلا کر خاک کر دیے گئے۔"

[Charless Ball's
History of the Indian Mutiny, Vol. 1, P. 243-244]

ایک انگریز اپنے خط میں لکھتا ہے کہ:

"ہم نے ایک بڑے گاؤں کو آگ لگائی جس میں لوگ بھرے ہوئے تھے۔ ہم نے انھیں گھیر لیا اور جب وہ آگ کی لپٹوں میں سے نکل کر بھاگنے لگے تو ہم نے انھیں گولیوں سے اڑا دیا۔"

'Charless Ball's History of the Indian Mutiny,
Vol. 1, P. 243-244]

مؤرخ سرجان کے لکھتا ہے کہ:

"فوجی اور سول دونوں طرح کے انگریز افسر اپنی اپنی خونی عدالتیں لگا رہے تھے یا بغیر کسی طرح کے مقدمے کا ڈھونگ رچائے اور بغیر مرد، عورت یا چھوٹے بڑے کا خیال کیے ہندوستانیوں کا قتلِ عام کر رہے

تھے۔ ہندوستان کے گورنر جنرل نے جو خط انگلستان بھیجے، اُن میں ہماری برٹش پارلیمنٹ کے کاغذوں میں یہ بات درج ہے کہ بوڑھی عورتوں اور بچوں کو اُسی طرح سے ذبح کیا گیا جس طرح ان لوگوں کو جو بغاوت میں شامل تھے۔ انگریزوں کو فخر کے ساتھ یہ کہتے ہوئے، یا خطوط میں لکھتے ہوئے بھی جھجک نہ محسوس ہوئی کہ ہم نے ایک بھی ہندوستانی کو نہیں چھوڑا۔ اور کالے ہندوستانیوں کو گولیوں سے اُڑانے میں ہمیں بڑا لطف آتا تھا اور حیرت انگیز خوشی ہوتی تھی۔ ہندوستانیوں کی تاریخی کتابوں میں یا اگر کتابیں نہ ہوں تو اُن کی کہانیوں اور بیانوں میں ہمارے قوم کے خلاف یہ یادگار رہے گی کہ ہندوستان کی مائیں بیویاں اور بچے جن کے نام سے ہم اتنی اچھی طرح واقف نہیں ہیں، انگریزوں کے انتقام کی پہلی باڑھ میں بے رحمی کے ساتھ شکار ہوئے۔"

[Kaye's History of the Sepoy War, vol. II, P.]

خود گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے ۲۴ دسمبر ۱۸۵۷ء کو اپنی کونسل کے اندر کہا تھا:

"نہ صرف چھوٹے بڑے ہر طرح کے مجرم ہی بلکہ وہ لوگ بھی جن کا قصور کم سے کم بہت ہی مشکوک تھا، بغیر کسی تمیز کے پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔ گاؤں کو عام طور پر جلا ڈالا گیا اور لوٹ لیا گیا۔ اسی طرح قصور وار اور بے قصور مرد اور عورت بچے اور بوڑھے، سب کو بلا کسی تمیز کے سزا دی گئی۔"

(بحوالہ سنہ ستاون، ص ۲۵۰)

غالب نے انگریزوں کے مظالم اور ان کی بے رحمی اور سفاکی کا تاثر ہلکا کرنے کی ایک صورت یہ بھی نکالی کہ "باغی" سپاہیوں کے طرزِ عمل کو حاشیہ آرائی کے ساتھ بڑھا چڑھا کر بیان کیا:

"۱۱ مئی ۱۸۵۷ء (کو) میرٹھ کی فوج کے کچھ بدنصیب اور شوریدہ

سرسپاہی شہر (دہلی) میں آئے۔ نہایت ظالم و مفسد اور نمک حرامی
کے سبب سے انگریزوں کے خون کے پیاسے (یہ) مدہوش سوار اور
اکھڑ پیادے، دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑ پڑے۔ جدھر کسی افسر
کو پایا اور جہاں ان قابلِ احترام (انگریزوں) کے مکانات دیکھے
جب تک ان افسروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل تباہ
نہیں کر دیا، ادھر سے رُخ نہیں پھیرا۔"

"زمین ہر طرف گل اندا موں (انگریزوں) کے خون سے رنگین ہوگئی۔
باغ کا ہر گوشہ ویرانی اور بربادی کے سبب سے بہاروں کا مدفن بن
گیا۔ افسوس وہ پیکرِ علم و حکمت، انصاف سکھانے والے خوش اخلاق
و نیک نام حاکم! اور صد افسوس وہ پری چہرہ نازک بدن خاتونیں
جن کے چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے اور جن کے بدن کچی چاندی کی
طرح دمکتے تھے! حیف وہ بچے جنھوں نے ابھی دُنیا کو (اچھی طرح)
دیکھا بھی نہیں تھا، جن کے ہنس مُکھ چہرے گلاب و لالہ کے پھولوں کو
شرماتے تھے اور جن کی خوش رفتاری کے سامنے ہرن اور کبک کی
رفتار بدنُما معلوم ہوتی تھی۔ یہ سب ایک دم قتل و خون کے بھنور
میں پھنس کر (بحرِ فنا میں) ڈوب گئے۔"

"(ہندوستانیوں نے) اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اُٹھائی۔
بے چاری عورتوں اور گہوارے میں کھیلتے ہوئے بچوں کو قتل کیا۔"

غالب کا بیان ہے کہ شوریدہ سر، ظالم، مفسد، دیسی سپاہی انگریزوں کے
خون کے پیاسے تھے، انھوں نے دیوانوں کی طرح انگریز افسر کو قتل کیا۔ ان اکھڑ اور
مدہوش انقلابیوں نے پری چہرہ، نازک بدن انگریز خواتین اور گہوارے میں کھیلتے
ان کے ہنس مکھ معصوم بچوں کے قتلِ عام سے بھی دریغ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ

زمین ان گل اندامون کے خون سے رنگین ہو گئی۔ یہ بیان مبالغہ آمیز اور مغالطہ انگیز ہے اور ایک معتبر معاصر شہادت سے اس کی تردید ہو جاتی ہے۔ انگلستان کی پارلیمنٹ کے ایک ممبر مسٹر لے یارڈ نے ہندوستانی سپاہیوں کی مبینہ غارت گری کی تحقیقات کرنے کی غرض سے خود انقلابِ ستاون کے دنوں میں ہندوستان کا دورہ کیا اور واقعات کی اصلیت کا ٹھیک ٹھیک پتا لگانے کی سعیِ بلیغ کی۔ مسٹر لے یارڈ نے اپنی تحقیق اور تفتیش کے نتائج کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"نہایت غور اور ہوشیاری کے ساتھ تحقیق کرنے کے بعد، اچھے سے اچھے اور سب سے زیادہ اہم اور معتبر لوگوں اور سب سے زیادہ قابلِ اعتبار ذریعوں سے جو اطلاعیں مجھے ملی ہیں، اُن سے مجھے اس بات کا پورا یقین ہو گیا ہے کہ دلی، کان پور، جھانسی اور دوسرے مقامات پر جو بہت ہی خوفناک مظالم کہا جاتا ہے کہ انگریز عورتوں اور بچّوں پر کیے گئے، وہ سب کے سب بلا ایک بھی استثنا کے جھوٹے اور فرضی ہیں، اور کہنے والوں کے خود اپنے من سے گھڑے ہوئے ہیں، جس کے لیے انھیں شرم آنی چاہیے۔"

[Mr. Layard, M.P., in: The Time, 25th August, 1858]

(بہ حوالہ سنہ ستاون، ص ۱۴۱، ۲۴۹)

آرام نے غالب کو کتاب کے نکل جانے کی اطلاع دی، اس کے جواب میں غالب ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"دیکھو صاحب! تم گھبراتے تھے، آخر یہ جنس پڑی نہ رہی اور بک گئی۔ بھائی ہندوستان کا قلم رو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں مر گئے۔ جو زندہ ہیں، اُن میں سیکڑوں گرفتارِ بندِ بلا ہیں۔ جو زندہ ہے اُس میں مقدور نہیں۔ میں ایسا جانتا ہوں کہ یا تو صاحبانِ انگریز کی خریداری آئی ہوگی یا پنجاب کے ملک کو یہ کتابیں گئی ہوں گی پورب میں کم بکی ہوں گی۔"

کتاب کا اڈیشن نکل جانے کی اطلاع ملنے پر غالب نے اس خط میں ہند کی صورتِ حال کے بارے میں جو غیر رسمی رائے دی ہے۔ وہ مطبوعہ اصل اور کُل کتاب پر بھاری ہے۔ "دستنبو" میں انھوں نے ہندوستانیوں کو متّہم کیا ہے اور انگریز سپاہیوں کی معقولیت اور امن پسندی کے گُن ان لفظوں میں گاتے ہیں:

"خدا کے واسطے ہندوستانیوں کا طرزِ عمل یاد کرو۔ اس کے بغیر کہ پہلے سے دشمنی کی کوئی بنیاد اور عداوت کا کوئی سبب ہو (ان ہندوستانیوں نے) اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اُٹھائی۔ بے چاری (انگریز) عورتوں اور گہوارے میں کھیلتے ہوئے بچّوں کو قتل کیا (حالانکہ) سب جانتے ہیں کہ اپنے آقا سے بے وفائی کرنا گناہ ہے (اس کے مقابلے میں) ان انگریزوں کو دیکھو کہ جب دشمنی (کا بدلا لینے) کے لیے لڑنے اُٹھے اور گناہ گاروں کو سزا دینے کے لیے لشکر آراستہ کیا، چونکہ (وہ) شہر والوں سے بھی برہم تھے تو موقع تو اس کا تھا کہ شہر پر قابض ہونے کے بعد کتے بلّی تک کو زندہ نہ چھوڑتے (لیکن انھوں نے) ضبط کیا (اگرچہ ان کے سینے میں غصّے کی آگ بھڑک رہی تھی، عورتوں اور بچّوں کو ذرا نہیں ستایا۔"

اِس پس منظر میں مذکورہ خط بہ نام شیو نرائن کی خط کشیدہ عبارت کے وزن اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ:

"ہندوستان کا قلم رو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں مر گئے۔ جو زندہ ہیں، اُن میں سیکڑوں گرفتارِ بندِ بلا ہیں۔ جو زندہ ہے اُس میں مقدور نہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ "دستنبو" کی غرضِ تصنیف "قلعۂ مُعلّا سے اپنے تعلق کے داغ کو مٹانا اور تحریکِ آزادی کو "رستخیزِ بے جا" قرار دے کر انگریز حکّام با اختیار کی نظر میں سُرخ رو ہونا تھا۔۔۔۔۔ اور سُرخ رو ہونا محض سُرخ رو ہونے ہی کے لیے نہیں

تھا، حکام وقت کو اپنی وفاداری کے یقین دلانے کی غایتِ اصلی پنسن کے اجرا کی آرزو اور خطاب و خلعت پانے کی تمنا تھی۔ انگریز حکام کے لیے پُرتکلف جلدوں کا اہتمام "ملکۂ معظمہ" کے لیے" قصیدۂ برگزیدہ در تہنیتِ فتحِ ہند" کی تصنیف اس کے شہرت پا جانے کی آرزو و تدبیر اور اُن تک کتاب پہنچانے کی عجلت اور عالی مقام صاحبانِ انگریز سے روابط بڑھانے اور راہ و رسم مراسلت کی فکرِ تجدید، اپنے مقصودِ اصلی کے لیے راہ ہموار کرنے ہی کی کڑیاں ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ غالب نے "غیر ملکی فاتحین سے جیسی سوچی سمجھی وفاداری کا اظہار کیا ہے، اگر ہم اس زمانے کے بے دریغ اور بہیمانہ قتلِ عام کو ذہن میں رکھیں تو اس کی نوعیت کا اندازہ کرنے میں دقت نہیں ہوتی[1]۔" یہ بھی صحیح ہے کہ اس انقلاب سے اُن کے تعلق یا اس سے اُن کی ہمدردی کا ذرا سا بھی شبہ انھیں دار و رسن کی آزمائش میں مبتلا کر سکتا تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ غالب کی "گزر اوقات کا وسیلہ پنشن (رہ گئی) تھی اور قبل اس کے کہ انگریز حاکموں کو اس کے دوبارہ اجرا کے لیے رضامند کیا جائے اس کے لیے اپنے استحقاق (یعنی بے گناہی) کو ثابت کرنا ضروری تھا۔ (بلا شبہ یہ بات ایک ایسے شخص کے لیے اور بھی ضروری تھی جس کا تعلق اُمرا سے رہا ہو، اور جو دلی کے مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کا اُستاد، درباری اور دوست رہا ہو)[2]۔" یہی ہُوا بھی کہ غالب نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے اور پنسن کے لیے اپنا استحقاق جتانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ہر عام آدمی ان حالات میں یہی کرتا، غالب سے ہیں روش خاص کی توقع تھی، وہ پوری نہیں ہوئی۔ "صورتِ حال جیسی بھی ہو، یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جب حالات غالب کے لیے ناساز گار ہوئے تو انھوں نے بھی اپنے بہت سے دوسرے احباب کی طرح ذاتی مدافعت کو دوسری تمام چیزوں پر ترجیح دی[3]۔"

---

[1] تا [3] ڈاکٹر محمد اشرف، اُردوے معلّٰی، دہلی، فروری ۱۹۶۱ء ص ۱۱۰۔

ذاتی تحفظ اور فروغِ مراتب کی غرض سے لکھی گئی اس کتاب کے مندرجات کو ہر چند "حقیقتِ واقعی" کے بہ منزلہ نہیں سمجھا جا سکتا، اس سرگذشت کی تسوید و تحریر خاص مصلحتوں کے تابع رہی ہے، پھر بھی ڈاکٹر محمد اشرف کے بہ قول:

"یہ بات یقینی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے ہر حسّاس طالبِ علم کے لیے یہ کتاب ایک قابلِ قدر دستاویز ہے۔"

(اُردوے معلیٰ، دہلی، فروری ۱۹۶۱ء، ص ۱۱۲)

غالب نے "دستنبو" کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا اور بنایا، گو اُس سے اُنھوں نے جیسی توقعات وابستہ کر لی تھیں، وہ پوری نہ ہوئیں، بہ این ہمہ کتاب کی یہ اہمیت بھی مُسلّم ہے کہ اس سے غالب کے کچھ سوانح پر روشنی پڑتی ہے اور بالخصوص اُن کی اُفتادِ مزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

○

"دستنبو" کا دوسرا اڈیشن سات برس بعد ۱۸۶۵ء میں شائع ہُوا۔ اس کی اشاعت کے بھی کچھ خاص محرکات تھے۔ "دستنبو" (نومبر ۱۸۵۸ء) کی اشاعت کو غالب نے اپنے لیے بہت سے مقاصد و مطالب کے حصول کا ذریعہ جانا تھا، لیکن اس سے انھیں کوئی فوری فائدہ نہیں ہُوا، جیسا کہ مالک رام نے لکھا ہے:

"مزید خطاب و خلعت تو درکنار، پہلا دربار و خلعت اور پنسن بھی جاری نہ ہوئے اور اگلے تین برس انھیں واگذاشت کرانے کی دوڑ دھوپ میں گزر گئے۔ آخر جب مئی ۱۸۶۰ء میں پنسن اور مارچ ۱۸۶۳ء میں دربار و خلعت جاری ہو گئے تو پھر اپنا پرانا مطالبہ یاد آیا۔ اس پر انھوں نے ۱۸۶۵ء کے آغاز میں دوبارہ درخواست دی کہ:

۱۔ مجھے ملکۂ عالیہ کا شاعرِ دربار مقرر کیا جائے۔

۲۔ دربار میں پہلے سے اونچی جگہ دی جائے۔

۳۔ میری کتاب "دستنبو" حکومت اپنے خرچ پر شائع کرے۔

اُس پر گورنر جنرل نے لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سے ان کے بارے میں رپورٹ طلب کی۔ چیف سکریٹری گورنمنٹ پنجاب نے لکھا کہ میرے خیال میں کمشنر دہلی کی یہ سفارش معقول ہے کہ علیا حضرت ملکۂ معظمہ کا تو نہیں لیکن انھیں وائسرائے کا درباری شاعر مقرر کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بھی لازم نہیں کہ عہدے کے ساتھ کوئی تنخواہ مقرر رہو۔ ہاں، "انہ خلعت ضرور دیا جائے اور اگر سال کے دوران میں بھی کسی خاص تقریب پر وہ قصیدہ پیش کریں تو بے شک خلعت دیا جا سکتا ہے۔ اس سے مرزا غالب کی بھی اشک شوئی ہو جائے گی اور علوم شرقیہ کی حوصلہ افزائی بھی، جو اس وقت بہت کم نگاہی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس پر مزید تحقیقات کا حکم ہُوا کہ غدر کے دنوں میں ان کے رویے کی تفتیش کی جائے، نیز ان سے "دستنبو" کا ایک نسخہ طلب کر کے اس پر بھی رائے لکھی جائے۔ جب مرزا سے "دستنبو" کا نسخہ طلب کیا گیا اس وقت وہ رام پور میں تھے۔"

(ذکرِ غالب، طبعِ چہارم، صفحہ ۱۵۱، ۱۵۲)

مرزا غالب رام پور میں نواب کلب علی خان کی تخت نشینی کے "جشنِ جمشیدی" سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ حکومتِ پنجاب کی طرف سے انھیں "دستنبو" کا ایک نسخہ بہ غرضِ ملاحظہ چیف سکریٹری کے پاس بھیجنے کا حکم ملا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ رام پور میں مرزا کو غالباً پہلے اڈیشن کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔ اگر ملا، تو وہ اس قابل نہیں تھا کہ اسے حکومت کو بھیجا جا سکے۔ چونکہ حکومت کی طرف سے مطالبہ ہُوا تھا اور مرزا کی اس سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں، اس لیے انھوں نے پہلے اڈیشن کا یہ نسخہ صحیح کر کے، اسے لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ، بریلی کے مطبع میں دوبارہ طبع کرایا اور دوسرے اڈیشن کا ایک نسخہ حکومتِ پنجاب کو بھیج دیا۔

"حکومت کے میر منشی نے "دستنبو" کو دیکھ کر رپورٹ کی کہ اس کتاب

کی زبان پرانی پارسی ہے۔ قدرتی طور پر اس میں ایسے لفظ آگئے ہیں جو اب بہت کم استعمال ہوتے ہیں اور عام طور پر رائج نہ ہونے کی وجہ سے نامانوس اور بعید الفہم ہیں۔ اس صورت میں حکومت کا اسے اپنے خرچ پر شائع کرنا کچھ ضروری نہیں۔"

(ذکرِ غالب، ایضاً، ص ۱۵۳، ۱۵۴)

"دستنبو" طبع دوم کے خاتمے کی عبارت یہ ہے:

"الحمد للہ کہ کتاب افادات انتساب بہ فرہنگ و دانش مرسوم و بہ دستنبو موسوم، چکیدۂ قلم جادو رقم نجم الدولہ، دبیر الملک، اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب عرف میرزا نوشہ مدّ اللہ ظلال فیوضہ باہتمام منشی پھندن لال صاحب در قالبِ طبع آمد و از نسخۂ صحیحہ مرسلۂ مصنف صاحب نقل شد و بہ تصحیح تمام در ۱۸۶۵ء حسن اختتام یافت۔"

لہ "لطیفہ یہ ہے کہ جن دنوں "دستنبو" کا پہلا اڈیشن مطبع مفید خلائق، آگرے میں چھپ رہا تھا، چھاپے خانے کے مالک منشی شیو نرائن نے مرزا کو ایک خط لکھا، جس کے لفافے پر پتے میں "مرزا نوشہ صاحب غالب" لکھ دیا۔ اس پر مرزا نے فوراً تفتہ کو لکھا کہ خدا کے لیے کہیں "مرزا نوشہ" کے الفاظ کتاب پر بھی چھپ نہ جائیں! اس نالائق عرف کو نہ کلکتے کے سرکاری حلقوں میں کوئی جانتا ہے، نہ ولایت میں، لیکن ان کا یہ خیال غلط تھا۔ دونوں جگہ کے حاکم اُن کے اس عرف سے خوب واقف تھے۔ بہرحال جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے، انھوں نے دوسرے اڈیشن کے آخر میں اس عرف کی موجودگی میں کوئی قباحت یا اعتراض نہیں دیکھا۔ غالباً اس لیے کہ ساتھ نام اور تخلص بھی موجود ہیں، یا شاید یہ سبب ہو کہ وہ اب اسے حکام بالا کو تحفے کے طور پر نہیں بھیج رہے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ عبارت لکھتے وقت ان سے استصواب کیا ہی نہ گیا ہو۔"

(مالک رام، ذکرِ غالب، حاشیہ ص ۱۸۹ و مابعد) بقیہ اگلے صفحے پر

اس دوسرے اڈیشن میں دو ایک جگہ لفظی تغیر ملتا ہے۔ ترتیب بھی بدل دی ہے۔ یعنی اب کے پہلے اصل کتاب ہے جو پندرہ سطری مسطر کے صفحہ ۵۶ پر ختم ہوئی ہے، اسی صفحے سے اُس قصیدے کا آغاز ہے (شمار یافت، روزگار یافت) جو طبعِ اول میں شروع میں رکھا گیا تھا۔ یہ قصیدہ صفحہ ۶۰ پر ختم ہوا ہے اور اس کے بعد اُس قطعے کا اضافہ کیا گیا ہے جو "فتحِ دہلی" کی خوشی میں (روزگار چراغاں، اشتہار چراغاں) چراغاں کے موقع پر انھوں نے اکتوبر ۱۸۵۸ء میں لکھا تھا۔ یہ اڈیشن ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ قدرتی طور پر اس سے طبعِ اول کی دونوں تاریخیں (قطعاتِ تاریخِ آغاز و انجامِ کتاب از تہر و تفتہ) حذف کر دی گئی ہیں کہ اب ان کی کوئی مناسبت نہیں تھی۔ "دستنبو" کے صرف یہی مستقل اڈیشن مرزا غالب کی زندگی میں شائع ہوئے۔"

(مالک رام، نگار، لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۲)

"دستنبو" طبعِ دوم کے تین برس بعد غالب کی زندگی میں "دستنبو" کی تیسری اشاعت جنوری ۱۸۶۸ء میں کلیاتِ نثرِ غالب کے ساتھ شائع ہوئی۔ "کلیات" علی الترتیب "پنج آہنگ"، "مہرِ نیم روز" اور "دستنبو" پر مشتمل ہے۔ یعنی "دستنبو" کلیات کی نثرِ سوم کے طور پر شاملِ کتاب ہے اور صفحہ ۱۸۹ سے ۲۱۲ کو محیط ہے۔ "دستنبو" کا متن صفحہ ۱۹۰ سے شروع ہو کر صفحہ ۲۰۷ پر ختم ہو جاتا ہے۔ صفحہ ۲۰۷ ہی سے قصیدہ در مدحِ ملکۂ معظمۂ انگلستان، چار کالم میں طبع ہوا ہے اور ۲۰۸ پر تمام ہوتا ہے۔ صفحہ ۲۰۸ ہی کے آخر میں قطعہ در بیانِ روشنی دہلی درج ہے۔ صفحہ ۲۰۹ تا ۲۱۲ "دستنبو" کی فرہنگ ہے۔ "کلیات" میں "دستنبو" کا متن

(بقیہ گذشتہ سے پیوستہ) یہی زیادہ قرینِ صواب معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبارت صاحبِ مطبع کی صوابدید سے لکھ دی گئی اس کے لیے غالب سے استصواب نہیں کیا گیا، تاہم کے ساتھ خطابات کے اعلان سے اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ اُن کے نزدیک تو اس کتاب میں "اجزائے خطابی کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر" تھا۔

(بہ نامِ تفتہ، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء)

جوں کا توں ہے، لیکن مالک رام کے لفظوں میں "آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ مرتب کروا کے اضافہ کیے گئے ہیں جو یقیناً مفید ہیں کیونکہ (اس کتاب) میں نادر اور نامانوس الفاظ بہ کثرت استعمال ہوئے ہیں جو عام فہم نہیں تھے"[1]

پنجاب پبلک لائبریری، لاہور میں کیٹلاگ نمبر "۹۶/۱، ۸ پنج" کے تحت "کلیاتِ نثرِ غالب" کا ایک خطی نسخہ موجود ہے۔ یہ نسخہ ڈاکٹر اظہر علی (ایم۔اے۔ایم۔او۔ایل۔پی۔ایچ۔ڈی، ۱۵۲ اسی ماڈل ٹاؤن لاہور) نے پنجاب پبلک لائبریری کو ہدیہ کیا ہے۔ کلیات کے اس قلمی نسخے میں بالترتیب "پنج آہنگ" "مہرِ نیم روز" اور "دستنبو" شامل ہیں۔ خط بہت روشن ہے۔ کتابت بہت صاف صاف اور قلم سنبھال کر کی گئی ہے۔ اوّل تا آخر پندرہ سطری مسطر ہے۔ سرِ عنوان وغیرہ شرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ "دستنبو" کے خاتمے پر قطعاتِ آغاز و انجام (از مہر و تفتہ) بعد یہ فقرہ ہاتھ سنبھال کر صاف صاف لکھا گیا ہے:

"ایں رسالہ بہ قرۃ العین میر سرفراز حسین فرستادہ آمد"

اس فقرے کا قلم اور قط وہی ہے جس سے پوری "کلیات" لکھی گئی ہے۔ اس کے بعد خفی قلم سے پختہ و شکستہ رواں انداز میں ترقیمہ ہے:۔

"ایں رسالہ را بہ استمداد فرخندہ سیر، سعادت گستر، آسائش رواں عزیز از جاں اسوۂ آلِ نبی و اولادِ علی سید مہدی حفظہ اللہ تعالیٰ فی الارض بہ تاریخ بست و ہشتم محرم سنہ ۱۲۸۰ ہجریہ قدسیہ (مطابق ۱۵ رجولائی ۱۸۶۳ء) بہ مقام دہلی در حویلی مہابت خاں، خاکسار پریشاں روزگار، گنہ گار بارگاہ ستار و غفار، سید حسن موسوی مشہور میر حسن بہ وقت سہ پہر روز پنج شنبہ ختم نمود۔

---

[1] نگار، لکھنؤ، خاص نمبر جولائی ۱۹۶۰ء ص ۱۰۲۔

ہر کہ خواند دعا طمع دارم

زاں کہ من بندۂ گنہ گارم

"والسّلامُ علیٰ مَنِ اتّبعَ الہُدیٰ"

ترقیمے کی اس عبارت سے اس کے زمانۂ کتابت، کاتب اور نسخے کے مالک کا پتا چلتا ہے۔

"دستنبو" کی تیسری جداگانہ اور مستقل اشاعت (بہ مطابق طبعِ دوم) غالب کے انتقال کے دو برس بعد عمل میں آئی، در مطبع لٹریری سوسائٹی، روہیل کھنڈ، واقع بریلی، ۱۸۷۱ء۔

انیسویں صدی کی بعض دیگر اشاعتیں در "کلیاتِ نثرِ غالب":

- نولکشور، لکھنؤ: ۱۸۷۱ء، ۱۸۷۵ء
- نولکشور، کانپور: ۱۸۷۵ء، ۱۸۸۴ء، ۱۸۸۸ء

"رستخیز بے جا"

۱۲۷۳ھ — ۱۸۵۷ء

اُردو ترجمہ

(مترجم: رشید حسن خاں
حواشی: ڈاکٹر معین الرحمٰن)

"دستنبو پہلی بار نومبر ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ فارسی قدیم میں تھی اور فارسی بھی وہ فارسی قدیم جس کا اُس زمانے میں پارس کے بلاد میں بھی نشان نہیں رہا تھا۔ ہندوستان کا تو کیا ذکر۔ غالب نے بطریق لزوم مالایلزم اس کا التزام کیا تھا کہ بزبانِ فارسی قدیم، جو دساتیری زبان ہے اُس میں یہ نسخہ لکھا جاوے اور سوائے اسماء کے کہ وہ نہیں بدلے جاتے، کوئی لغتِ عربی اس میں نہ آوے۔ اس لیے "دستنبو" کا اُردو ترجمہ کرنا بڑا کٹھن اور دشوار گذار کام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کی اشاعت اور غالب کے انتقال کے پچاس برس بعد تک کسی کو اس "جرثقیل" کتاب کا اُردو ترجمہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ اب سے نصف صدی پہلے خواجہ حسن نظامی کی فرمائش پر میرزا محمد یعقوب بیگ نامی ایم اے نے پہلی بار اس مشکل کام کو ہاتھ میں لیا۔ اُن کا ترجمہ ۱۹۲۰ء میں خواجہ حسن نظامی کی تالیف "میرزا غالب کا روزنامچہ" کے ساتھ شائع ہوا۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ:

"دستنبو" کا ترجمہ آسان نہ تھا کیونکہ وہ نہایت سخت فارسی میں ہے۔ مگر نامی صاحب نے دو دن کے اندر اتنے مشکل کام کو آسان کر کے دے دیا۔" (روزنامچہ طبع سوم ص ۵۹)

"غالب کی سخت اور مشکل فارسی عبارت جس کو عربی الفاظ سے دانستہ محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی، ایسا عام فہم اور صحیح ترجمہ کیا گیا ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔"

(روزنامچہ طبع سوم۔ ص ۷۳)

میرزا محمد یعقوب بیگ نامی کا ترجمہ۔ اس میں شُبہ نہیں کہ بہت عمدہ ہے۔ لیکن یہ پوری کتاب کا نہیں، اس کے صرف جستہ جستہ حصّوں کا اُردو ترجمہ ہے۔ اسی لیے یہ صرف گیارہ صفحات کو محیط ہے۔

(طبع سوم، ص ۷۰ - ۷۱)

۱۹۶۱ء میں دستنبو کے دو الگ الگ تراجم سامنے آئے۔ ایک ترجمہ رسالہ "تحریک" دہلی، اپریل مئی ۱۹۶۱ء (ص ۵۳ - ۷۲) میں چھپا تھا۔ یہ ترجمہ محمد سعیدی کا ہے۔ دوسرا ترجمہ رسالہ "اردوئے معلّٰی" دہلی جلد دوم، شمارہ ۲، ۳ بابت فروری ۱۹۶۱ء (ص ۱۷۷-۲۲۲) شائع ہوا۔ یہ ترجمہ رشید حسن خاں صاحب کا کیا ہوا ہے۔ یہی ترجمہ رسالہ "نگار" (کراچی) کے غالب نمبر میں بھی "اُردوئے معلّٰی" سے نقل کیا گیا تھا۔ یہی ترجمہ ضروری حواشی کے ساتھ اس کتاب میں پیش کیا جا رہا ہے۔ حواشی میرے لکھے ہوئے ہیں۔

بہ نام خداوند پیروزگر   مہ و مہر ساز و شب و روزگر

میں اِس کتاب کا آغاز کرتا ہوں اُس خدا کے نام سے جو کامیابی بخشنے والا ہے جو چاند، سورج اور دن، رات کا خالق ہے۔

عظیم طاقت کا مالک ہے وہ شہنشاہ جس نے نو آسمانوں کو بلند کیا اور سات ستاروں کو روشنی عطا کی۔ بڑا صاحبِ علم ہے وہ خدا جس نے جسم کو روح سے سرفراز کیا اور انسان کو حکمت و انصاف (کی دولت) بخشی۔ جس نے مادّے اور وسائل کی مدد کے بغیر سات (زمینوں) اور نو آسمانوں) کو پیدا کیا۔ مشکل اور آسان کاموں کا بن جانا (اِس سلسلے میں راستے کی) معمولی یا غیر معمولی رکاوٹوں کا دور ہونا (ان سب اُمور کو) ان کی رفتار و اثرات سے متعلق کیا۔

(خدا نے) ان ضابطوں کو اس طرح مرتب نہیں کیا کہ یہ اجرام جو باہم متضاد ہیں (مختلف صفات رکھتے ہیں) ایک دوسرے سے دور دور رہتے ہیں اور (کبھی) ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں، طاقت کے باوجود فرماں برداری نہ کریں اور قوّتِ کارفرمائی اور صلاحیتِ تاثیر کے باوصف فرمانِ (قدرت) کے تابع نہ ہوں۔ ؎

"تم آسمانوں اور ستاروں کے راز (جاننے) کا کیا دعوا کرتے ہو
تم تو ابھی تک چت اور پٹ کے فرق سے واقف نہیں ہو۔ ستاروں
کی پرستش نہ کرو (ان کو دنیا کے کاموں میں مطلق صاحبِ اختیار
نہ مانو)، کیونکہ ایک آفتاب (خدا) بھی موجود ہے، جس کی روشنی

(کائنات کی تمام) ظاہر و پوشیدہ چیزوں کو حلقے میں لیے ہوئے ہے۔

اگر زہرہ و مشتری میں (سعد ہونے کے لحاظ سے) فائدہ پہنچانے کی کچھ صلاحیت ہے (تو ہو) اور زحل و مریخ میں (نحس ہونے کے اعتبار سے) نقصان رسانی کی خاصیت ہے تو ہوا کرے، جو لوگ واقفِ حقیقت ہیں، وہ جانتے ہیں کہ نحوست و برکت اور مسرت و غم کا سرچشمہ کہاں ہے۔ ستارے ایک عادل شہنشاہ کے ملازم ہیں۔ (اس) عدالت کے سپاہی کبھی حلقۂ انصاف سے قدم باہر نہیں نکالتے ہیں۔ مل جل کر کام کرنے اور کارسازی (تعمیلِ حکم) کے علاوہ ان کو کسی چیز سے تعلق نہیں۔ اگر ان میں سے کسی نے سخت گیری کے (وسیلے سے) اُلجھے ہوئے کاموں کو سلجھانا چاہا، یا کسی نے نرمی کے (ذریعے) سے ہنگامۂ زندگی کی رونق افزائی کی، تو یہ سب (زندگی کو) بنانے سنوارنے اور (مشکلوں کو حل کرنے) کے مختلف انداز ہیں، ظلم یا بے نیازی نہیں ہے :

مُغنّی ساز کے تاروں پر مضراب سے ضرب لگاتا ہے اور ظاہر ہے
کہ اس سے اس کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ مسرتیں مصیبتوں کے پردے
میں چھپی ہوئی ہیں۔ دھوبی غصّے میں آکر کپڑے کو پتھر پر نہیں مارتا۔

درحقیقت کسی چیز کا فنا ہونا کسی دوسری چیز کے وجود کا سبب بنتا ہے۔ حقیقتاً آرام و تکلیف اور بلندی و پستی ساری چیزیں (خدا کی طرف سے) انسان کو ملتی ہیں، اس لیے وہ سب فائدے اور بہبودی کا وسیلہ بن جاتی ہیں، اور ان سے مسرتیں حاصل ہوتی ہیں۔ دولت مند کسی محتاج کو چند پیسے دے یا ہزاروں روپے، ریشم کے تھان عطا کرے یا کمبل (ہر صورت میں) سخاوت اور درویش پروری ہے۔ قدرت کے عطیات کو اچھائی بُرائی کے خانوں میں تقسیم کرنا یا کمی بیشی (کا الزام رکھنا) کج خیالی و کم فہمی ہے۔

یہ دُنیا کی بے حقیقت چیزیں جو (فنا کے طاقتور تھپیڑوں کے) سامنے ہیچ ہیں، کیا ان کے لیے یہ بخشش (خداوندی) کچھ کم ہے کہ وہ موجود ہیں۔

لیکن یہ (دقیق) باتیں کم نظر اور کم معرفت لوگوں کی رسائی ذہن سے باہر ہیں اور اظہارِ بیان کی وہ طاقت بھی ختم ہو گئی۔ مجبوراً میں چند سیڑھیاں نیچے اُترتا ہوں، (آسان اندازِ بیان اختیار کرتا ہوں اور) اُنھی کہی ہوئی باتوں کو صاف اور سادہ انداز میں کہتا ہوں۔ آسمان کی گردش چکّی کی رفتار کی مانند ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ چکّی کو چلانے والا ضرور ہوتا ہے، پھر تم یہ کیوں نہیں سمجھتے ہو کہ آسمان کو گردش میں رکھنے والا بھی کوئی ہے۔ آسمان کے چرخے میں ستاروں کی صلاحیتِ نفع رسانی اور اذیت دہی کے تاروں سے بنی ہوئی پُونی لگی ہے، جس سے چند پردے تیار کر کے اہلِ دُنیا کی نگاہوں کے سامنے ڈال دیے گیے ہیں۔ صاحبانِ معرفت اور رواقفانِ اسرار ان پردوں کے باوجود دیکھ لیتے ہیں کہ ہر کام کا کرنے والا خُدا ہی ہے۔ ـــ؎:

جب یہ مسلّم ہے کہ آسمان کی گردش حکمِ خُدا کے تابع ہے تو پھر آسمان
جو کچھ دے، ہم اس کو ظلم کیسے کہہ سکتے ہیں ؟

سُبحان اللہ! کتنا عظیم ہے وہ خدا جو وجود عطا کرتا ہے اور عدم کو ختم کرتا ہے۔ جو ظلم کو ختم کرنے والا اور انصاف کی روشنی پھیلانے والا ہے۔ وہ انصاف (کی طاقت) سے طاقتوروں کا زور گھٹا دیتا ہے اور اپنے کرم سے کمزوروں کو طاقت بخشتا ہے۔ ابابیل کے کنکروں کی ضرب سے فیل سوار خود سروں کا خاک میں مل جانا یا ایک مچھّر کا نمرود کو موت کے بستر پر سُلا دینا کیا تھا؟ یقیناً یہ وہ نشانیاں ہیں جن سے اُس کی (بے پناہ) قوّت و قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔ ورنہ مجھ کو بتاؤ کہ یہ دو مختلف قسم کی تباہیاں جو مختلف زمانوں میں نازل ہوئیں، یہ کس ستارے کی نگاہِ ستم کا کرشمہ تھیں۔ ـــ؎:

ضحّاک، جمشید سے تخت و تاج چھین لیتا ہے۔ سکندر، دارا کا
سینہ چاک کر دیتا ہے۔ عفریت، حضرت سلیمانؑ کے ہاتھ سے انگوٹھی
اُڑا لے جاتا ہے، جو دیو اور پریوں پر حکمرانی کرتے تھے۔ تم جزا و
سزا کے اسرار سے واقف نہیں ہو۔ بس آسمانوں اور ستاروں کو

ہر چیز کا ذمے دار سمجھتے ہو۔

خدا جس طرح کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے اُسی طرح ہر موجود کو فنا بھی کر سکتا ہے۔ وہ خالق جس نے ایک لفظ "کن" سے سارے عالم کو پیدا کیا، اگر وہ اس عالم کو فنا کر دے تو کس کی مجال ہے کہ چون و چرا کر سکے۔

○

اس زمانے میں ہر راگ کا آہنگ اور ہر چیز کا قاعدہ ہی بدل گیا۔ سپاہی سرداروں سے منحرف ہو گئے۔ سخن طرازی سے کیا فائدہ۔ کہنا چاہیے کہ زمانہ ہی بدل گیا۔ منجمین کا خیال ہے کہ جس زمانے میں ایران کے آخری شہنشاہ یزدجرد کی محفلِ عیش عربوں کے حملوں سے درہم برہم ہو گئی تھی، اُس وقت زحل و مریخ دونوں برج سرطان میں جمع تھے۔ آج کل بھی برجِ سرطان، زحل و مریخ کا مسکن معلوم ہوتا ہے۔ یہ بغاوت، لڑائی، ظلم، خوں ریزی اور ذلت اسی (قرانِ نحس کے) اثرات ہیں۔ (لیکن، جو لوگ شناسائے حقیقت ہیں، وہ اس بات کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں؟) ایران پر عرب کا حملہ (بالکل دوسری چیز تھی؛ وہ) تو ایک ملک پر دوسرے ملک کے لوگوں کی فوج کشی تھی، لیکن یہاں تو فوج نے اپنے سرداروں سے بغاوت کی ہے۔ ایران کی قدیم داستانوں سے ان دو لڑائیوں کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔

ایران پر (عرب کا) حملہ مذہبی بنیاد پر تھا۔ ایران جو علم و حکمت کے لحاظ سے ویران ہو چکا تھا، ایک نئے مذہب کی برکتوں سے معمور ہو گیا، اور اس کی بدولت آگ کی (پرستش اور) غلامی سے نجات پائی۔ لیکن (ہندوستان میں) جہاں سوال صرف قانون کا ہے، ہندوستان والے کس نئے آئین کی حفاظت کا سہارا لے کر (اپنے اس فعل پر) خوشی کا اظہار کر سکتے ہیں؟

اہلِ ایران نے آتش پرستی سے منہ موڑ کر خدا پرستی کا راستہ دیکھا۔ لیکن ہندوستان والے منصف حاکموں (انگریزوں) کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر درندہ صفت انسانوں کے دام میں گرفتار ہو گئے۔ تم نہیں دیکھتے ہو کہ دامن و دام اور داد و دد

میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انگریزی حکومت کے علاوہ کسی دوسری حکومت میں انصاف کی اُمید رکھنا بالکل نادانی ہے۔ عربوں کے تازیانے سے جو زخم لگے تھے، وہ مبارک مذہب (اسلام) اُن زخموں کا مرہم بن گیا تھا۔ اگر ان مصیبتوں کے بعد زمانہ امن وراحت کی دولت بخشتا تو مصیبت زدہ غم وآلام کو بھول سکتے تھے۔ اگر کسی واقفِ راز و صاحبِ نظر کے خیال میں اس قیامت کے بعد کوئی راحت ملنے والی ہو تو بتائے اور میرے غم گین اور خوف زدہ دل کو تسکین بخش کر ممنون کرے۔ (امن وانتظام کے ذمّے دار) ملازمین، حاکموں سے بغاوت کریں، سپاہی افسروں کو قتل کریں اور خوشیاں منائیں اور ان کو ذرا بھی پشیمانی نہ ہو۔

اے واقفانِ اسرار و عارفانِ سود و زیاں یہ سارا ہنگامہ خدا کا قہر ہے ایران کی وہ جنگ اس قدر مایوس کن اور تباہ کار نہیں تھی۔ ے:

سازِ پریشان نغمے اس لیے بلند ہو رہے ہیں کہ عالمِ اضطراب میں
مضراب سے تاروں کو بے طرح چھیڑ رہا ہوں۔

میں اس قدر نا فہم نہیں ہوں کہ ستاروں کو روشن ہونے کے باوجود بے نور کہہ دوں، آسمان کو عظیم و بلند ہونے کے باوصف بے سروساماں سمجھوں، مخلوقِ آسمانی کی کارگزاریوں کو جھوٹ سمجھوں، یا ان دو منحوس ستاروں (زحل و مرّیخ) کے ایک بُرج میں جمع ہونے سے آج بھی انھیں پُرآلام حالات کی توقّع کروں جو اب سے ایک ہزار سال پہلے (جنگِ عرب و ایران کے زمانے میں) واقع ہوئے تھے۔

میں جو زمانے کے ہاتھوں ناقابلِ علاج مصیبتوں میں گرفتار ہوں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس زمین پر بسنے والے، جنھوں نے برجِ سرطان کو نہیں دیکھا ہے اور جو زحل و مرّیخ کے نام ہی سے واقف ہیں، نا شنیدہ اور اَن دیکھی باتوں میں نہ اُلجھیں۔ بلکہ یہ سمجھ لیں کہ زمانے نے جس کے سینے میں ماضی و مستقبل کے راز محفوظ ہیں اور اچھے لوگوں کے کام کو بگاڑنا اس کی پرانی عادت ہے (اس موقع پر) اس بات کو روا رکھا کہ باغی فوجوں کی دست بُرد سے دانایانِ فرنگ کو نقصان پہنچائے۔ ہاں لیا اس نے اس گروہ (باغیوں) پر

اُن کی ہر جانب سے آنے والی افواج کو مُسلّط کر دیا۔

اِس کتاب کے پڑھنے والے یہ سمجھ لیں کہ میں نے جس کے قلم کی جنبش سے کاغذ پر (الفاظ کے) موتی بکھر جاتے ہیں، انگریزی حکومت کے نان و نمک سے پرورش پائی ہے اور بچپن سے ان فاتحینِ عالم کے دسترخوان کا ریزہ چیں ہوں۔ سات آٹھ سال[۱] ہوئے کہ بادشاہِ دہلی نے مجھ کو بلایا اور مجھ سے فرمائش کی کہ میں تیموری خاندان کے بادشاہوں کی تاریخ لکھوں جس کے عوض ۶۰۰ روپے سالانہ دیا جائے گا۔ میں نے اس خدمت کو قبول کر لیا اور کام میں مشغول ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد بادشاہ کے اُستاد کا انتقال[۲] ہو گیا اور اصلاحِ شعر کا کام بھی مجھ سے متعلق کر دیا گیا۔

میں بوڑھا اور کمزور تھا، نیز گوشۂ تنہائی میں بیٹھے رہنے اور آرام کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بہرے پن کی وجہ سے بارِ خاطرِ حاضرین ہو جاتا تھا کوئی بات کر رہا ہے اور میں اس کے ہونٹوں کی جنبش پر نظر جمائے ہوئے ہوں۔ مجبوراً ہفتے میں ایک دو بار قلعے میں جاتا تھا[۳]۔ اگر بادشاہ محل سے برآمد ہوتے تھے تو کچھ دیر حاضرِ خدمت رہتا تھا ورنہ دیوانِ خاص میں کچھ دیر بیٹھ کر چلا آتا تھا۔

---

[۱] قلعۂ معلّیٰ کی ملازمت ۱۸۵۰ء کا واقعہ ہے۔ غالب ۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ (مطابق ۴ جولائی ۱۸۵۰ء) جمعرات کے دن بہادر شاہ ظفر کے حضور پیش ہوئے۔ خطاب و خلعت پایا اور تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور ہوئے۔ اخبار کوہِ نور، لاہور ۱۵ جولائی ۱۸۵۰ء کی اشاعت (ص ۳۶۷) میں اس تقرر پر خوشی کا اظہار کیا گیا ہے۔

[۲] "افسوس، صد افسوس کہ شہنشاہِ ملکِ سخن وری، خسروِ اقلیمِ معنی گستری ملک الشعرا خاقانیِ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق اُستادِ حضورِ والا نے ۲۳ صفر شبِ آخر چہار شنبہ ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۵ نومبر ۱۸۵۴ء عالمِ فانی سے بہ سوئے عالمِ جاودانی رحلت کی۔"

(تتمۂ دہلی اُردو اخبار۔ بہ تاریخ ۱۹ نومبر ۱۸۵۴ء مطابق ۲۷ صفر المظفر ۱۲۷۱ھ)

[۳] قلعے سے اپنے تعلق کی نوعیت کو سرسری بتانا محض اپنی مدافعت میں ہے۔ (بقیہ اگلے صفحے پر)

اس مدت میں جتنا کام مکمل ہو جاتا، اس کو اپنے ساتھ لیے جاتا تھا یا کسی کے ہاتھ بھیج دیتا تھا۔ یہ تھا میرا تعلق اور میرا کام۔ لیکن یہ تیز رفتار آسمان اس خیال میں محو تھا کہ ایک نئے انقلاب کا خاکہ مرتب کرے اور میرے اس سکون و آرام کو جس میں آسایش و فراغت کا کوئی حصہ نہیں تھا اور جو ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک تھا، تباہ کر دے:

"یہ آسمان ایسا ظالم ہے، کہ دشمن ہو یا دوست ہر ایک اس کی تیغِ بے پروائی سے زخمی رہتا ہے۔"

اس سال جس کا مادۂ تاریخی بہ رعایتِ تخرجہ "رستخیزِ بےجا" ہے۔ اور اگر صاف صاف پوچھو تو ۱۶ رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ کو پیر کے دن دوپہر کے وقت مطابق ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء اچانک دہلی کے قلعے اور فصیل کی دیواریں لرز اٹھیں، جس کا اثر چاروں طرف پھیل گیا۔ میں زلزلے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اس دن جو بہت منحوس تھا، میرٹھ کی فوج کے کچھ بدنصیب اور شوریدہ سر سپاہی شہر میں آ گئے۔ نہایت ظالم و مفسد اور نمک حرامی کے سبب سے انگریزوں کے خون کے پیاسے۔ شہر کے مختلف دروازوں

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) ورنہ انھیں حضورِ شاہ قربِ مرروزہ کی عزت حاصل تھی اور ان کی توقیر قلعے کے ممتاز ترین عہدوں پر فائز اصحاب سے کسی طرح کم نہیں تھی:

"کاش آپ یہاں ہوتے اور میرا حال دیکھتے تو جانتے، ہر روز صبح کو قلعہ جانا، دوپہر کا آنا، بعد کھانا کھانے کے حضرت (بہادر شاہ) کے مسودوں کا درست کرنا۔"

(بنام قدر بلگرامی، ماقبل ۱۸۵۷ء)

"بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔ بخشی، ناظر، حکیم، کسی سے توقیر کم نہیں۔"

(بنام مجروح، ۱۶ اپریل ۱۸۶۰ء)

"میرزا غالب کے کلیاتِ فارسی کو دیکھا جائے تو بہادر شاہ کے متعلق ۵ قصائدِ مدحیہ، دو مدحیہ مثنویاں اور ایک ترجیع بند موجود ہے۔ اردو قصیدے یا قطعے ان کے علاوہ ہیں۔"

کے محافظ جو ان فسادیوں کے ہم پیشہ اور بھائی بند تھے بلکہ کچھ تعجب نہیں کہ پہلے ہی سے ان محافظوں اور فسادیوں میں سازش ہوگئی ہو۔ شہر کی حفاظت اور ذمّے داری اور حقِ نمک ہر چیز کو بھول گئے۔ اِن بِن بُلائے یا مدعو کردہ مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ اُن مدہوش سواروں اور اکھڑ پیادوں نے جب دیکھا کہ شہر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور محافظ مہمان نواز ہیں، دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑ پڑے۔ جدھر کسی افسر کو پایا اور جہاں ان قابلِ احترام (انگریزوں) کے مکانات دیکھے، جب تک اُن افسروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل تباہ نہیں کر دیا، اُدھر سے رُخ نہیں پھیرا۔

کچھ مسکین، گوشہ نشین جن کو انگریزی حکومت کی مہربانی سے کچھ نان و نمک میسر تھا، شہر کے مختلف علاقوں میں ایک دوسرے سے دور زندگی کے دن گزار رہے تھے (ایسے مسکین و صلح پسند) جو تیر و تبر کے فرق سے ناواقف تھے اور اندھیری راتوں میں چوروں کے شور و غل سے ڈر جاتے تھے، جن کے ہاتھ تیر و تلوار سے خالی تھے۔ سچ پوچھو تو ایسے لوگ ہر گلی کوچے اور شہر کے ہر حصّے میں ہیں۔ یہ وہ لوگ نہیں جو لڑائی کے ارادے سے کمر کس کر تیار ہو سکیں۔ اس کے باوجود کہ ایسے صلح پسند و خیر خواہ شہر کے ہر حصّے اور ہر گلی کوچے میں تھے، اس وجہ سے کہ تیز بہنے والے پانی کو خس و خاشاک سے نہیں روکا جا سکتا، اپنے آپ کو مجبور سمجھ کر ہر شخص غمگین و ماتم زدہ اپنے گھر میں بیٹھ رہا۔

انھیں غم زدہ لوگوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ شور و غوغا سُنا، چاہتا تھا کہ کچھ معلوم کروں کہ اتنے میں شور مچ گیا کہ اندرونِ قلعہ صاحب اجنٹ بہادر اور قلعہ دار قتل کر دیے گئے۔ ہر طرف سے پیادوں اور سواروں کے دوڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ زمین ہر طرف گل اندامول (انگریزوں) کے خون سے رنگین ہوگئی۔ باغ کا ہر گوشہ ویرانی اور بربادی کے سبب سے بہاروں کا مدفن بن گیا۔

افسوس وہ پیکرِ علم و حکمت، انصاف سکھانے والے خوش اخلاق و نیک نام حاکم! اور صد افسوس وہ پری چہرہ نازک بدن خاتونیں جن کے چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے اور جن کے بدن گھی چاندی کی طرح دمکتے تھے! حیف وہ بچے جنھوں نے ابھی دنیا کو (اچھی طرح) دیکھا بھی نہیں تھا، جن کے ہنس مکھ چہرے گلاب و لالہ کے پھولوں کو شرماتے تھے اور جن کی خوش رفتاری کے سامنے ہرن اور کبک کی رفتار بدنما معلوم ہوتی تھی، یہ سب ایک دم قتل و خون کے بھنور میں پھنس کر (بحرِ فنا میں) ڈوب گئے۔

(فنا کی) چنگاریاں برسانے والی وہ موت، شعلے جس کا سرمایہ ہیں، جس کے ہاتھوں لوگ غم زدہ رہتے ہیں اور ماتمی لباس پہننے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اگر ان مقتولین کے سرہانے آہ و زاری کرے اور اس غم میں سیاہ پوش ہو جائے تو روا ہے۔ اگر آسمان (اس غم میں) غبار کی طرح منتشر ہو جائے اور زمین گرد باد کی طرح اپنی جگہ چھوڑ دے تو بجا ہے ؂:

اے موسمِ بہار! بسمل کی طرح خاک و خون میں مل جا،

اے زمانے! اندھیری رات کی طرح تاریک ہو جا،

اے آفتاب! (اس غم میں) اپنے رخساروں کو پیٹ کر نیلا کر لے،

اور اے چاند! (غمگین) زمانے کے دل کا داغ بن جا۔

خدا خدا کر کے وہ منحوس دن ختم ہوا، ہر طرف گھرا اندھیرا پھیل گیا۔ ان سیاہ باطنوں اور بے رحم قاتلوں نے شہر میں جا بجا پڑاؤ ڈالا۔ اندرونِ قلعہ شاہی باغ کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا اور نشیمنِ سلطانی کو خواب گاہ۔ رفتہ رفتہ دور دور کے شہروں سے خبریں آئیں کہ مختلف فوجوں کے باغیوں نے ہر چھاؤنی میں افسروں کو قتل کر دیا ہے (اور نمک حراموں نے کھلم کھلا بغاوت کا شور مچا رکھا ہے) گروہ کے گروہ خواہ سپاہی ہوں یا زمیندار، سب یک دل ہو گئے اور کسی نے شد و مد و گمراہی کے بغیر دور و نزدیک ہر جگہ ایک ہی کام کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ اور پھر کیسی مضبوطی سے کمریں کسی تھیں کہ صرف

اس دریائے خوں کی موجیں ہی ان کو کھول سکتی تھیں جو کمروں سے کنز رجائے۔ (مختلف مقامات کے لوگ کسی قرار داد کے بغیر جس طرح ایک ہی کام یعنی قتل و خون میں لگ گئے تھے اس سے) ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس طرح جھاڑو کی بہت سی سینکوں کو ایک ہی بند سے باندھا جاتا ہے، اسی طرح گنتی شمار سے باہر ان لڑنے والوں کی کمریں بھی ایک ہی "کمر بند" سے بندھی ہوئی ہیں۔

بے شک ہندوستان کو آرام و آسایش سے اس حد تک خالی کرنے کے لیے کہ اگر ان چیزوں کو ڈھونڈا جائے تو ایک گھاس کے تنکے کے برابر بھی نشان نہ ملے، ایسی ہی جھاڑو کی ضرورت تھی۔ بہت سے لشکر سرداروں کے بغیر تیار ہو گئے، بہت سی فوجیں افسروں کے بغیر لڑائی کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئیں، توپیں، گولہ بارود، چھرّے، غرض سارا سامان انگریزوں سے حاصل کیا، لڑائی کے سارے طریقے انگریزوں سے سیکھے اور انھیں سکھانے والوں اور مالکوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔

دل، لوہے یا پتھر کا ٹکڑا نہیں ہے، کیسے نہ بھر آئے؟ آنکھیں رخنۂ دیوار نہیں ہیں کہ آنسو نہ بہائیں۔ حکمرانوں کی موت کا غم منانا چاہیے اور ہندوستان کی ویرانی پر رونا چاہیے۔ شہر حاکموں سے خالی اور بندہ ہائے بے خداوند سے بھرا ہوا جیسے باغ باغبان سے خالی اور درختانِ بے ثمر سے پُر ہو۔ لٹیرے ہر قسم کی پابندیوں سے اور سوداگر محصول ادا کرنے کی ذمّے داریوں سے آزاد۔ گھر ویرانے معلوم ہوتے ہیں اور مکانات (لوٹ مار کرنے والوں کے لیے) "خوانِ مفت" کا حکم رکھتے ہیں۔ جو لوگ گُم نامی کے گوشوں میں چھپے ہوئے تھے، وہ گروہ در گروہ خنجر بہ کف زینی آرایش اور بے شرمی کا مظاہرہ کرتے پھرتے ہیں۔ امن پسند اور نیک نہاد لوگ گھر سے بازار تک آتے ہوئے راستے میں بیسیوں جگہ عاجزی اور مغلوبیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ لٹیرے دن میں دلیری کے ساتھ لوٹ مار میں مصروف ہیں اور رات میں ریشمی بستروں پر محوِ خواب۔

بڑے بڑے عالی خاندان لوگوں کے گھروں میں چراغ جلانے کے لیے تیل نہیں۔

اندھیری رات میں جب پیاس کی شدت بڑھتی ہے، بجلی چمکنے کے منتظر رہتے ہیں کہ یہ دیکھیں کہ کوزہ کہاں رکھا ہُوا ہے اور گلاس کدھر ہے۔

(زمانے کی) اس بے نیازی و بے امتیازی کو کیا کہوں کہ وہ کم رُتبہ لوگ، جو سارا دن مٹی بیچنے کے لیے زمین کھودتے تھے، اُن کو مٹی میں سونے کے ٹکڑے مل گئے اور جن لوگوں کی محفل میں رات میں آتشِ گل سے چراغ روشن رہتے تھے، اندھیرے گھروں میں ناکامی و نامرادی کے غم میں مبتلا ہیں۔

کوتوالِ شہر کی زن و دختر کے علاوہ ساری نازنینانِ شہر کا زیور بُزدل اور سیہ کار رہزنوں کے قبضے میں ہے (زیور و آرایش سے معرّا ہونے کے بعد) ان نازنینوں میں جو ہلکا سا اندازِ ناز باقی رہا تھا، اس کو ان نو دولت گدازادوں نے چھین لیا کہ ان کی خودنمائی کے کام آئے جو محبت کرنے والے نازنینوں کے ناز اُٹھاتے تھے، وہ اب ان بدنہادوں کے ناز اُٹھانے پر مجبور ہیں۔ ان گھٹیا لوگوں کے دماغوں میں غرور اس حد تک سما گیا ہے کہ اگر ان کی حرکات کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کچھ بگولے چکر کھاتے پھر رہے ہیں اور چھچھورے ہر وقت اس طرح نازِ خودنمائی میں محو رہتے ہیں، گویا پانی کی سطح پر کچھ تنکے بہتے چلے جا رہے ہیں۔ بڑے بڑے عالموں اور نام وروں کی آبرو مٹی میں ملا دی گئی اور جن لوگوں کے پاس نہ دولت تھی نہ عزّت، وہ بے اندازہ زر و جواہر اور عزت و آبرو کے مالک ہیں۔ جس کا باپ گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا، وہ ہوا کو اپنا خادم سمجھ رہا ہے۔ جس کی ماں پڑوسی کے گھر سے آگ مانگ کر لاتی تھی وہ آگ پر حکم چلانے کا مدّعی ہے۔ کمینے، آگ اور ہوا پر حکومت کرنا چاہتے ہیں اور ہم ان پریشان حال لوگوں میں سے ہیں، جو صرف سکون و آسایش کے چند لمحوں اور انصاف کے خواہش مند ہیں ؎:

میرا درد بھرا دل تمھارے نزدیک ایک قصّہ ہے اور بس، لیکن
اس کو سُن کر ستاروں کی آنکھوں سے اشکِ خون جاری ہوجائیں گے۔

ڈاک کا انتظام درہم برہم ہوگیا، جس کے سبب سے بہت سے کام رُک گئے ہرکاروں نے آنا جانا اور ڈاک لے جانا بند کردیا۔ ڈاک میں پیام بجنسہٖ پہنچانے کی گنجایش نہیں ہوتی

بان خطوط کی آمد و رفت کا قاعدہ ہے ۔ مگر اس محکمے کی ایک اور شاخ (ٹیلی گراف) ہے کہ نہ مضراب کی جنبش ، بلکہ جنبش کی مضراب سے جو اس سے پیدا ہوتی ہے ہزاروں پیام (خبریں) اندر سے باہر نکلتے ہیں (پہنچتے ہیں) ۔

(جو لوگ) مذہب اور قانون کے بے حد پابند ہیں ، انصاف کو نظر انداز نہ کریں اور بتائیں کہ اس سارے انتظام کا درہم برہم ہو جانا ، خدا کی بخشی ہوئی دولت کا لٹ جانا ، ڈاک کا نظام درہم برہم ہو جانا اور دوستوں کے حالات معلوم نہ ہونا ، کیا یہ ساری باتیں اس لائق نہیں کہ ان کا ماتم کیا جائے اور آنسو بہائے جائیں ۔ بڑے بڑے بہادروں کا یہ حال ہو جائے کہ وہ اپنے سایے سے ڈریں ، سپاہی بادشاہ اور درویش ہر ایک پر حکومت کرنے لگیں ، کیا یہ صورتِ حال لائقِ افسوس نہیں ؟ ان روح فرسا مصائب پر آنکھیں آنسو نہیں بہائیں گی ؟ اور کیا اس نوحہ گری پر لعن طعن کرنا ، اس ماتم سرائی پر طنز کرنا اور اس گریہ و زاری پر ہنسنا جائز ہے ؟ اور کیا ان پُر آلام حالات سے اظہارِ بے زاری کو ضعفِ ایمان اور نادرستیِ مذہب سمجھا جائے گا ؟ ۔ :

میں شعر و سخن کے جواہر سے کیا دل لگاؤں جب کہ آہِ گرم سے میرے دل پر ہزاروں آبلے پڑ گئے ہیں ۔ میرا دل بجھ چکا ہے اور قویٰ اس حد تک جواب دے چکے ہیں کہ اب مجھ کو نہ سزا کا غم ہے نہ جزا کی خوشی ۔

اس سرگذشتِ پُر مصیبت کا مارا ہوا یہ اسیرِ قیدِ بستر (تنہائی) اس رودادِ غم کو پھر شروع کرتا ہے ۔ جب پہلی بار وہ گم راہِ جنگ جو آئے تو جو خزانہ وہ اپنے ساتھ لائے تھے ، خزانے میں جمع کر دیا اور اپنے سر شاہی آستانے پر جھکا دیے ۔ جلد ہی زمانے نے کچھ ایسا انتظام کیا کہ ہر طرف سے فوجیں جمع ہونا شروع ہو گئیں اور اس سرزمین (دہلی) کی طرف روانہ ہو گئیں ۔ بادشاہ جب فوج کا انتظام نہ کر سکا ، فوج نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بادشاہ مجبور ہو کر رہ گیا ۔:

" فوج نے بادشاہ کو اپنے حلقے میں لے لیا ، جیسے چاند کو گہن لگ جائے ۔

ماہِ نو گہن میں نہیں آتا۔ گہن تو چودھویں رات کے چاند کو لگتا ہے۔
بادشاہ اُس چاند کی طرح تھا جس کو گہن لگ گیا ہو، وہ ماہِ کامل
نہیں تھا۔"

میں نے اس بات کا ذکر نہیں کیا، حالاں کہ یہ بات بیان کرنے کے لائق تھی کہ یہ شہرت طلب جنگ جو جس مقام سے چلے وہاں کے قید خانے کا دروازہ کھول دیا اور قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ وہ پُرانے قیدی جنھوں نے نئی نئی آزادی پائی تھی، شاہی دربار میں آئے، سجدہ کیا اور کسی علاقے کی صوبے داری چاہی۔ آقاؤں سے بھاگے ہوئے غیر وفادار غلاموں نے آستانِ شاہی کو بوسہ دیا اور کسی سرسبز علاقے کی حکومت کے طلب گار ہوئے۔ کوئی نہیں کہتا ہے اور میں بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہر خواہش مند کو حاضر ہونے کی اجازت اور ہر پناہ مانگنے والے کو پناہ کیوں دے دی جاتی ہے؟ بس یہ زمانے کی بُلعجبی ہے۔

اب دہلی کے اندر اور باہر تقریباً پچاس ہزار سواروں اور پیادوں کی فوج پڑی ہوئی ہے۔ صاحبانِ علم و دانش انگریزی حکّام کے قبضے میں اس وسیع شہر کا کوئی علاقہ نہیں ہے، صرف شہر کے جانبِ مغرب ایک پہاڑی پر ان کا قبضہ ہے۔ یہ پہاڑی شہر سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ (انگریزوں نے) نہایت ہنرمندی سے اس جگہ پر مورچہ قائم کر کے ایک مضبوط قلعہ سا بنا لیا ہے اور اس کے چاروں طرف کئی اژدہا صفت، رعد خروش توپیں لگا دی ہیں اور استقلال کی مدد سے اس عالمِ پریشانی میں اطمینان (کی دولت) حاصل کر لی ہے۔

شہر کی فوج نے جو میگزین اسی شہر سے حاصل کیا تھا، اس میں سے چند توپیں شہر کی فصیل پر جما دی ہیں اور اس طرح اپنے آپ کو جنگجو سرداروں کا حریف فرض کر لیا ہے۔ توپوں اور بندوقوں کے دھوئیں سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے اور اس سے اولے برس رہے ہیں۔ رات دن دونوں طرف سے گولہ باری ہوتی ہے، جیسے اُوپر سے پتھر برس رہے ہوں۔ مئی جون کی گرمیاں ہیں۔

دھوپ کی تیزی روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ آفتابِ برجِ ثور دوزخ کی طرح آتش افروزی میں مشغول ہے۔ معلوم ہوتا ہے خود بھی اسی آگ میں جُھنا جا رہا ہے۔ جو لوگ سرد ہوادار مکانوں میں آرام و آسایش کے ساتھ رہتے تھے۔ دن بھر دھوپ میں جلتے ہیں اور راتیں انھیں جلتے ہوئے پتھروں پر پیچ و تاب کے عالم میں بسر کرتے ہیں۔ اسفندیار اس میدانِ جنگ میں ہوتا تو رُوئیں تنی کے باوصف اس کی ہمّت و جواں مردی ہوا ہو جاتی۔ اگر رستم اس داستان کو سُن لیتا تو جی چھوڑ دیتا۔ (شہر کی فوج کے) مختلف مقامات سے آئے ہوئے سپاہی دن چڑھے شیر دل انگریزوں سے لڑنے کے لیے جاتے ہیں اور سورج ڈوبنے سے پہلے ہی واپس آ جاتے ہیں بیرونِ شہر کی داستانِ شب و روز تو یہ تھی، اندرونِ شہر (کیا ہو رہا تھا اس سلسلے میں) ایک دن کا قصہ سُننے کے لائق ہے:

میرے ساز کے تاروں میں وہ نغمے پنہاں ہیں جن سے چنگاریاں برستی ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ مغنی ان کی زد میں نہ آ جائے میری زبان پر وہ داستان ہے، جس سے میرے دل پر خنجر چلنے لگتے ہیں۔

ایک شخص جس کے دماغ میں بے جا پندار اور تکبّر کے خیالات بھرے ہوئے تھے درپردہ اپنے آقا اور مربّی کا دشمن بن گیا۔ اس خیال سے کہ اگر یہ واقف کار اور رازداں زندہ رہے گا تو میں نے جو خزانہ (ناجائز طریقوں سے) جمع کیا ہے۔ اس کا راز کھل جائے گا، ہمیشہ نقصان پہنچانے کی تدبیریں سوچتا تھا اور یہ بات مشہور[1]

---

[1] غالب نے شیو نرائن کے نام ۱۲ رجون ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے کہ "بہ نسبت حکیم احسن اللہ کے جو بات مشہور رہے، وہ محض غلط ہے۔" لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے بعض معاصر شہادتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ "یہ صحیح نہیں ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں کے خلاف بدگمانی بے اصل تھی۔"

(غالب اور ابوالکلام: ص ۱۶۵)۔

کر کے کہ حکیم احسن اللہ خاں انگریزوں کے خیر خواہ اور طرف دار ہیں، فوج کے افسروں کو ان کی طرف سے بھڑ کا تا رہتا تھا۔

ایک دن کچھ لوگ (حکیم احسن اللہ خاں کو) قتل کرنے کے لیے ان کے محل پر چڑھ دوڑے۔ حکیم صاحب اس وقت قلعے میں بادشاہ کے پاس تھے۔ چند آشفتہ سر قلعے میں گئے اور حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ بادشاہ نے انتہائی محبت و بندہ پروری سے (حکیم صاحب کو بچانے کے لیے) اپنے آپ کو ان پر گرا دیا، اس طرح حکیم صاحب[1] بچے۔

---

[1] حکیم احسن اللہ خاں کے بارے میں سرسید احمد خان کا بیان ہے کہ حکیم صاحب کو کمالِ عزت و توقیر کے ساتھ، جو پہلے والیِ فیروز پور جھرکہ، پھر والیِ جھجر، اور از اں بعد محمد اکبر شاہ بادشاہِ دہلی کے معالج خاص رہے، رفتہ رفتہ بہادر شاہ ظفر کی طبیعت پر یہاں تک تصرف ہوا کہ:

"کوئی امر جزوی و کلی بے مشورہ و صلاح اس صاحب تدبیر صائب کے وقوع میں نہیں آسکتا، وہ امر اگرچہ متعلقِ منصبِ وزارت ہی ہو لیکن سبحان اللہ اس توصلہ فطرت عالی پر ناز کرنا چاہیے کہ ہر چند ترقی مدارج یہاں تک ہے کہ فقیر و قطمیر قلعۂ مبارک صرف اسی والا درجہ کی ذات پر موقوف اور مدار رج جمیع امور سرکار بادشاہی کا اسی بلند اقتدار پر منحصر ہے خُلق کو اس مرتبے پر وسیع کیا ہے کہ ہر ادنی کی کارروائی میں وسعت سے زیادہ مصروف ہونا اور ہر صاحبِ غرض کے التماس کو بدل متوجہ ہو کر سماعت کرنا۔ اہالیِ شہر سے کم ہوگا کہ ان کو اپنا محسن نہ سمجھتا ہو۔"

(آثار الصنادید، طبع اوّل: مطبع سید الاخبار، ۴۷-۱۸۴۶ء، باب چوتھا)

غالب نے بھی حکیم صاحب کو اپنا "محسن" بتایا ہے (بہ نام تفتہ: ۱۶ دسمبر ۱۸۵۸ء)

ایک دوسرے خط میں غالب نے حکیم احسن اللہ خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"پروردگار اس بزرگوار کو سلامت رکھے کہ قدر دانِ کمال، بلکہ حق تو یوں ہے کہ خیرِ محض ہے۔"

(بہ نام شفق، اکتوبر ۱۸۵۳ء)۔

جان تو بچ گئی، لیکن یہ فتنہ اُس وقت تک ختم نہیں ہُوا، جب تک کہ ان کا سارا گھر تباہ نہیں ہوگیا (حکیم صاحب کا) گھر (جو خوبصورتی و آرایش میں) نگارخانہ چین کی طرح تھا لوٹ لیا گیا۔ ایوان کی چھت کو آگ لگا دی گئی۔ چھت کے شہتیر اور منقش تختے جل کر راکھ ہوگئے۔ دیواریں سیاہ پڑ گئیں[1]، گویا وہ محل اس غم میں سیاہ پوش ہوگیا تھا:

آسمان کی مہربانی سے دھوکا نہ کھانا۔ یہ بے وفا جس شخص کو آغوشِ محبت میں جگہ دیتا ہے۔ اس کو کشمکش و عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

بُرے سے بُرا غلام اپنے آقا سے اس طرح پیش نہیں آسکتا بشرطیکہ وہ ولدالحیض

---

[1] "یہاں (دہلی) کا حال یہ ہے کہ مسلمان امیروں میں تین آدمی (ان میں سے ایک) حکیم احسن اللہ خاں، سو اُن کا یہ حال ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں۔ مع ہذا یہاں کی اقامت میں تذبذب۔ خدا جانے کہاں جائیں، کہاں رہیں"

(بہ نام شیو نرائن، ۱۲ر جون ۱۸۵۹ء)

"حکیم جی (احسن اللہ خان) کو اُن کی حویلیاں مل گئی ہیں۔ اب وہ مع قبائل ان مکانوں میں جا رہے ہیں، اتنا حکم ان کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں"

(بہ نام تفتہ، ۵ر نومبر ۱۸۵۹ء)

"حکیم احسن اللہ خاں کے مکاناتِ شہر ان کو مل گئے اور یہ حکم ہے کہ شہر سے باہر نہ جاؤ، دروازے سے باہر نہ نکلو، اپنے گھر میں بیٹھے رہو"

(بہ نام حسین مرزا، ۹ر نومبر ۱۸۵۹ء)

"حکیم صاحب پر سے وہ سپاہی جو اُن کے اوپر متعین تھا، اُٹھ گیا اور ان کو حکم ہوگیا کہ اپنی وضع پر رہو، مگر شہر میں رہو۔ باہر جانے کا اگر قصد کرو، تو پوچھ کر جاؤ اور ہر ہفتے میں ایک بار کچہری میں حاضر ہُوا کرو"

(بہ نام غلام نجف خاں، یکم اپریل ۱۸۵۸ء)

نہو۔ یہ خبیث، نمک حرام جس کے منہ پر چیچک کے داغ ہیں، بے حیائی کے سبب سے جس کی آنکھیں پھیل گئی ہیں اور دہانہ فراخ ہو گیا ہے، اپنے آپ کو زہرہ و مشتری کی طرح سمجھتا ہے۔ ہر طرف کو لٹکے مٹکاتا ہوا، انداز دکھاتا ہوا گزرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوش خرامی میں کبک و تدرو کو شرماتا ہے۔ میں نے اس کا نام اس لیے نہیں لکھا کہ وہ ایک گدا زادۂ گم نام ہے۔ میں اس پر لعنت بھیج کر جو داستان کہہ رہا تھا اس کو پھر شروع کرتا ہوں۔

فوجیں ہر طرف سے آ آ کر جمع ہو رہی تھیں۔ بادشاہ کا نام لگا ہوا تھا، اس وجہ سے دور دور کے سردارانِ فوج اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ فرخ آباد کے نامور (سردار) تفضل حسین خان نے جن کو کبھی بادشاہ سے علاقۂ نیازمندی نہیں تھا، دور ہی سے آستانِ شاہی کو سجدہ کیا اور خط میں اپنے آپ کو نیازمندِ قدیم لکھا۔

خان بہادر خان نے جو گمراہ، شہرت طلب تھا اور جو بریلی میں کچھ لشکر جمع کر کے سردار بن بیٹھا تھا، ایک سو ایک اشرفیاں، نقرئی ساز و سامان سے آراستہ ہاتھی اور گھوڑا بارگاہِ شاہی میں بھیجا۔

چشمِ بد دور خورشید نشان نواب یوسف علی خان بہادر فرمان روائے رام پور نے جو اس علاقے میں باپ دادا کی جانشینی (کا حق ادا کر رہے) ہیں اور انگریزی حکومت کے ساتھ ان کا رشتۂ دوستی اتنا مضبوط ہے کہ زمانہ ہزار برس میں بھی کسی طریقے سے اس کو نہیں توڑ سکتا، مجبوراً صرف زبانی پیام بھیج کر لوگوں کی زبان کو بند کیا۔

لکھنؤ میں جب فوج نے (انگریزوں) سے رشتۂ تعلق توڑ دیا، (بیش تر) انگریز (دشمنی کی) اس آگ سے بچ کر دوسرے مقامات پر اپنے متعلقین کے پاس چلے گئے، لیکن (فوج کے) چند سرداروں نے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر بیلی گارد میں قیام کیا، جو لکھنؤ کا ایک مشہور مقام ہے اور بہادری کے ساتھ دروازے بند کر لیے۔

شرف الدولہ نے جو بڑے واقف کار، اور معاملات کو سمجھنے والے تھے اور جو نوابانِ اودھ کے زمانے میں وزارت کے عہدے پر سرفراز تھے۔ اس کم تعداد لیکن باشان وشوکت گروہ (انگریز) کو نظرانداز کر کے واجد علی شاہ کے دس سالہ لڑکے کو تختِ حکومت پر بٹھا دیا اور اس کو شہنشاہِ ہندوستان کا وزیر اور اپنے آپ کو پیش کار اور نائب وزیر فرض کر لیا۔ اس نامور شخص (شرف الدولہ) نے گویا ہما کو گرفتارِ دام کر لیا تھا۔ جب یہ سارا کام مکمل کر لیا، ایک منتخب شخص کو مناسب پیشکش کے ساتھ (دہلی) روانہ کر دیا۔ قاصد آیا، دو روز آرام کیا۔ پھر بارگاہِ شاہی میں حاضر ہوا۔ دو صبا رفتار گھوڑے، دو کوہ صفت ہاتھی، ایک سو اکیس اشرفیاں اور ایک سنہری کلاہ جو رنگ برنگ کے نایاب موتیوں سے مزین تھی، پیش کی اور ایک جوڑ بازو بند جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے، ملکہ کی خدمت میں محل میں بھیجا۔

یہ ساری شان وشوکت روشنیِ چراغ کی طرح (جلد ختم ہونے والی) تھی، گویا زمانے کی نظر بد اسی رونق کی منتظر تھی۔ حکومتِ اودھ کی اس پیش کش کے بعد آئینہ وسکندر اور جام وجمشید کی ساری داستان ختم ہوگئی، (باغی) فوج کے شور غل سے نصیب کی آنکھیں کھلی ہی تھیں کہ پھر مُند گئیں۔ نہیں نہیں شہنشاہ کی قسمت کا ستارہ اتنی بلندی پر پہنچ گیا کہ دنیا والوں کی نگاہوں سے پنہاں ہو گیا۔ ؎[1]:

جب قسمت کا ستارہ گردش میں آجاتا ہے تو تاج کی بھی کوئی قیمت
نہیں رہتی۔ تم نہیں دیکھتے کہ تغیر کے خوف سے سورج آسمان پر کیسا
کانپتا رہتا ہے۔

جس دن وہ سبز قدم قاصد آیا اور بادشاہ نے بندہ پروری فرمائی، اُس کے کل کو پیر کے دن قمری مہینے کی چوبیس اور ستمبر کی چودہ تاریخ کو پہاڑی کے دامن

---

[1] یہاں اس مضمون پر مشتمل رباعی غالب کے سہو سے رہ گئی تھی۔ غالب نے تفتہ کے نام ۲۸ اگست ۱۸۵۸ء کے ایک خط کے ذریعے اسے یہاں بتاکید اضافہ (بقیہ اگلے صفحے پر)

ہیں بیٹھے ہوئے (انگریزوں) نے شان وشکوہ کے ساتھ کشمیری دروازے پر ایسا حملہ کیا کہ کالوں کی فوج کو بھاگتے ہی بنی۔ ع:

مئی کے مہینے میں اگر انصاف دہلی سے اُٹھ گیا تھا تو ستمبر میں ظلم وستم کا دور ختم ہو گیا اور انصاف کا زمانہ واپس آگیا۔ چار مہینے چار دن کے بعد سورج آب وتاب کے ساتھ طلوع ہوا۔ دہلی دیوانوں سے خالی ہو گئی۔ عقل مند (انگریزوں) نے بہادری کے ساتھ اس پر قبضہ کر لیا۔

اگرچہ ۱۱ مئی سے ۱۴ ستمبر تک ۴ مہینے ۴ دن کا وقفہ ہے، لیکن اس بنا پر کہ پیر کے دن شہر (انگریزوں) کے ہاتھ سے نکلا تھا اور پیر کے دن ہی قبضے میں آیا، ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہر کا ہاتھ سے نکل جانا اور پھر قبضے میں آجانا یہ دونوں کام ایک ہی دن میں ہوئے

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) کر دیا۔ شیونرائن کے نام ۱۲ راگست ۱۸۵۸ء کے خط میں بھی اس رباعی کو ضرور بالضرور درج کرا دینے کی ہدایت ملتی ہے۔ رباعی یہ ہے ؎:

جائیکہ ستارۂ شوخ چشمی ورزد

افسر افسار و گرزن ارزن ارزد

خرشید ز اندیشۂ جادر گردش

بر چرخ نہ بینی کہ چساں می لرزد

؎ انتخاب غالب (۱۸۶۵ء) میں اسی بات کو بطورِ لطیفہ غالب نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"۱۸۵۷ء میں جو میرٹھ سے باغی ترک سوار اور تلنگے دلّی میں آئے اور انھوں نے شہر اور قلعے پر اپنا قبضہ کر لیا تو وہ مئی کے مہینے کی گیارہ تاریخ تھی اور دوشنبے کا دن تھا۔ قضارا جس دن ستمبر ۱۸۵۷ء میں دلّی فتح ہوئی اور سرکش لوگ بھاگ گئے وہ بھی دوشنبے کا دن تھا۔ دو ایک دوستوں نے کہا کر دیکھو کیا اتفاق ہے۔ دوشنبے کو دلّی جانا اور پھر دوشنبے کو ہاتھ آنا۔ میں نے کہا کہ یہ ایک رمز ہے اس کو یوں تصور کرو کہ جس دن شکست کھائی اسی دن فتح پائی۔ یعنی دیر نہ لگی، ایک دن میں تدارک ہو گیا۔"

مختصر یہ کہ فاتحین نے راستے میں جس شخص کو پایا قتل کر دیا۔ شہر کے عالی خاندان اور صاحب عزت افراد عزت اور آبرو کو بچانے کے لیے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہے۔

شہر میں بد باطن (باغیوں) کی تو فوج تھی۔ اس میں سے کچھ لوگوں نے بھاگ جانے کی ٹھان لی، اور کچھ لوگوں نے غرور میں آکر لڑنے کی تیاری کی۔ خبیث اور آوارہ لوگوں کا یہ گروہ شیر دل فاتحین سے اُلجھ پڑا۔ یہ لوگ اپنے خیال میں تو دشمنوں کو قتل کر رہے تھے، لیکن میرے خیال میں وہ شہر کی عزت و آبرو کو برباد کر رہے تھے۔

دو تین دن تک کشمیری دروازے سے لے کر چوک تک تمام راستے میدانِ جنگ بنے رہے۔ دہلی دروازہ، ترکمان دروازہ، اجمیری دروازہ یہ تینوں دروازے اس فوج کے قبضے میں رہ گئے۔ مجھ مردہ دل کا غم کدہ (مکان) وسطِ شہر میں کشمیری دروازے اور دہلی دروازے کے درمیان ہے اور میرے مکان سے ان دونوں دروازوں کا فاصلہ برابر ہے۔ اگرچہ گلی کا دروازہ بند کر لیا گیا تھا لیکن ابھی اتنا حوصلہ باقی تھا کہ دروازہ کھول کر باہر چلے جاتے تھے اور کھانے پینے کا سامان لے آتے تھے۔

میں نے ابھی کہا کہ غضب ناک شیروں (انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے ہی کچھ بے سر و سامان لوگوں کو قتل کرنا اور چند مکانوں کو جلانا جائز سمجھا۔ ہاں جس مقام کو لڑ کر فتح کرتے ہیں، لوگوں پر ایسی ہی سختیاں کی جاتی ہیں۔

اس غصے اور دشمنی کو دیکھ کر لوگوں کے مُنہ فق ہو گئے۔ بے شمار مرد عورتوں کے گروہ جن میں معمولی لوگ بھی تھے اور صاحب حیثیت بھی، ان تینوں دروازوں سے باہر نکل گئے۔ شہر کے باہر جو چھوٹی چھوٹی بستیاں اور مقبرے تھے، اُن میں پناہ گزیں ہو گئے۔ اس خیال سے کہ کسی مناسب وقت پر شہر میں واپس آجائیں گے یا کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں گے۔

میرے دل پر نہ خوف و دہشت کا اثر ہوا اور نہ پائے استقلال کو جنبش ہوئی۔[1]

---

[1] بے خوفی، اطمینانِ قلب اور استقامت و جراتِ کردار کا اظہار (بقیہ اگلے صفحے پر)

میں نے کہا کہ میں گنہ گار تو ہوں نہیں کہ سزا پاؤں ۔ انگریز بے گناہوں کو قتل نہیں کرتے ہیں اور شہر کی آب و ہوا ناساز گار نہیں ہے ۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ ان بدخیالیوں کو دل میں جگہ دوں اور ادھر اُدھر بھاگتا پھروں ۔

(اب) مکان کے ایک گوشے میں بے سرو سامانی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں (اس تنہائی میں) قلم میرا رفیق ہے ۔ آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں اور قلم سے دردناک الفاظ ٹپکتے ہیں ۔ ۔ ۔:

میں بالکل مفلس اور بے سرو سامان ہوں خداوند اب تک یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتا رہوں گا کہ یہ جواہر (کلام) میری ہی کان کے ہیں ۔

ازل کا لکھا ہوا بدل نہیں سکتا ۔ ازل میں قسمتیں لکھی جا چکی ہیں ہر ایک کو نوشتۂ قسمت کے مطابق سرو ساماں عطا کیا گیا ہے ۔ مصیبتیں اور راحتیں اسی حکم ازل کا نتیجہ ہیں ۔ بہتر یہ ہے کہ بے دلی و بے جگری کو چھوڑ کر جس طرح بچے ہر تماشے کو خوشی کے ساتھ دیکھتے ہیں ، ہر لمحہ بدلنے والے زمانے کی حیرت فزا نیرنگیوں کو اس بڑھاپے میں خوشی کے ساتھ دیکھتا رہوں ۔

جمعے کے دن محرم کی ۲۶ تاریخ تھی اور ستمبر کی ۱۸ دن چڑھے دنیا کو خوشی بخشنے والا آفتابِ عالم تاب برجِ سنبلہ کے ایک درجے میں پہنچ کر کسوف میں آگیا اور اہلِ عالم کی چشم جہاں بیں پر تاریکی نے ظلم ڈھایا ۔ گمراہ باغی اندرون و بیرونِ شہر سے خنزیروں کی طرح بھاگنے لگے اور فاتحین نے شہر اور قلعے پر قبضہ کر لیا ۔ کشت و خون اور پکڑ دھکڑ کی (آفت) اس گلی تک آگئی ، خوف سے لوگوں کے دل دہل گئے ۔

اس گلی میں صرف دس بارہ گھر ہیں اور راستہ ایک ہی طرف سے ہے (گلی اندر سے بند ہے ، گلی میں کوئی کنواں نہیں ہے (اس گلی کے) زیادہ تر رہنے والے چلے گئے ہیں ۱

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) محض تصنع اور دکھاوا ہے ۔ غالب کے خطوط اس کی تردید کرتے ہیں اور ایک بالکل مختلف تصویر پیش کرتے ہیں ۔

(اس طرح کہ) عورتیں بچّوں کو چھاتی سے لگائے ہوئے تھیں اور مردوں کے کاندھوں پر سامان کی گٹھریاں تھیں۔ کچھ لوگ باقی رہ گئے تھے۔ ہم سب نے مل کر گلی کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور پتھر چن دیے۔ گلی سربستہ تو تھی ہی، دربستہ بھی ہو گئی (ایک راستہ تھا وہ بھی بند ہو گیا)۔ ع:

میری روح جسم سے زیادہ خستہ و درماندہ ہو تو تعجب کی بات نہیں
کیوں کہ میرا دل قید خانے کے گوشے سے بھی زیادہ تنگ ہے۔

(اتفاقاً) اس مصیبت میں کام بننے کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ فلک مرتبہ مریخ حشم راجہ نرندر سنگھ بہادر فرماں روائے پٹیالہ اس جنگ میں (انگریز) فاتحین کے ساتھ ہیں اور ان کی فوج شروع سے انگریزی لشکر کی مددگار ہے۔ راجہ کے چند ملازمین خاص جو اُن کی سرکار میں اونچے عہدوں پر ہیں اور شہر کے نامور اور قابل عزت لوگوں میں سے ہے (میری مراد ہے) حکیم محمود خاں، حکیم مرتضیٰ خاں، حکیم غلام اللہ خاں (سے) جو حکیم شریف خاں جنت مکان کی اولاد میں ہیں، اس کوچے میں رہتے ہیں، دور تک اُن کی دو رویہ عمارتیں چلی گئی ہیں۔

میں دس سال سے ان میں سے ایک صاحب جاہ و ثروت کا پڑوسی ہوں۔ ان تین حضرات میں سے اوّل الذکر (حکیم محمود خاں) متعلقین اور اہلِ خانہ کے ساتھ اپنے بزرگوں کی طرح باعزّت زندگی بسر کرتے ہیں اور باقی دونوں حضرات پٹیالہ میں راجا کی مصاحبت میں کامیابی و کامرانی کے ساتھ رہتے ہیں۔ چونکہ دہلی کی فتح متوقع تھی، راجا نے ازراہِ بندہ پروری طاقتور اور جنگجو (انگریزوں) سے طے کر لیا تھا کہ جب (شہر) فتح ہو گا، اس گلی کے دروازے پر محافظ مقرر کر دیے جائیں گے تاکہ انگریز فوجی جن کو گورا کہتے ہیں، گھروں کو نقصان نہ پہنچائیں[1]

---

[1] "میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایے پر رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا، دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر (بقیہ اگلے صفحے پر)

اثنائے کلام میں کبھی کبھی (مجبوراً) چند دوسری باتوں کا تذکرہ بھی آجاتا ہے۔ ان ضمنی باتوں کے بعد (میں) پھر اس موضوع پر آتا ہوں۔ سارے شہر میں ۱۵ ستمبر سے ہر گھر کا دروازہ بند ہے۔ دُکاندار اور خریدار دونوں غائب ہیں۔ نہ گندم فروش ہے کہ گیہوں خریدیں۔ نہ دھوبی ہے کہ کپڑے دُھلنے کو دیں۔ حجّام کو کہاں ڈھونڈیں کہ سر کے بال تراشے اور مہتر کو کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں کہ صفائی کرے۔ بہرحال جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے، ان پانچ مہینوں میں (گلی کے لوگ) باہر نکل کر پانی تو برابر لے آتے تھے، کبھی کبھی آٹا وغیرہ بھی مل جاتا تھا، لیکن اس کے بعد یہ صورتِ حال ختم ہوگئی۔ (گلی کا) دروازہ پتھروں سے بند کر لیا گیا اور دلوں کے آئینے پر غم دائم کا غبار چھا گیا:

کوششوں کے سارے ہنگامے ٹھنڈے پڑ گئے۔ اب مصیبتیں،
خون کو آگ کی طرح جلا رہی ہیں۔

گھروں میں کھانے کا جس قدر سامان تھا رفتہ رفتہ ختم ہوگیا۔ پانی اگرچہ بے حد احتیاط سے پیا گیا، لیکن آخرکار کوزے یا گھڑے میں ایک قطرہ نہیں رہا۔ عورتوں، مردوں میں سے کسی میں برداشت کی طاقت نہیں رہی۔ صبر کے ساتھ دن گزارنے اور (اپنے آپ کو) سامانِ خورد و نوش حاصل کر لینے کا فریب دینے کا وقت بھی گزر گیا۔ دو شبانہ روز سب بھوکے پیاسے رہے۔ ت:

افسوس! یہ گریہ و زاری اور ذلت و محتاجی! اور صد حیف یہ بے چارگی اور پریشان حالی و بے سرو سامانی!۔

تیسرے دن جیسا کہ اس سے قبل ذکر آچکا ہے، مہاراجہ (پٹیالہ) کی فوج کے سپاہی آگئے اور پہرہ دینے لگے۔ گلی کے رہنے والوں نے لوٹ مار کرنے والوں کے

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) والیِ پٹیالہ کے۔ راجا صاحب نے صاحبانِ عالی شان (انگریز حکام) سے عہد لیا تھا کہ بروقت غارتِ دہلی یہ لوگ بچے رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجا صاحب کے سپاہی یہاں آبیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ میں کہاں اور شہر کہاں" ۔

خوف سے نجات پائی ۔ ہر چہ بادا باد" کہتے ہوئے پہرے داروں سے باہر جانے کی اجازت چاہی ۔ یہ پہرہ از راہِ دوستی تھا نہ کہ از راہِ دشمنی ، اس لیے یہ کہا گیا کہ چوک کے بازار تک جا سکتے ہیں ۔ چوک کے آگے قتل و خون کا بازار گرم ہے اور راستہ پُر خطر ہے۔

مجبور و پریشاں حال لوگوں نے دروازہ کھول دیا ۔ بھشتی او رمشک کا ملنا ناممکن تھا ، اس لیے ہر گھر سے ایک مرد اور میرے ملازمین میں سے دو شخص گئے ۔ میٹھا پانی دور تھا اور (اتنی) دور جا نہیں سکتے تھے ۔ مجبوراً نیم شور پانی مشکوں اور گھڑوں میں بھر لائے ۔ اس طرح اس نمکین پانی سے وہ آگ بجھی جس کا دوسرا نام پیاس ہے ۔

باہر جانے والے اور پانی لانے والے لوگ کہتے تھے کہ اس گلی میں جس سے آگے جانے کی ہم کو اجازت نہیں ہے ، سپاہیوں نے کچھ مکانوں کے دروازے توڑ ڈالے (ان گھروں میں) نہ تو بورے میں آٹا ملا ، نہ برتن میں روغن ۔ میں نے کہا اچھا بندہ وہ ہے جو برتن ، تھیلے ، آٹے اور تیل کا ذکر نہ کرے ۔ ہماری روزی تو ایسے (روزی رساں) کے ذمے ہے جو ہم کو نظر انداز نہیں کرے گا ۔ خدا کی بخشش کا شکر نہ ادا کرنا شیطنت ہے ۔

آج کل ہم لوگ اپنے آپ کو قیدی سمجھ رہے ہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ بالکل قیدیوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں ۔ نہ تو کوئی آتا ہے کہ کوئی سننے کو بات ملے ، نہ خود باہر جا سکتے ہیں کہ اپنی آنکھوں سے سارے واقعات دیکھیں ۔ یقیناً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے کان بہرے ہیں اور آنکھیں بے نور ۔ اس کشمکش کے علاوہ نہ کھانے کو روٹی ہے نہ پینے کو پانی ۔

ایک دن اچانک بادل آیا ، پانی برسا ۔ ہم نے (صحن میں) ایک چادر باندھ لی اور ایک مٹکا اس کے نیچے رکھ دیا اور (اس طرح) پانی حاصل کیا ۔ کہا جاتا ہے کہ بادل دریا سے پانی لیتا ہے اور زمین پر برساتا ہے (لیکن) اس بار یہ ہما صفت بادل پانی ، چشمۂ حیواں سے لایا ۔ گویا سکندر نے جو چیز اپنی بادشاہت کے دور میں ڈھونڈی تھی ،

مجھ پریشاں حال نے وہ دولت (آب حیات) اس تباہی و بربادی کے عالم میں پائی ہے:

اے غالب! دوست کی طرف سے کبھی کوتاہی نہیں ہوتی (البتہ) وہ اس طرح کام بناتا ہے کہ ہم سمجھ نہیں پاتے ہیں۔

اس موقعے پر میں چاہتا ہوں کہ کچھ اپنی زندگی اور اشغال کے متعلق بھی لکھوں، اس طرح کہ یہ سرگذشت سلسلۂ کلام سے غیر متعلق نہ ہونے پائے:

میں نئے داغوں سے زخم ہائے جگر پر مرہم رکھ رہا ہوں، اور میں نشتر کی مدد سے دل سے پیکان نکال رہا ہوں۔

اس سال میری زندگی کا باسٹھواں سال شروع ہوا (اتنی مدت سے) میں اس دُنیا کی خاک چھان رہا ہوں اور پچاس برس سے شعر و شاعری میں مصروف جگر گدازی ہوں۔ میری عمر پانچ سال کی تھی کہ میرے والد عبداللہ بیگ خان بہادر کا انتقال ہوگیا خدا اُن کی روح پر بے شمار رحمتیں نازل کرے۔ میرے چچا نصراللہ بیگ خاں بہادر نے مجھ کو اپنا بیٹا بنالیا اور لاڈ پیار سے پرورش کی۔ جب میری عمر نو سال کی ہوئی تو میرے چچا جو میرے سرپرست بھی تھے موت کی گہری نیند سو گئے (گویا) میری قسمت سو گئی۔

(میرے یہ) لائق تعریف و صاحب جاہ و حشمت (بزرگ) چار سو سواروں کے سردار، اور جنرل لارڈ لیک بہادر کے وفادار متعلقین میں سے تھے اس فاتح اور سخی سردار کی مہربانی سے وہ آگرے کے قریب دو پرگنوں کے حاکم اور مالک تھے۔ ان کے انتقال کے بعد (وہ) دونوں پرگنے انگریزی حکومت نے واپس لے لیے۔ اس جاگیر کے بجائے میرا اور میرے حقیقی بھائی کا کچھ وظیفہ مقرر کر دیا گیا جو میری آرام و آسایش کا ذریعہ تھا۔ چنانچہ اس سال یعنی ۱۸۵۷ء میں اپریل تک کا وظیفہ کلکٹری دہلی کے خزنے سے میں نے حاصل کیا۔ مئی سے اس خزانے کا دروازہ ہی بند ہوگیا (اب) میں بدنصیبی سے دوچار ہوں اور دل طرح طرح کے خیالاتِ پریشاں کا مسکن ہے۔

اس سے پہلے صرف بیوی تھی، نہ کوئی لڑکا تھا نہ لڑکی۔ تقریباً پانچ سال ہوئے

کرتیں نے اپنی بیوی (جو میری تباہی کی ذمّے دار ہے) کے خاندان کے دو بے ماں باپ کے بچّوں کو لے کر پال لیا ہے ۔ ان شیریں زبان بچّوں سے مجھ کو بے انتہا محبت ہے ۔ اس عالم بے چارگی میں (دونوں بچّے) میرے ساتھ ہیں اور میرے دامن و گریباں کے پھول ہیں ۔

بھائی جو دو سال مجھ سے چھوٹا ہے ، تیس سال کی عمر میں دیوانہ ہو گیا ۔ تیس برس سے وہ اس طرح زندگی گزار رہا ہے کہ نہ کسی کو ستاتا ہے نہ شور و غوغا کرتا ہے ۔ اس کا مکان میرے گھر سے تقریباً دو ہزار قدم کے فاصلے پر ہے ۔ اس کی بیوی اور لڑکیوں نے بچّوں اور کنیزوں کے ساتھ بھاگ جانے ہی میں عافیت سمجھی ۔ گھر کے فاترالعقل مالک اور سارے سامان کو ایک بوڑھے دربان اور ایک بڑھیا کنیز کے ساتھ چھوڑ دیا ۔

اگر میں جادو جانتا ہوتا تب بھی (ان حالات میں) میں کسی کو بھیج کر ان تینوں آدمیوں کو نہ بلوا سکتا تھا نہ سامان منگوا سکتا تھا ۔ یہ بہت بڑا غم ہے اور میرے دل پر اس کا بہت اثر ہے ۔

وہ دونوں نازپروردہ بچے پھل ، دودھ ، مٹھائی مانگتے ہیں ، لیکن ان کی خواہش پوری کرنا میرے بس میں نہیں ۔ افسوس ! افسوس ! اس ایک بات کو کیا کہوں ۔ جب تک زندہ ہوں روٹی اور پانی کی فکر رہے گی اور مرنے کے بعد کفن دفن کی ۔ میں دن رات اس فکر میں رہتا ہوں کہ بھائی نے دن میں کیا کھایا (ہوگا) اور رات میں کیسے سویا (ہوگا) اور (حالات سے) ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا ہوں کہ (بھائی) زندہ بھی ہے یا مصیبتیں (اٹھاتے اٹھاتے) مر گیا ہے ۔ ۔ ۔

---

۱ ۔ زین العابدین عارف (باپ) اور بنیادی بیگم عرف نواب دلھن (ماں) کے بچّوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں سے مراد ہے ۔ عارف ، غالب کی اہلیہ امراؤ بیگم کی بڑی بہن بنیادی بیگم کے صاحبزادے تھے تفصیل کے لیے رجوع کیجیے
ذکرِ غالب ، مالک رام ، طبع چہارم ، ص ۱۶۹ : ۱۷۰

میرے ہونٹوں پر صرف آہ و فغاں نہیں ہے، خدا کی قسم، اس غم سے،

میں جاں بہ لب ہوں۔

جو حالات میں نے بیان کیے یہ دل دکھانے والے ہیں، لیکن جو کچھ میں کہہ نہیں سکا ہوں وہ بھی روح فرسا ہے۔ جو لوگ حالات سے واقف ہیں، میں ان سے توقع کرتا ہوں کہ وہ میری پُر درد داستان کو غور سے سُنیں گے اور سُن کر انصاف کریں گے۔

میں اس بڑھاپے میں چراغِ صبح اور آفتابِ لبِ بام کی مانند ہوں۔ میرا مطلب چراغ کی روشنی اور سورج کی نور افشانی سے نہیں ہے، بلکہ جس طرح صبح کے وقت چراغ کا روغن ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے اور اس کی روشنی ہلکی ہو جاتی ہے اور دن ڈھلے سورج کی چمک دمک ماند پڑنا شروع ہو جاتی ہے، وہی میرا حال ہے۔ دو سال ہوئے کہ میں نے ملکۂ انصاف پسند، فلک رفعت، ستارہ حشم ملکۂ وکٹوریہ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اور ڈاک سے جو دہلی سے براہِ راست بمبئی اور وہاں سے لندن جاتی ہے، آقائے ہنر پرور و حاکمِ نامور لارڈ ڈالن برا بہادر کے حضور میں بھیجا، جو گورنری کے زمانے میں ازراہِ کرم میرے مربی تھے:

راہِ سخن کشودم اگر خود نہ شد کہ بخت

راہم بہ بزمِ بانوئے گیتی ستاں دہد

یہ شعر اُسی قصیدے کا ہے، وہ قصیدہ اسی ردیف قافیے میں ہے۔ کسے خیال تھا کہ ایسا مشکل کام اس آسانی سے بن جائے گا۔ تین مہینے کے بعد اچانک ایک مبارک قدم قاصد اس سرو بوستان سروری (لارڈ ڈالن برا) کا نوازش نامہ لایا۔ یہ خط انگریزی میں تھا نہایت محبت کے ساتھ لکھا تھا کہ قصیدہ ہمارے پاس پہنچ گیا اور ہم نے اس کو ملکۂ معظمہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے متعلقین بارگاہِ شاہی کے سپرد کر دیا۔ اس پُر مسرت پیغام اور مبارک جواب کو تیس دن نہیں گزرے تھے کہ سردار مہربان مسٹر رزلمگٹن بہادر کا گرامی نامہ ڈاک سے آیا، لکھا تھا کہ جو قصیدہ لارڈ ڈالن برا بہادر کے واسطے سے ہمارے پاس پہنچا تھا، اُس کے بارے میں یہ حکم ہے کہ سائل ضابطے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی گزارشات فرماں روائے

ہندوستان کے وسیلے سے ہماری بارگاہ میں پیش کرے۔

حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ایک معروضہ شہنشاہِ انگلینڈ کے نام لکھ کر، سکندر جاہ، فریدوں حشم لارڈ کیننگ نواب گورنر جنرل بہادر کے حضور میں بھیجا۔ اس گزارش نامے میں التماس و آرزو کو اس طرح پیش کیا گیا کہ روم، ایران اور دوسرے ممالک کے بادشاہوں نے شاعروں اور مداحوں کو طرح طرح سے نوازا ہے۔ موتیوں سے منہ بھر دینا، سونے میں تلوانا، گاؤں عطا کرنا، اور انعام دینا، غرض مختلف انداز رہے ہیں۔ اس مداح کی یہ خواہش ہے کہ ملکۂ معظمہ اپنی زبانِ (مبارک) سے مہرِ خواں (خطاب) ارشاد فرمائیں۔ اپنے حکم سے سراپا (خلعت) بخشیں اور اپنے خوان سے چند نان ریزہ (روٹی) کے ٹکڑے عنایت فرمائیں۔ مہرِ خواں اور سراپا کا ترجمہ عربی میں خطاب اور خلعت ہو سکتا ہے اور نان ریزہ کو انگریزی میں پنسن کہہ سکتے ہیں۔

حاکمِ بلند مرتبہ نواب، گورنر جنرل بہادر نے جواب میں میرے دلِ غم زدہ کو بشارتِ مداوا سے شاد فرمایا (موصوف) نے لکھا کہ (وہ) ستائش نامہ انگلستان روانہ کر دیا گیا۔ اس خبرِ مسرت اثر سے میں ایسا مسرور ہوا کہ جامے میں پھولا نہیں سماتا تھا۔

چار ماہ کے بعد میرے خط کے جواب میں فرخ شمائل، عالی نسب مسٹر رسل کلارک بہادر کے خانۂ مشکبار کا لکھا ہوا مودت نامہ (موصول ہوا) اس (جواب نے) اُمیدواری اور آرزومندی کی مدت کو اور بڑھا دیا۔

میں جانتا ہوں کہ اگر ہندوستان کا نظم و نسق (غدر میں) تباہ نہ ہوتا اور ناخدا ترس اور ناشکرے سپاہیوں کے ہاتھوں عدالتیں نہ اُجڑ جاتیں تو گلستانِ انگلستان سے ایسا فرمان صادر ہوتا جس سے مُرادیں پوری ہو جاتیں اور میری آنکھیں اور میرا دل دونوں ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے۔[1]

---

[1] غالب نے "ملکۂ معظمہ ہندوانگلینڈ کی مداحی میں وہ پایۂ بلند دُرتبۂ ارجمند پایا کہ ابتدائے عملداری سرکار سے کسی ہندوستان کے لیے اُس کا دسواں حصہ دیکھنے میں نہیں آیا۔۔۔ آگے ایک قصیدہ ملکۂ معظمہ کی شان

بقیہ اگلے صفحے پر

اب وہ مبارک خطوط جو میری پُرجوش آرزوؤں کی فہرست ہیں اور میرے ہوش و خرد کے بازو کا تعویذ میرے پاس ہیں اور جگر کے چند ٹکڑے جو جوشِ گریہ میں آنکھوں سے ٹپکے ہیں، جگر خراشی و خون فشانی کے نام کے طور پر میرے دامن میں ہیں۔

"میں تیر یا تلوار کا زخمی نہیں ہوں۔ نہ پلنگ و شیر نے مجھے مجروح کیا ہے۔ میں (شدّتِ غم میں) اپنے ہونٹ کاٹتا ہوں اور زبان کو خون آلود کرلیتا ہوں، خونِ جگر کھاتا ہوں اور زندگی سے بیزار ہوں۔"

ستمبر کی تیئیسویں تاریخ کو بُدھ کے روز شہر کی فتح اور گلی کا دروازہ بند کرنے کے سترہویں دن لوگ خبر لائے کہ لوٹ مار کرنے والے، بھائی (مرزا یوسف) کے گھر پر چڑھ دوڑے گلی اور گھر میں لوٹ مار کی۔ دیوانے مرزا یوسف خاں اور دونوں بڑھیا بڈھوں کو زندہ چھوڑ دیا اس بھاگڑ میں دو ہندو کہیں سے آکر (گھر) میں پناہ گزیں ہو گئے۔ بوڑھے دربان اور بڑھیا کنیز (ماما) دونوں نے ان ہندوؤں کی مدد سے کھانے پینے کا انتظام کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔

میں کہا تھا، نظرِ انور سے گزرنے کو ولایت میں بھیجا تھا۔۔ فروری ۱۸۵۷ء میں جناب رسل کلرک صاحب بہادر نے مصنّف کو انگریزی چٹھی لکھی ولایت سے ... کہ تمہارے قصیدے کے انعام کا متعدد زیرِ تجویز ہے۔ بعد صدورِ حکم، انڈیا گورنمنٹ سے اُس کی اطلاع پاؤ گے۔ ناگاہ مئی سنہ مذکور میں سرزمینِ ہند پر آسمان ٹوٹا۔ فوجِ حوادث نے کل متاعِ اُمید کو لوٹا۔ بہتیرے بے گناہوں زیرِ آسیائے گردوں پسے، جس طرح چکّی کے پاٹ تلے گیہوں پستا ہے۔ کیا آغاز تھا کیا انجام ہُوا کہ ہر مترصد بھی ناکام ہوا۔ نواب صاحب (مرزا اسد اللہ خاں غالب) کا وہ معاملہ گویا خواب تھا جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا۔ عجب نہیں کہ پرورشِ سلطانی پھر توجہ فرمائے۔ عین حالتِ یاس میں لطفِ خسروانی سے اُمید بر آئے۔"

(اودھ اخبار، لکھنؤ، ۱۲ مارچ ۱۸۶۲ء، ص ۱۸۵)

لہ انگریز حکام کی ان تحریروں کو غالب اپنے حق میں سرٹیفکیٹ خیال کرتے تھے۔ غالب نے والیِ رامپور کے نام ہفتم نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں اسی حصّۂ کتاب کی طرف اشارہ کیا ہے۔

واضح ہو کہ اس پکڑ دھکڑ اور قیامت کے عالم میں جس طرح ہر کوچے اور بازار میں اس مصیبت کی صورت یکساں نہیں ہے، اسی طرح قتل کرنے اور لوٹ مار میں بھی سب سپاہیوں کا انداز ایک نہیں ہے۔ اگر کوئی (سپاہی) رحم کرتا ہے یا دوسرا سختی کرتا ہے تو یہ ذاتی رحم دلی، اور سنگ دلی کا نتیجہ ہے۔

میں جانتا ہوں کہ اس یلغار میں حکم یہ ہے کہ جو شخص اظہارِ اطاعت کرے اس کو قتل نہ کیا جائے مال چھین لیا جائے اور جو شخص مقابلہ کرے، مال کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی بھی چھین لی جائے۔ مقتولین کے متعلق یہ خیال ہے کہ انھوں نے یقیناً اطاعت نہیں کی، اسی وجہ سے ان کو قتل کر دیا گیا۔ مشہور بھی یہی ہے کہ عموماً سامان لوٹ لیتے ہیں قتل نہیں کرتے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے اور وہ بھی صرف دو تین کوچوں میں کہ پہلے قتل کر دیا پھر سامان لوٹ لیا (البتہ) بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کا قتل روا نہیں رکھا ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر توسنِ خامہ رُک گیا۔ اب میں ایک پُر زور آواز بلند کروں کہ سمندِ قلم قدم آگے بڑھائے۔ اے انصاف کی تعریف کرنے والے اور ظلم کو بُرا کہنے والے حق پرستو! اگر ظلم کی مذمت اور انصاف کی تعریف میں تمہاری زبان اور تمہارا دل ایک ہے تو خدا کے واسطے ہندوستانیوں کا طرزِ عمل یاد کرو۔ اس کے بغیر کہ پہلے سے دشمنی کی کوئی بنیاد اور عداوت کا کوئی سبب ہو (ان ہندوستانیوں نے) اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اُٹھائی۔

بےچاری عورتوں اور گہوارے میں کھیلتے ہوئے بچوں کو قتل کیا (حالانکہ) سب جانتے ہیں کہ اپنے آقا سے بے وفائی کرنا گناہ ہے (اس کے مقابلے میں) ان انگریزوں کو دیکھو کہ جب دشمنی (کا بدلہ لینے) کے لیے لڑنے اُٹھے اور گناہ گاروں کو سزا دینے کے لیے لشکر آراستہ کیا، چونکہ (وہ) شہر والوں سے بھی برہم تھے تو موقع تو اس کا تھا کہ (شہر پر) قابض ہونے کے بعد کتے بلی (تک کو) زندہ نہ چھوڑتے (لیکن انھوں نے) ضبط کیا۔ (اگرچہ) ان کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی۔ عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔ یہ جو گھربار اور جان مال محفوظ رہنے کی ذمے داری نہیں لی گئی ہے اس

کی وجہ صرف یہ ہے کہ بے گناہوں اور گناہ گاروں میں امتیاز رہے۔ جن لوگوں کو باز پرس کے لیے بلایا گیا ہے، ان کے سوا اور کسی کو حاضر ہونے کی اجازت نہیں دی ہے۔

شہر کے بیش تر لوگوں کو باہر نکال دیا ہے۔ کچھ لوگ بہ دستور اُمید و بیم میں گرفتار (شہر کے اندر) موجود ہیں۔ جو لوگ (شہر سے نکل کر) ویرانوں اور گوشوں میں مقیم ہوئے ہیں، اُن کے بارے میں ابھی کوئی حکم (صادر) نہیں ہوا۔ جو لوگ (شہر سے) باہر نکل گئے ہیں یا جو شہر کے اندر مبتلاے پریشانی ہیں، اُن کے درد کا کوئی مداوا نہیں ہے۔ کاش (شہر کے) اندر رہنے والے اور (شہر کے) باہر بسنے والے ایک دوسرے کی زندگی و موت سے واقف ہونے کہ بے تابی و پریشانی نہ ہوتی۔ بس یہ جاننا کافی ہے کہ جو جس جگہ ہے، پریشان ہے۔ شہر کے اندر رہنے والے مجبور لوگ ہوں یا باہر کے پریشان حال، سب کے دل درد سے بھرے ہوئے ہیں اور سب قتلِ عام کے خوف سے ہراساں ہیں۔

۵ اکتوبر کو پیر کا مصیبت آفریں دن (تھا) دوپہر کے وقت اچانک چند گورے اُس دیوار پر چڑھ گئے جو بند کردہ دروازے سے ملی ہوئی ہے۔ (وہاں سے) ایک چھت پر (اور چھت سے) کود کر گلی میں آگئے۔ راجہ نرندر سنگھ کے سپاہیوں کا روکنا (کچھ) مفید نہیں ہوا (نہیں روک سکے)۔ دوسرے چھوٹے چھوٹے مکانات کو نظر انداز کرکے راقم الحروف کے گھر میں (گھس) آئے۔ (ان گوروں نے) بھلمنسی سے سامان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مجھ کو ان دونوں بچوں، دو تین ملازمین اور چند نیک کردار پڑوسیوں کے ساتھ گلی سے دو فرلانگ سے کچھ زیادہ فاصلے پر حقیقت پسند، دانش ور کرنل براؤن کے پاس لے گئے، جو چوک

ؔ ۲ فروری ۱۸۵۹ء کے ایک خط بنام مجروح میں بھی غالب نے کرنل "براؤن" لکھا ہے۔ "انتخابِ غالب" (۱۸۶۵ء) میں بھی "براؤن" درج ہے، لیکن جیسا کہ قاضی عبدالودود صاحب نے بتایا ہے، یہ دراصل "برن" ہے۔ Malleson کی تاریخ بغاوتِ ہند جلد ۲، ص میں ہے:

"کرنیل Burn جو رخصت ہونے کی وجہ سے فوج کے ساتھ نہ تھے، مگر اب آگئے تھے۔ بہ تاریخ ۲۱ ستمبر ۱۸۵۷ء دلی کے فوجی گورنر مقرر ہوئے۔" (جہانِ غالب، معاصر، پٹنہ، حصہ ۴، ص ۳)۔

ہے اسی طرف قطب الدین سوداگر کی حویلی میں مقیم ہے (کرنل براؤن نے) مجھ سے بہت نرمی وانسانیت سے بات چیت کی۔ مجھ سے نام اور دوسروں سے پیشہ پوچھا۔ خوش اسلوبی کے ساتھ اسی وقت رخصت کر دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس خوش اخلاق (کرنل براؤن) کی تعریف کی اور چلا آیا۔[1]

۷ اکتوبر کو شام کے وقت ۲۱ توپوں کی آواز نے (قوتِ) سامعہ کو نوازا اور آگہی کو غرقِ حیرت کر دیا (میں سوچنے لگا کہ) لیفٹیننٹ گورنر بہادر کے آنے پر سترہ توپوں کی سلامی دی جاتی ہے اور نواب گورنر جنرل بہادر کے آنے پر اکیس توپوں کی ہوش افزا سلامی

---

[1] "انتخابِ غالب" میں غالب نے اس واقعے کو بہ طورِ نقل ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"غدر کے دنوں میں نہ شہر سے نکلا، نہ پکڑا گیا، نہ میری روبکاری ہوئی۔ جس مکان میں رہتا تھا، وہیں بدستور بیٹھا رہا۔ بلی ماروں کے محلے میں میرا گھر تھا۔ ناگاہ ایک دن آٹھ سات گورے دیوار پر چڑھ کر اُس خاص کوچے میں اتر آئے جہاں میں رہتا تھا۔ اُس کوچے میں بہمہ جہت ۵۰ یا ۶۰ آدمی کی بستی ہوگی، سب کو گھیر لیا اور اپنے ساتھ لے چلے، مگر گرفتار نہیں کیا اور کسی کو بے حرمت نہیں کیا نرمی سے لے چلے۔ راہ میں سرجن بھی آ ملا۔ وہ مجھے کرنل برون کے پاس لے گیا۔ وہ چاندنی چوک حافظ قطب الدین سوداگر کی حویلی میں اترے ہوئے تھے۔ باہر نکل آئے اور میرا صرف نام پوچھا اور دوں سے نام بھی پوچھا کرنل صاحب نے فرمایا کہ اسد اللہ خاں بڑے تعجب کی بات ہے کہ یاد نہ پڑ نہ آئے۔ میں نے کہا کہ تلنگے دروازے سے باہر آدمی کو نکلنے نہیں دیتے تھے۔ میں کیوں کر آتا؟ (پھر) میری صورت کو دیکھیے اور میرا حال معلوم کیجیے بوڑھا ہوں، پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا۔ نہ لڑائی کے لائق نہ مشورت کے قابل۔ ہاں، دُعا کرتا ہوں سو یہاں بھی دُعا کرتا رہا کرنل صاحب ہنسے اور فرمایا: اچھا، تم اپنے گھر جاؤ اور اپنے نوکروں اور اپنے علاقہ داروں کو ساتھ لے جاؤ۔ باقی اہلِ محلہ سے غرض نہ رکھو۔ میں خدا کا شکر بجالایا اور کرنل صاحب کو دعا دیتا ہوا اپنے گھر آیا۔" غالب کے ہم زلف نواب غلام حسین کی روایت اس بارے میں قدرے مختلف ہے۔

(غالب نام آور۔ کراچی، ۱۹۶۹ء ص ۱۱۵)

کی کیا وجہ ہے۔ دوسرے دن بھی نہ اس ناواقفیت میں کوئی کمی ہوئی، نہ معلومات میں کچھ اضافہ ہوا۔ میرا خیال ہے کہ ملک کے پست و بلند کو ہموار کرنے والے (انگریزوں) کو کسی دوسری جگہ باغیوں پر فتح حاصل ہوئی ہے۔

واضح رہے کہ ابھی باغیوں کے بہت سے گروہ بریلی، فرخ آباد اور لکھنؤ میں جگہ جگہ شورش پھیلانے اور بے فائدہ مقابلہ کرنے میں مصروف ہیں اور ان کے دل، کہ خدا کرے خون ہو جائیں، اور ان کے ہاتھ کہ خدا کرے بے کار ہو جائیں، اسی کام (لڑائی) کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔

ادھر سوہنہ اور نوح کے علاقے میں میواتیوں نے بے طرح شورش پھیلا رکھی ہے، جیسے دیوانے زنجیروں سے آزاد ہو گئے ہوں۔ تلارام نامی ایک شورش پسند کچھ دن تک ریواڑی میں ہنگامہ آرا رہا۔ پھر شیطان کی رہنمائی سے میواتیوں سے مل گیا۔ یہ گروہ میدانوں، اور پہاڑوں میں (انگریز) حاکموں سے برسرِ جنگ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر ہر طرف تیز آندھیوں اور بھڑکتی ہوئی آگ کے ہنگامے بپا ہیں۔

ان غم انگیز حالات میں، جن کا آغاز یاد نہیں ہے اور جن کا انجام معلوم نہیں ہے، رونے کے علاوہ کچھ دیکھا ہو تو آنکھوں کے روزن خاک سے بھر جائیں۔ روزِ سیاہ (بدنصیبی) کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں، جس کے متعلق کہوں کہ آنکھوں نے اس کو دیکھا۔ اس سے قطعِ نظر کرتے ہوئے (کہتا ہوں) کہ روزِ سیاہ (بدنصیبی)، تو وہ چیز ہے جس کی تاریکی میں کچھ دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔

جس دن گوروں نے مجھ کو پکڑ کر لے گئے تھے، اس دن کے علاوہ چوکھٹ پر قدم رکھنا گھر سے باہر نکلنا، گلی یا بازار میں چلنا، یا دوسرے چوک کو دیکھ لینا نصیب نہیں ہوا ہے۔ گویا گنجہ کے دانش ور (نظامی گنجوی) نے میری ہی زبان سے کہا ہے:

"میں نہیں جانتا ہوں دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ کیا اچھائی ہو رہی ہے کیا برائی۔"

ان لاعلاج غموں اور مرہم بیزار زخموں (کے ہوتے ہوئے تو) مجھ کو یہ سوچنا چاہیے کہ میں مر چکا ہوں۔ مجھ کو بازپرس کے لیے اٹھایا گیا اور جزائے اعمالِ بد کے نتیجے میں دوزخ کے

کنویں میں لٹکا دیا گیا ہے۔ مجبوراً اس قید میں بے چارگی و پریشانی کے ساتھ ہمیشہ جینا پڑے گا:

"مجھ پر جو کچھ آج گذر رہی ہے، اگر کل بھی یہی گزری (تو) آہ (کیا ہوگا)!"

اس کتاب میں شروع سے آخر تک یا اُن حالات کا ذکر ہے جو مجھ پر گزر رہے ہیں یا اُن واقعات کا ذکر ہوگا جو سُننے میں آئے ہیں۔ میں نے جو شنیدہ حالات لکھے ہیں تو کوئی یہ خیال نہ کرے کہ میں نے جھوٹ باتیں سُنی ہوں گی، یا کچھ کم کرکے لکھی ہوں گی۔ میں دارو گیر سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں اور سچائی میں نجات ڈھونڈتا ہوں۔ آنکھیں بے کار ہیں، دل قیدِ (غم) میں ہے اور لب ساکت ہیں۔ لوگوں کی زبانوں سے میرے کانوں کو معلومات کی بھیک ملتی ہے۔ کیسی بُری ہے یہ گدائی! اور وہ بھی اس بے سرو پائی کے ساتھ۔

اور یہ جو بادشاہ اور شاہزادوں کے انجام کے متعلق میں نے کچھ نہیں لکھا (حالانکہ ان واقعات کو) فتحِ شہر کی داستان کے دیباچے کے طور پر (آغاز ہی میں) لکھنا چاہیے تھا اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس تحریر کے سلسلے میں میرا سارا سرمایہ سخن ہائے شنیدہ ہیں اور ابھی بغیر سُنی ہوئی باتیں بہت ہیں یقیناً جب میں اس جائے تنگ سے باہر نکلوں گا جو باتیں اب تک نہیں سُنی ہیں اِدھر اُدھر سے جمع کروں گا اور تب واقف کاروں کی طرح یہ راز کی باتیں لکھوں گا۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ اس تحریر کے پڑھنے والے (واقعاتِ) داستان کی تقدیم و تاخیر پر از روے انصاف اعتراض نہیں کریں گے۔

۱۹ر اکتوبر کو پیر کے دن نے، جس کا نام ہفتے کے رجسٹر سے کاٹ دینا چاہیے، آتش فشاں اژدہے کی طرح دنیا کو نگل لیا۔ اسی دن صبح کے وقت وہ کم بخت دربان بھائی کے مرنے کی خوش خبری لایا۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتارِ راہِ فنا (یوسف مرزا)[1] پانچ دن تیز بخار میں مبتلا رہا اور آدھی رات کے قریب اس دُنیا سے رُخصت ہوگیا۔ پانی، رومال

---

[1] یہاں غالب کا بیان مشتبہ ہے تفصیل کے لیے دیکھیے مضمون:
"میرزا یوسف" از مالک رام، نواے ادب، بمبئی، اپریل ۱۹۵۹ء۔

غسال، گورکن، اینٹ، چونے، گارے وغیرہ کا ذکر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ میں کیسے جاؤں اور (میت) کہاں لے جاؤں؟ کس قبرستان میں سپردِ خاک کروں؟ بازار میں اچھا بُرا کسی قسم کا کپڑا نہیں ملتا ہے۔ زمین کھودنے والے مزدور گویا کبھی شہر میں تھے ہی نہیں۔ ہندو اپنے مردوں کو دریا کے کنارے لے جا کر جلا سکتے ہیں (لیکن) مسلمانوں کی کیا مجال ہے کہ دو تین شخص ساتھ ساتھ راستے سے گزریں، چہ جائیکہ میت کو شہر سے باہر لے جائیں۔

پڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور (اس) کام کو انجام دینے کے لیے تیار ہوئے۔ پٹیالے کے ایک سپاہی کو آگے کیا۔ میرے دو نوکروں کو ساتھ لیا اور چل دیے۔ میت کو غسل دیا۔ دو تین سفید چادریں یہاں سے (گھر) لے گئے تھے، اُن میں پیٹا اور اس مسجد میں جو مکان کے برابر تھی، زمین کھودی (قبر بنائی) میت کو اس میں رکھ دیا اور اس گڑھے کو پاٹ کر لوٹ آئے :

"افسوس کہ ساٹھ سال کی عمر میں (وہ) تیس سال شاد رہا اور تیس سال ناشاد۔ قبر میں اس کو بالینِ خشت بھی نہ ملا۔ خاک کے علاوہ اور کچھ اس کی قسمت میں نہیں تھا۔ اے خدا! اس مرنے والے پر رحم کر کہ اس نے زندگی میں آرام کی صورت نہیں دیکھی۔ اس کی دل جوئی کے لیے کسی فرشتے کو بھیج اور اس کی روح کو بہشت میں داخل کر۔"

یہ نیک سرشت لیکن بدقسمت شخص جس نے زندگی کے ساٹھ سال خوش و ناخوش گزارے، تیس سال ہوش مندی کے ساتھ اور تیس سال بے ہوشی (دیوانگی) کے عالم میں۔ زمانۂ ہوش مندی میں غصہ ضبط کرنا اور عالمِ دیوانگی میں کسی کو تکلیف نہ پہنچانا جس کا شعار تھا، ۲۹ صفر ۱۲۷۴ھ کی شب میں مرگیا ہے :

"ایک شخص نے مجھ سے ستم نصیب میرزا یوسف کی تاریخ (وفات) پوچھی، جس نے اس دُنیا میں اپنے سے بیگانہ ہو کر زندگی گزاری۔ میں نے ایک آہ کھینچی اور کہا: "دریغ دیوانہ"

واضح ہو کہ "دریغ دیوانہ" سے ۱۲۹۰ عدد حاصل ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے "آہ"

کے ۱۶ عدد نکال دیے جائیں ۱۲۷۴ رہتے ہیں جو مطلوب ہیں:

"اُس خدا کے نام کہ جس کے حضور میں معذرت کرنا ہی مناسب ہے۔
تم جہاں سر جھکاؤ گے، اُسی کا آستانہ ہوگا۔"

جس ہفتے انگریزی فوج نے شہر کو فتح کیا، اسی ہفتے نامورانِ دانش مند امین الدین احمد خان بہادر، اور محمد ضیاء الدین خان بہادر نے حفظِ وضع کی خاطر اور اُمیدِ بہتری پر شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ بیوی بچوں کے علاوہ تین ہاتھی اور چالیس گھوڑے ساتھ تھے۔ پرگنہ لوہارو کا رُخ کیا، جو اُن کی آبائی جاگیر ہے۔ پہلے مہرولی گئے اور اس گورستانِ پُر انوار (مقبرہ) میں قیام کیا۔ دو تین روز آرام کیا۔ اس دوران میں لٹیرے سپاہیوں نے قیام گاہ کو گھیر لیا۔ جو کپڑے پہنے ہوئے تھے، ان کے علاوہ سارا سامان چھین لیا اور چلے گئے۔ البتہ تینوں ہاتھی جن کو وفادار اور خیر خواہ ہمراہی اس لوٹ مار کے شروع ہوتے ہی نکال لے گئے تھے، تباہی و نقصان کے نشان کی حیثیت سے باقی رہ گئے جیسے تین جلے ہوئے خرمن ہوں۔

(یہ لوگ) لوٹ مار کی مصیبت اُٹھا کر (اس) بے سروسامانی کے ساتھ جس کو تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو (ریاست) دوجانہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ (دوجانہ) کے نامور اور نیک کردار (فرماں روا) حسن علی خان بہادر نے ازراہِ انسانیت و فیاضی (ان کا) استقبال کیا۔ یہ کہہ کر کہ "میرا گھر بھی آپ ہی کا گھر ہے" ان سب کو دوجانہ لے گئے۔

قصہ مختصر سردارِ خوش خصال (حسن علی خان) نے اپنے ہمسر (مہمانوں) کے ساتھ وہی سلوک کیا جو شاہِ ایران نے ہمایوں کے ساتھ کیا تھا۔ صاحب کمشنر بہادر نے (ان حالات) سے واقف ہو کر اپنے پاس بُلا لیا۔ (یہ لوگ) شہر میں آئے اور حاکم سے ملاقات کی۔ (صاحبِ کمشنر) نے کچھ دیر طعن و تشنیع کی (لیکن) جب نرم جواب سُنا تو پھر کچھ نہیں کہا۔ قلعہ کے اندر ایوانِ خان سامانی کے پہلو میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔

تسلسلِ کلام کی رعایت کی وجہ سے میں اس خاندان کی تباہی کی داستان نہیں لکھ سکا۔ یوں سمجھو کہ مہرولی میں ان لوگوں کو لوٹا گیا اور دہلی میں ان کے مکانات جو مالکوں

سے خالی تھے، نذرِ غارت گری ہوئے جو سامان یہ لوگ وہاں (دہرولی) اپنے ساتھ لے گئے تھے، لوٹ مار کرنے والوں کے حصّے میں آیا۔ بس متعلقین زندہ دوجانہ پہنچے، اور جو سامان یہاں محلات میں تھا۔ سب لُٹ گیا۔ بس اینٹیں، پتھر باقی رہ گئے۔ نہ سیم وزر محفوظ رہا، نہ لباس و بستر کا ایک تار بچا۔ خدا (ان) بے گناہوں پر رحم کرے اس آغازِ ناسازگار کا انجام بہ خیر ہو، اور (ان) کو اس مصیبت کے بعد آرام نصیب ہو۔

یقیناً اکتوبر کی ۷ ار تاریخ تھی اور سنیچر کا دن کہ یہ دونوں دانش مندانِ یگانہ شہر میں آئے اور جیسا کہ میں نے (پہلے) کہا ہے، قلعے میں قیام کیا۔ اس واقعے کے دو، تین دن کے بعد فوج کو حکم دیا گیا۔ فوج گئی اور جھجر کے حاکم عبدالرحمان کو مجرموں کی طرح لائی۔ قلعے کے اندر ایک ایوان کے گوشے میں جس کو دیوانِ عام کہتے ہیں (ٹھہرنے کے لیے) جگہ دی گئی اور ان کی ساری جاگیر انگریزی حکومت نے ضبط کر لی

۳۱ اکتوبر کو جمعے کے دن فرخ نگر کے حاکم احمد علی خان کو اسی طرح (گرفتار کر کے) لائے، جیسے عبدالرحمان خان کو لائے تھے اور قلعۂ دہلی میں ایک الگ جگہ اُن کو ٹھہرایا گیا۔ فرخ نگر بھی تیز دست تباہ کاروں کا نشانہ بنا اور شہر والوں کا مال و اسباب لُٹ گیا۔

۲ نومبر کو پیر کے دن دادری اور بہادر گڑھ کے حاکم بہادر جنگ خان گرفتار ہو کر آ گئے اور قلعے میں جہاں ٹھہرایا گیا، ٹھہرے۔ ۷ نومبر کو سنیچر کے دن راجہ ناہر سنگھ حاکم بلب گڑھ کے آ جانے سے قلعے میں جو سردار مختلف مقامات پر ایک دوسرے سے دور مقیم تھے ان میں ایک کا اور اضافہ ہوا۔

واضح ہو کہ دہلی کی اجنٹی کے ماتحت جو جاگیریں ہیں، وہ شمار میں ہفتے کے دنوں سے کم یا زیادہ نہیں ہیں (دہلی کے ماتحت سات جاگیریں ہیں) جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ لوہارو، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، ان میں سے پانچ جاگیروں کے حاکم جیسا کہ میں نے کہا، قلعے میں موجود ہیں اور بقیہ دو جاگیردار پاٹودی اور دوجانہ میں خوف کے تیر کا نشانہ ہیں۔ دیکھو! ان کی جہاں بیں آنکھیں دُنیا میں کیا دیکھتی ہیں اور کیا انجام ہوتا ہے۔

یہ بات پوشیدہ نہیں رہے گی کہ مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خان ... اور ذوالفقار الدین حیدر خان جن کا لقب حسین مرزا ہے، اس ہنگامے میں دوسرے باعزت لوگوں کی طرح بیوی بچوں کے ساتھ شہر سے باہر چلے گئے۔ قیمتی سامان سے بھرے ہوئے گھر چھوڑ دیے اور صحرا نوردی اختیار کی۔ ان لوگوں کے کئی مکانات محل اور ایوان ہیں باہم متصل۔ اتنے وسیع کہ اگر (ان محلات و ایوانات کی) زمین کی پیمائش کی جائے تو شہر نہ سہی، ایک گانو کے برابر تو (رقبہ) ہوگا۔ اتنے بڑے بڑے محل، اس عالم میں کہ ان میں کوئی آدمی تھا ہی نہیں۔ لوٹ مار (کرنے والوں کے ہاتھوں) صاف اور ویران ہو گئے۔

کچھ کم قیمت اور بھاری سامان جیسے ایوان کے پردے، شامیانے، سائبان شطرنجیاں اور دوسرا فرش ان قیام گاہوں میں باقی رہ گیا تھا۔ اچانک ایک رات جس کی صبح کو راجہ ناہر سنگھ گرفتار ہوئے، اس سامان میں آگ لگ گئی۔ لپٹیں اٹھنے لگیں، لکڑی، پتھر، دیواریں سب جل گئیں۔ یہ عمارت میرے مکان سے جانبِ مغرب اتنی قریب ہے کہ میں آدھی رات کو بھڑکتی ہوئی آگ کی روشنی چھت پر سے دیکھ رہا تھا اور دھوئیں کی گرمی میرے چہرے اور آنکھوں تک پہنچ رہی تھی، کیوں کہ اس وقت پچھیا (ہوا) چل رہا تھا، راکھ میرے اوپر آ رہی تھی۔ ہاں پڑوسی کے گھر سے (بلند ہونے والے) نغمے سوغات کی حیثیت رکھتے ہیں، پھر پڑوسی کے گھر کی آگ راکھ کیوں نہ برسائے۔

راقمِ حالات کے قلم کی جنبش (اس واقعے کے اثر سے) جو نیم مردہ چیونٹی کی رفتار کے برابر ہے (سست ہے) (صفحۂ) کاغذ پر (اس حالت کی) کیا عکاسی کر سکتی ہے کہ نگاہیں اس کو دیکھ سکیں۔ شاہزادوں کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بعض کو گولی مار دی گئی (اس طرح) موت کے اژدہے نے ان کو نگل لیا۔ کچھ کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا گیا۔ (اس طرح) رسنِ دار کی کشاکش سے ان کی روح ٹھٹھر کر رہ گئی۔ چند افسردہ دل قید خانے میں ہیں اور بعض (عالمِ

غربت میں) آوارہ و پریشان پھر رہے ہیں۔ کمزور و ضعیف بادشاہ پر مقدمہ چل رہا ہے۔

جھجر، بلب گڑھ اور فرخ نگر کے جاگیرداروں کو علاحدہ علاحدہ مختلف دنوں میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اس طرح (ان لوگوں کو) ہلاک کیا کہ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ خون بہایا گیا۔

جنوری ۱۸۵۸ء کے آغاز میں ہندؤوں کو فرمانِ آزادی مل گیا، اور (شہر میں) آباد ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ لوگ (ہندو) جہاں جہاں تھے، شہر کی طرف چل پڑے۔ خانماں برباد مسلمانوں کے گھروں میں (خالی پڑے رہنے کے سبب سے) سبزہ اس قدر اُگ گیا ہے کہ در و دیوار سبز ہیں۔ ہر لمحہ سبزۂ سرِ دیوار کی زبان سے یہ صدا آتی ہے کہ مسلمانوں کی جگہ (بہ دستور) خالی ہے۔

شاید بد خصلت مخبروں کے کہنے سے حاکمِ شہر کو یہ خیال ہوا ہو گا کہ راجہ نرندر سنگھ بہادر کے طبیبوں کا مکان مسلمانوں کی جائے پناہ اور جمع ہونے کی جگہ ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ ان بے ہودہ گو ہنگامہ ساز (مخبروں) میں سے ایک دو شخص اس محفل میں (موجود) بھی ہوں۔ اس خیال سے ۲ فروری کو منگل کے دن (حاکمِ شہر) کچھ سپاہیوں کے ساتھ اس جگہ آیا اور مکان کے مالکوں کو ساتھ دوسرے نیک دل پناہ گزینوں کے ساتھ اپنے ہمراہ لے گیا۔ اگرچہ کئی رات دن سب کو حوالات میں رکھا، لیکن باعزت لوگوں کی عزت کا بھی خیال رکھا۔

۵ فروری کو جمعے کے دن حکیم محمود خاں، حکیم مرتضیٰ خاں اور اُن کے بھتیجے عبد الحکیم خان عرف حکیم کالے کو واپسی کی اجازت مل گئی۔ ۱۲ فروری کو جمعے کے دن چند دوسرے اشخاص اور ۱۳ فروری کو سنیچر کے دن تین شخص اور واپس آ گئے (لیکن) نصف سے زیادہ حوالات میں رہ گئے۔ یہ مصیبت جو پڑوس میں نازل ہوئی اور یہ ہنگامہ جو گلی میں برپا ہو گیا (اس کی وجہ سے) مجھ درویشِ غم زدہ کا دل بھی قابو میں نہیں۔ اس کے باوجود کہ اس دار و گیر میں مجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا، ابھی تک (یہ عالم ہے) کہ دن بھر متفکر رہتا ہوں اور رات میں آرام کی نیند نہیں سو پاتا ہوں۔

فروری کے پُر شوکت مہینے میں کہ اس زمانے سے ماہِ فروردین تک (جو موسم بہار کا پہلا مہینہ ہے) جس میں آفتاب کی رونق و روشنی بڑھ جاتی ہے، سورج کو ابھی (برج حمل تک پہنچنے کے لیے) ایک مہینے کا سفر طے کرنا ہے۔ حاکم مہربان، خورشید طلعت ستارہ حشم سر جان لارنس صاحب چیف کمشنر بہادر کے آنے کی خبر مشہور ہوئی۔ چونکہ میرا یہ طریقہ رہا ہے کہ جو حاکم، ہندوستان، خصوصاً اس شہر (دہلی) میں آئیں اُن کی مدح میں قصیدہ بھیجا جائے، اس بنا پر اس والا شکوہ (سر جان لارنس) کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا، جو تہنیتِ فتح اور خیر مقدمِ نوروز پر مشتمل تھا اور ۱۹ر فروری کو جمعے کے دن بہ ذریعہ ڈاک بھیجا۔

۲۰ر فروری کو شام کے وقت ۲۱ دیو آواز، نہنگ آہنگ توپوں کی آواز آئی اور انوار کی صبح کو شہر لکھنؤ کی فتح کی خوش خبری اس تفصیل کے ساتھ سننے میں آئی، کہ ۱۶ر فروری کو آسمانِ سروری کے اخترِ تابندہ، سپہ سالارِ نامور کمانڈر انچیف بہادر نے سیاہ رو، جنگ جو (باغیوں) پر اس طرح حملہ کیا کہ آسمان کے سپہ سالار (مریخ) نے سلامتِ دست و بازو کی اتنی دعائیں دیں اور اس قدر تعریف کی کہ اس کے ہونٹوں پر تبخالے پڑ گئے اور زبان تھک گئی۔

دُنیا کو آبادی کا مژدہ، اور اہلِ دُنیا کو نویدِ آزادی کہ آزاد اور نیک ذات لوگوں (انگریزوں) کی آرزو پوری ہوگئی اور بُرے اور بد ذات لوگوں کا دور دورہ و ہاں بھی ختم ہوگیا۔ پھر سننے میں آیا کہ توپوں (کی گرج) اور شہنائیوں کے نغمے (صرف) حصولِ طاقت کے شادیانے تھے۔ فتح نصیب فوج کے بہادر اس جنگ کے دوران میں شہر پر قابض نہیں ہوئے (بلکہ) دلیروں کی طرح دشمنوں کو قتل کرنے کے لیے دوڑ پڑے (دشمنوں کو) زخمی اور قتل کرنے کے بعد (اپنے) پڑاؤ کی طرف لوٹ آئے۔

۲۴ر فروری کو بدھ کے دن ایک پہر دن چڑھے مبارک وقت میں، باغِ انصاف کے سروِ آزاد آسمانِ رفعت کے ماہِ تابندہ، فرخ طلعت، فرخندہ سیرت، ستارہ حشم چیف کمشنر بہادر نے اپنے توسن کے سموں کے نشانات سے دہلی کی سرزمین کو آسمان

کی طرح ستارہ زار بنادیا اور تیرہ توپوں کی (سلامی کی) آواز نے خستہ دلوں کو مرہمِ مہر و محبت کی بشارت دی:

"حاکمِ شاہ نشان (کیا) آئے کہ شہر کے (مردہ) جسم میں روح واپس آگئی۔ شہر میں مسرت کی ایسی لہر دوڑ گئی ہے جیسے شہنشاہ شاہ جہاں آگئے ہوں۔"

۲۷ فروری کو جب سنیچر کا دن ختم ہوا اور رات آئی، رات کے تین پہر گذر گئے (اس وقت) مظلوموں کے دل کا دھواں چاند پر اس طرح چھا گیا کہ دیکھنے والے بے اختیار چلا اُٹھے کہ چاند گہن میں آگیا۔ اسی سنیچر کو حکمِ دربار ختم ہو گیا۔ انصاف چاہنے والے اور پریشان حال لوگوں کو حاضر ہونے کی اجازت اور خواہش مندوں کو پناہ دے دی گئی۔

اس شہر میں قیدخانہ شہر سے باہر ہے اور حوالات اندرونِ شہر، ان دونوں میں بے شمار لوگوں کو بھر دیا گیا ہے (ان محدود مقامات میں کثرتِ تعداد کو دیکھ کر) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی میں آدمی سمویا جا رہا ہے۔ ان دونوں قیدخانوں کے جن قیدیوں کو مختلف دنوں میں پھانسی دے دی گئی ہے، اُن کی تعداد فرشتۂ موت ہی جانتا ہے۔ شہر میں ایک ہزار سے زیادہ مسلمان نہیں پاؤ گے، میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ جو لوگ شہر سے نکل کر چلے گئے ہیں، اُن میں سے کچھ لوگ اس قدر دور نکل گئے ہیں گویا وہ اس سرزمین (دہلی) کے باشندے تھے ہی نہیں۔ بہت سے عالی مرتبہ لوگ شہر کے ارد گرد دو دو، چار چار کوس پر ٹیلوں، گڑھوں، چھپروں اور کچے مکانوں میں اپنے نصیب کی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے پڑے ہیں۔ اس ویرانہ نشیں گروہ میں یا تو وہ لوگ ہیں جو شہر میں رہنے کے خواہش مند ہیں یا گرفتار شدہ لوگوں کے رشتے دار ہیں یا خیرات خوار یعنی پنشن دار ہیں۔ لوگوں کی درخواستوں میں رہائی، آبادی اور اجرائے پنشن کے علاوہ اور کوئی (مضمون) نہیں پاؤ گے۔ داد خواہوں کی دو تین ہزار درخواستیں عدالت میں پہنچ چکی ہیں۔ انصاف طلب، چشم براہ اور گوش بر آواز ہیں کہ کیا سننے اور دیکھنے میں آتا ہے۔

میں بھی اس نیاز نامے اور ستائش نامے کے جواب کا منتظر ہوں جس کو میں
نے بہ ذریعۂ ڈاک بھیجا تھا۔ مختلف خیالاتِ پریشاں کے سبب سے حاکم (شہر) کی "جائے
قیام" پر جانے اور ملاقات کرنے کی کوئی صورت نہیں نکلی ہے۔ مختصر یہ کہ (ہر اعتبار سے)
ایسی مصیبتیں ہیں گویا (ہر طرف) کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ اگر باہر نکلو گے تو راستے میں (بچھے
ہوئے) دیکھو گے۔ اگر گھر (ہی) میں بیٹھے رہو گے (تو معلوم ہوگا) کہ کپڑوں میں چھپے ہوئے
ہیں (کسی طرح سکون نہیں ہے) ابھی تک صبر، بے تابی پر غالب تھا کہ ۸ مارچ کو پیر
کے دن وہ خط ایک تحریر کے ساتھ میرے پاس واپس آگیا۔ خط کی پیشانی حاکمِ دانش ور
کے اس فرمان سے منور تھی کہ خط۔ فرستندہ کو واپس کر دیا جائے تاکہ وہ حاکم شہر کے
توسط سے ہمارے پاس بھیجے۔ سب نے کہا اور میں نے بھی سوچا کہ یہ پُر فائدہ جواب
اُمید افزا علامت ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میری گزارشات منظور ہو جائیں گی
وہ خط جس پر فرمان مسطور تھا، مناسب عبارت کے اضافے کے ساتھ سرورِ عادل رعایا
پرور دانش مند، چارلس سانڈرس صاحب چیف کمشنر بہادر کے حضور میں بھیجا اور
ایک خط، خاص طور پر نامورِ موصوف (چارلس سانڈرس) کے نام منسلک کر دیا، جو
خواہشِ دیرینہ یعنی اجرائے پنشن سے متعلق تھا۔

۱۷ مارچ کو بدھ کے دن فرمان روا کے حضور سے پہلی خواہش کے بارے میں یہ حکم
صادر ہوا کہ یہ خط جس میں تہنیت کے سوا کچھ نہیں ہے اس کے بھیجنے کی ضرورت نہیں
ہے۔ میں نے بھی سوچا کہ ایسے پُر آشوب حالات میں مہر و محبت اور مسرت و انبساط کی
کیا گنجایش، میں تو بندۂ شکم ہوں، مجھ کو تو روٹی چاہیے۔ دیکھوں اس دوسری خواہش
کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے۔

۱۸ مارچ کو جمعے کے دن شام کے وقت روح کو توانائی بخشنے والی آوازِ توپ
آسمان کے نیلے گنبد میں گونج اُٹھی۔ (جس سے) لکھنؤ کا فتح ہونا اور اُس شہر میں کینہ خواہ
انگریزی فوج کا حسبِ دل خواہ پھیل جانا معلوم ہوا۔ اس شہر میں قلعہ، فصیل،
دروازہ کچھ نہیں ہے۔ یقیناً وہاں کے باغیوں کی فوج کی دیوار اس طرف کے بہادر دل

(انگریزوں) کا راستہ روکے ہوئے ہوگی۔ جب وہ کمزور دیوار بہادروں کی کوشش کی آندھی سے گر گئی ہوگی تو بالیقین سواروں اور پیادوں کے چلنے سے ہر راستے سے گرد و غبار بلند ہوا ہوگا۔ ہاں خدا اپنے فضل سے جس کو بادشاہت عطا کرتا ہے اس کو فتح کرنے کی طاقت اور شان و شوکت بھی عطا کرتا ہے۔ اسی بنا پر جو شخص فرماں رواؤں کی ، نافرمانی کرتا ہے، وہ اس قابل ہے کہ اس کے سر پر جوتے لگیں۔ محکوم کا حاکم سے لڑنا (ستانا) پر ہاتھ مارنا (اپنے آپ کو تباہ کرنا) ہے۔ دُنیا والوں کے لیے مناسب ہے کہ جن لوگوں کو خدا نے خوش بختی عطا کی ہے ،ان کے سامنے سر جھکا دیں اور فرماں رواؤں کے حکم کی تعمیل کو خدا کے حکم کی تعمیل سمجھیں۔ جب ہم کو یہ معلوم ہوگیا کہ خوش نصیبی حکومت اور طاقت کس کی بخشی ہوئی ہے تو پھر سرکشی اور بیزاری کیوں ہے ۔ نغمہ طرازِ شیراز (سعدی) نے اس بات کو کیسے اچھے انداز سے ادا کیا ہے :

"غلام (آقا کے) حکم کے سامنے سر نہیں جھکائے گا تو کیا کرے گا۔ گیند چوگان کی اطاعت کے علاوہ کر بھی کیا سکتی ہے ؟ "

۲۲ر مارچ سے مجھ دیوانے کے دل میں یہ بات کھٹک رہی ہے کہ دُنیا میں فروری کا مہینہ اور نوروز کا دن بھی آتا ہے اور وہ روزِ جہاں افروز (نوروز) انھیں دو چار تاریخوں میں ہوتا تھا۔ امسال شاید یہ شہرِ مُردوں کا مسکن ہے کہ بہار کی آمد آمد پر نعرہ ہائے مسرت سننے میں نہیں آتے ہیں۔ کوئی نہیں کہتا کہ یہ سال ترکوں کے "سالِ دوازدہ گانہ" میں سے کون سا سال ہے اور رات دن کے برابر ہونے کی ساعت کب آئے گی ۔ اگر منجم مر گئے ہیں اور دن کے بادشاہ (آفتاب) کے سفر کا روزنامچہ تحریر (پیش گوئیِ آثار) سے خالی رہ گیا تو یہ سمجھو کہ چند جھوٹ بولنے والے کم ہوگئے اور یہ فرض کر لو کہ چند جھوٹی باتیں سُنی ہی نہیں ۔ آفتاب برجِ حمل میں قیام (تحویل) کو بھولا نہیں ہے کہ سبزہ اُگے اور پھول نہ کھلیں ۔ اُصولِ آفرینش بدلتے نہیں ہیں ۔ آسمان مقررہ اصولِ گردش کے خلاف عمل نہیں کر سکتا ۔

میں باغ پر نہیں، اپنے اوپر آنسو بہا رہا ہوں۔ مجھے موسم بہار کی کوئی شکایت

نہیں ہے، اپنی بدقسمتی کا شکوہ کر رہا ہوں:۔

"دُنیا لالہ کے پھولوں سے رنگین اور گلاب کے پھولوں کی خوشبو سے مُعطّر ہے (لیکن) میں ایک گوشے میں مجبور و بے سرو ساماں بیٹھا ہُوا ہُوں۔ بہار کا موسم ہے اور میں بالکل بے سرو ساماں ہوں۔ مفلسی کے سبب سے گھر کا دروازہ بند ہے۔"

میں روتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ زمانہ بہت بے پروا ہے۔ میں زاویہ نشینِ غم و آلام اگر سبزہ و گل کو نہیں دیکھوں گا اور دماغ کو پھولوں کو خوشبو سے مُعطّر نہیں کروں گا تو بہار میں کیا کمی آ جائے گی اور ہوا سے کون تاوان لے گا؟

اپریل کے مہینے میں جس میں دو ثلث ماہِ فروردین کے اور ایک ثلث ماہ اردی کا ہے، حکیم محمود خاں کے ساتھ جو لوگ قید خانے میں باقی تھے، رہا ہو گئے۔ ہر ایک نے اپنا راستہ لیا۔ وہ ناز پروردہ، صاف طینت (حکیم محمود خاں) سالے رشتہ داروں بیوی بچوں اور متعلقین کے ساتھ پٹیالے کی طرف چلا گیا[1]۔ کہتے ہیں ابھی تک وہ کرنال میں مقیم ہیں۔ معلوم نہیں آیندہ کے لیے کیا سوچا ہے۔

مئی کے شروع میں کانوں کو یہ خبر سننے کا فخر حاصل ہُوا کہ سپاہِ کینہ خواہ کے بہادروں نے مراد آباد کو فتح کر لیا۔ جو بداندیش (باغیوں) کی گذرگاہ تھا اور اس شہر کو انصاف سے آراستہ کرنے کے لیے عالی نسب سرچشمۂ علم و دانش نواب یوسف علی خاں بہادر کے حوالے کر دیا۔ آج کل (نواب یوسف علی خاں) جو دُنیا کو فتح کرنے اور دُنیا پر حکومت کرنے کے اہل ہیں، اس علاقے پر تعمیلِ حکم کے طور پر فرماں روائی کر رہے

---

[1] "آج پانچواں دن ہے کہ حکیم محمود خاں مع قبائل و عشائر پٹیالے کو گئے ہیں۔ میں بمقتضائے وقت، اپنی سکونت کے مکان کو چھوڑ کر یہاں آ رہا ہوں، اس طرح کہ محل سرا میں زنانہ اور دیوان خانے میں مردانہ۔"

(نامۂ غالب، بہ نامِ غلام نجف خاں، یکم اپریل ۱۸۵۸ء)

ہیں، (اور مجھ کو) اُمید ہے کہ ہمیشہ فرماں روائی کرتے رہیں گے۔

اس کے علاوہ کہتے ہیں کہ کوہ شگاف اور اژدہا شکار فوج نے جب (بریلی اور مُرادآباد کے) اس علاقے پر یورش کی، تو بریلی کے گُناہ گار (باغیوں) کو اس طرح نکال باہر کیا، جیسے طاقت ور موجیں خس و خاشاک کو کنارے پر پھینک دیتی ہیں۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے توقع ہے کہ جو گراں جان (باغی) اِدھر اُدھر باقی رہ گئے ہیں شہروں، گاؤں میں لوگوں کو پریشان کرتے ہیں اور راستہ چلنے والوں کو ستاتے ہیں اُن کا زور دورہ بھی جلد ختم ہو جائے گا اور سارا ملک حاکمانِ عادل (انگریز) کے پرچم کے زیرِ سایہ آجائے گا۔

۱۴ر جون کو اتوار کے دن شام کے وقت حاکمِ شہر نے بہادر جنگ خان کو اپنے پاس بلایا، جو قلعے میں نظر بند تھے۔ وہ بڑی امیدوں کے ساتھ گئے۔ جاں بخشی اور ایک ہزار ماہانہ وظیفہ مقرر کیے جانے کی خوش خبری سُنائی گئی اور حکم ہُوا کہ لاہور کی طرف چلے جائیں۔ اس کے بعد آزادی کی زندگی بسر ہوگی اور اسی شہر (لاہور) میں رہنا ہوگا۔ بے شک ان حالات میں مناسب یہی ہے کہ وہ (بہادر جنگ خاں) جاہ و دولت کے غم و افسوس سے آزاد ہو جائیں اور اس آزادی پر مسرور و مطمئن ہوں۔

دن کا شہنشاہ (آفتاب) جس کا سر روزانہ نیزے پر گھمایا جاتا ہے، ابھی اُفقِ مشرق سے یہ قدر یک نیزہ بلند نہیں ہُوا تھا کہ ماہ جون کے گزرے ہوئے دنوں کی تعداد کے برابر رعد کی طرح گرجنے والی توپوں کی آواز بلند ہوئی (۲۱ ضرب توپ سے مراد ہے) جس نے دوستوں کے دل کو مسرّت و شادمانی سے معمور کر دیا اور آگ سے زیادہ جلانے والی (غم کی) راکھ دشمنوں کے سر اور چہرے پر ڈال دی۔ گوالیار کا شہر فتح ہو جانے اور اس سنگین قلعے کے ہاتھ آجانے کی خوش خبری جو زمین کا جگر گوشہ اور پہاڑ کا لختِ جگر ہے، خدا کے دربار سے سرکشوں کی موت کا پروانہ لائی (اس مژدۂ پُر مسرّت نے) حاکموں اور فرماں رواؤں کو آرزوؤں کے چراغ جل اُٹھنے اور (آرزوئیں پوری ہو جانے) کی بشارت دی۔

یہ داستان یوں ہے کہ باغیوں نے گوالیار پر قبضہ کر لیا۔ فرماں روائے گوالیار مہاراجہ جیاجی راؤ حکومت اور شہر دونوں کو چھوڑ کر آگرے چلے گئے اور انگریزوں سے مدد چاہی (انگریزوں) سے امدادی فوج لے کر اپنے وطن کی طرف گئے اور فتح حاصل کی۔ (باغیوں نے) بھاگم بھاگ ہر طرف سے گوالیار کا رُخ کیا (تھا) یہاں ایسی شکستِ فاش ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان گم راہوں کا انجام یہ ہوگا، کہ بدحالی و پژمردگی کے ساتھ ادھر اُدھر لوٹ مار کرتے پھریں گے، اور آخر کار جگہ جگہ ذلّت و خواری کے ساتھ مارے جائیں گے۔ ان کے صحرا نورد گھوڑوں کو بے آب و گیاہ میدانوں میں زمین پر پڑا ہوا (مردہ) دیکھو گے اور اس گروہ کے سازوسامان کو گذرگاہوں میں بکھرا ہوا پاؤ گے پھر ہندوستان خس و خار (ظلم و ستم) سے ایسا پاک ہو جائے گا کہ جنگل کا ہر گوشہ باغ کی طرح سرسبز ہوگا اور ہر رہ گذر بازار کی طرح پُر رونق نظر آئے گی۔

راقم الحروف کی زندگی کے تریسٹھ سال گذر چکے ہیں۔ ان طرح طرح کے رُوح فرسا غموں (کے سبب) سے ظاہر ہے کہ اب زمانے سے اور زیادہ فرصت (عمر) کی توقع بے جا ہے۔ مجبوراً سحر نگارِ شیراز (سعدی) رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار کو دُہراتا ہوں۔ اور جس طرح ایک غم نصیب دوسرے غم زدہ شخص سے نصیحت حاصل کرتا ہے، ان اشعار کو (پڑھ کر) اگر دل کو خوش نہیں کر سکتا ہوں تو کم سے کم قیدِ رنج و غم سے آزاد تو کر ہی لوں گا:

"افسوس! ہمارے بغیر اس دُنیا میں بارہا بہاریں آئیں گی اور پھول کھلیں گے۔ تیر، دے اور اردی بہشت کے مہینے بار بار آئیں گے جبکہ ہم قبر میں خاک ہو چکے ہوں گے۔"

فی الحقیقت سچی بات کو چھپانا اچھے لوگوں کا طریقہ نہیں ہے۔ میں نیم مسلمان مذہبی پابندیوں سے آزاد ہوں اور بدنامی و رسوائی کے رنج سے بے نیاز، ہمیشہ سے رات میں صرف ولایتی شراب پینے کی عادت تھی۔ ولایتی شراب نہیں ملتی تھی تو نیند نہیں آتی تھی آج کل جب کہ انگریزی شراب شہر میں بہت مہنگی ہے اور میں بالکل مفلس ہوں، اگر

خدا دوست، خدا شناس، فیاض، دریادل، مہیش داس دیسی شرابِ قند جو رنگ میں ولایتی شراب کے برابر اور بو میں اس سے بڑھ کر ہے بھیج کر آتشِ دل کو سرد نہ کرتے تو میں زندہ نہیں رہتا۔ اسی عالمِ جگر تشنگی میں مرجاتا:

"عرصے سے دل چاہتا تھا کہ کسی طرح میری آرزو پوری ہو جائے (آرزو یہ تھی کہ) شرابِ ناب کے ایک دو ساغر مل جائیں۔ دانش مند مہیش داس نے مجھ کو وہ آبِ حیات بخش دیا جس کو سکندر نے اپنے لیے ڈھونڈا تھا۔"

یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس نیکی پسند شخص (مہیش داس) نے (شہر میں) مسلمانوں کی آبادکاری کے متعلق کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ چوں کہ خدا کی مرضی نہیں تھی کوشش کارگر نہیں ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ (شہر میں) ہندوؤں کا آزادی کے ساتھ رہنا مہربان حاکموں کی محبت اور مہربانی کا نتیجہ ہے۔ بہرحال اس نیکی پسند بہی خواہ (مہیش داس) کا اس انتظام میں دخل رہا ہے۔ قصہ مختصر خوش نصیب شخص ہے۔ لوگوں کے ساتھ نیکی کرتا ہے۔ زندگی عیش و مسرت کے ساتھ گزارتا ہے۔ اگرچہ مجھ سے بہت پرانی شناسائی نہیں ہے، اتفاقاً کبھی ملاقات اور بات چیت ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی کوئی تحفہ بھیج کر مجھ کو ممنون کرتا ہے۔

میرے دوسرے متعلقین اور شاگردوں میں سے ہیرا سنگھ، جو ایک نیک نام نوجوان اور تعلقات کا بہت خیال رکھنے والا ہے (برابر) آتا رہتا ہے اور میرا غم غلط کرتا ہے۔ اس نصف آباد نصف ویران شہر کے لوگوں میں سے عالی نسب شیوجی رام برہمن جو ایک عقل مند نوجوان ہے اور مجھ کو بیٹے کی طرح عزیز ہے، مجھ درویشِ غم زدہ کو بہت کم تنہا چھوڑتا ہے۔ فرماں برداری اور کارسازی کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا لڑکا بال مکند جو ایک پرہیز گار اور خوش اخلاق نوجوان ہے، اپنے والد کی طرح تعمیلِ حکم میں مستعد اور غم گساری میں یکتا ہے۔

دور دراز کے دوستوں میں سے (ایک دوست) آسمانِ محبت کے ماہِ کامل

شیوا بیانؔ، ہرگوپال تفتہ (کبھی ہیں (جو میرے پُرانے مونس و ہمدم ہیں اور اس بنا پر کہ مجھ کو اپنا اُستاد کہتے ہیں ان کا کلام ساری خداداد خوبیوں کے ساتھ میرے لیے سرمایۂ ناز ہے۔ مختصر یہ کہ بہت اچھے آدمی ہیں سرتاپا محبت و اخلاص۔ شاعری سے ان کو فروغ (شہرت) حاصل ہے اور ان کے دم سے شاعری کے ہنگامے گرم رہتے ہیں۔ انتہائے محبت سے میں نے ان کو اپنا جزوِ رُوح سمجھ لیا ہے اور "میرزا تفتہ" خطاب دیا ہے۔ انھوں نے میرٹھ سے ایک ہنڈی[2] میرے پاس بھیجی، نیز غزل اور خط برابر بھیجتے رہتے ہیں۔

یہ باتیں جن کا لکھنا لازمی نہیں تھا، صرف اس لیے لکھیں کہ (ان لوگوں کی) فیاضی اور محبت کا شکریہ ادا ہو جائے، نیز اس لیے بھی (لکھیں) کہ جب یہ داستان دوستوں

---

[1] "التزام اس کا کیا ہے کہ "دساتیر" کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اس نثر میں درج ہے، وہ بھی بے آمیزشِ لفظِ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے۔ وہ عربی، ہندی، انگریزی جو ہیں وہ لکھ دیتے ہیں مثلاً تمھارا نام "منشی ہرگوپال" منشی لفظ عربی ہے، نہیں لکھا گیا۔ اس کی جگہ "شیوا زبان" لکھ دیا ہے۔" (بنام تفتہ: بقدیم اگست ۱۸۵۸ء)

[2] یہ ہنڈی سو روپے کی تھی۔ روزِ شنبہ سی ایم جنوری ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب نے تفتہ کو لکھا تھا کہ: "مئی (۱۸۵۷ء) سے پنسن نہیں پایا۔ کہو، یہ دس مہینے کیوں کر گزرے ہوں گے۔ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔ زندہ ہوں مگر زندگی وبال ہے۔" اس پر تفتہ نے بڑی عجلت دکھائی اور فی الفور سو روپے کی مالیتی ہنڈی بھجوائی۔ غالب نے اس کی رسید دیتے ہوئے اس رقم کا قصّہ جس طرح تمام ہوا اس کی جو تفصیل لکھی ہے وہ لُطف سے خالی نہیں: "سو روپے کی ہنڈی جو کچھ کیسے ملا، ایک آدمی رسید مہری دے کر "نیل کے کٹرے" میں چلا گیا، سو روپے چہرہ شاہی لے آیا، آنے جانے کی دیر ہوئی اور بس۔ جو بیس روپے داروغہ کی معرفت اُٹھے تھے وہ دیے گئے۔ پچاس رُوپے محل میں بھیج دیے۔ چھبیس روپے باقی رہے وہ بکس میں رکھ لیے۔۔۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور اجر دے۔ بھائی بری آ بنی ہے، انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ قصّہ مختصر یہ کہ قصّہ تمام ہوا۔" (بنام تفتہ: ۲ فروری ۱۸۵۸ء)

کے ہاتھوں میں آئے تو وہ سمجھ لیں کہ شہر مسلمانوں سے خالی ہے۔ راتوں کو ان لوگوں کے گھر چراغ سے محروم رہتے ہیں اور دن میں دیواروں کے روزن دھوپ سے۔ غالب جس کے شہر میں ہزاروں دوست تھے ہر گھر میں شناسا اور واقف کار موجود تھے، اس تنہائی میں قلم کے سوا کوئی اس کا ہم زباں اور (اپنے) سایے کے علاوہ کوئی ساتھی نہیں ہے:

"اب میرے چہرے پر اس وقت تک آب و رنگ نہیں آتا ہے، جب تک کہ ہزار بار اشکِ خوں سے چہرے کو تر نہ کروں۔ میرے جسم میں غم و افسوس، جان و دل بن گئے ہیں اور میرے بستر کا تانا بانا کانٹوں سے (تیار ہوا) ہے۔"

اگر شہر میں یہ چاروں شخص نہ ہوتے تو کوئی شخص میری بے کسی کا گواہ بھی نہ ہوتا۔ (گردشِ) روزگار پر رشک آتا ہے کہ اس لوٹ مار میں جب کہ شہر کے کسی گھر میں مٹی بھی نہیں بچی، اگرچہ میرا گھر لوٹ مار کرنے والوں کی دراز دستی سے محفوظ رہا (لیکن) میں قسم کھا سکتا ہوں کہ بستے اور پہننے کے کپڑوں کے علاوہ گھر میں کچھ نہیں رہا[1]۔ اس عقدۂ دشوار کا حل اور اس دروغ نما سچ کی حقیقت یہ ہے کہ جس وقت کالوں (باغیوں) نے شہر پر قبضہ کیا بیگم نے مجھ سے کہے بغیر قیمتی چیزیں زیور، وغیرہ جو کچھ تھا خفیہ طور پر کالے صاحب پیرزادے کے یہاں بھیج دیا۔ وہاں تہ خانے میں محفوظ کر دیا گیا اور دروازہ مٹی سے پاٹ دیا گیا۔

جب فاتح (انگریزوں) نے شہر کو فتح کیا اور سپاہیوں کو لوٹ مار کا حکم مل گیا

---

[1] غالب کے خطوں سے اس بیان کی تائید نہیں ہوتی، بلکہ اس کی تکذیب ہوتی ہے "میں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزمِ خوں کا شناور رہا ہوں۔ دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا، نہ پکڑا گیا نہ نکالا گیا، نہ قید ہوا، نہ مارا گیا۔ کیا عرض کروں میرے خدا نے مجھ پر کیسی عنایت کی جان و مال اور آبرو میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا۔"

(غالب بنام محمد امیر در نامۂ سرور، ستمبر ۱۸۶۰ء)

تب بیگم نے بیزار مجھ سے کہا، وقت نکل چکا تھا۔ وہاں تک جانے اور (سامان) لانے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ میں خاموش ہو گیا اور دل کو سمجھا لیا کہ یہ چیزیں جانے والی ہی تھیں، اچھا ہوا کہ میرے گھر سے نہیں گئیں۔

اب یہ جولائی کا پندرھواں مہینہ ہے۔ قدیم پنشن جو سرکار انگریزی سے (ملتی تھی) اُس کے ملنے کا کوئی ذریعہ نہ نکلا۔ بستر اور کپڑے بیچ بیچ کر زندگی گزار رہا ہوں[1]۔ گویا دوسرے لوگ روٹی کھاتے ہیں، میں کپڑے کھاتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ جب کپڑے سب (بیچ کر) کھا لوں گا تو عالم برہنگی میں بھوک سے مر جاؤں گا۔

اس قیامت میں پرانے نوکروں میں سے دو تین نوکر میرے پاس سے نہیں گئے۔ ان کی پرورش کرنا ہے۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ آدمی، آدمی کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ نوکر کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا، اس گروہ (ملازمین) کے علاوہ دوسرے ضرورت مند جو ہمیشہ سے مجھ سے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھانے کے عادی ہیں، اس بُرے وقت میں بھی اپنی روح فرسا آواز (سوال) سے مرغ کی صدا سے بے ہنگام سے زیادہ تکلیف پہنچاتے ہیں۔

اب جب کہ جسمانی تکلیفوں کے دباؤ اور روحانی اذیتوں کی گداختگی نے جسم و جان کو تباہ کر دیا ہے، یکایک دل میں خیال آیا کہ اس کھلونے کو آراستہ کرنے میں (جس کا نام تصنیف ہے) کب تک مشغول رہا جا سکتا ہے۔ یقیناً اس کش مکش کا انجام یا تو موت ہے، یا بھیک مانگنا۔ پہلی صورت میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو گا کہ یہ داستان ہمیشہ کے لیے انجام و اختتام سے محروم رہے اور پڑھنے والوں کے دلوں کو افسردہ کرے۔

---

[1] کپڑے بیچنے کا ذکر ان ہی ایام کے ایک خط میں اس طرح کیا ہے: "کئی دن ہوئے۔۔۔ جو میں نے ایک ولایتی چغہ اور ایک شالی رومال ڈھائی گز ایک دلاّل کو دیا۔۔۔ اور وہ اس وقت روپے لے کر آیا۔" (تفتہ، ۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء)۔

قریب سوا سال بعد تفتہ ہی کو لکھتے ہیں:۔

"کپڑا ایام تنعم کا بنا ہوا بھی ہے، اس کی فکر کچھ نہیں۔" (۵ نومبر ۱۸۵۹ء)۔

دوسری صورت میں (یہ بات) ظاہر ہے کہ اس ساری داستان میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ فلاں گلی سے سربازار دھتکار دیا گیا اور فلاں دروازے پر کچھ مل گیا۔ پھر یہ باتیں کب تک بیان کی جا سکتی ہیں اور اپنے آپ کو (کہاں تک) رُسوا کیا جا سکتا ہے۔ باقی پنشن اگر مل گئی، تب بھی آئینۂ (دل) سے زنگِ (غم) صاف نہیں ہو سکے گا۔ (قرض ادا نہیں ہوگا) اگر نہیں ملی، اس صورت میں شیشہ پتھر سے چور چور ہو جائے گا (تباہی یقینی ہے) اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں چوں کہ یہاں (دہلی) کی آب و ہوا مصیبت زدہ لوگوں کو سازگار نہیں آتی ہے، یقیناً شہر سے بھاگنا ہوگا اور کسی دوسرے شہر میں رہنا ہوگا۔

مئی سالِ گذشتہ سے لے کر جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد میں نے لکھی ہے۔ یکم اگست سے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔ کاش میری ان تینوں خواہشوں یعنی خطاب، خلعت اور پنشن کے اجرا کا حکم شہنشاہِ فیروز بخت کے حضور سے آ جائے جن کے متعلق میں نے اس تحریر میں بھی (کچھ) لکھا ہے۔ میری آنکھیں اور میرا دل انھیں کی طرف لگا ہوا ہے وہ شہنشاہ کہ چاند جس کے سر کا تاج ہے، آسمان جس کا تخت ہے، جمشید نشان، فریدوں فر، کاؤس مرتبہ، سنجر شکوہ، سکندر حشم، وہ شہنشاہ کہ شاہِ روم اس بات کے لیے اس کا شکر گزار ہے کہ اس کے تخت و تاج کی عزّت رہ گئی۔ فرماں روائے روس کا دل اُس کی لشکر کشی کے خوف سے دو نیم ہے۔ آفتاب اس خیال سے کہ (یہ) جہاں سوزی اس کی ناراضی کا سبب ہے اگر ڈرتا نہیں ہے تو پھر وہ کیوں ہر لمحہ کانپتا رہتا ہے اور ماہِ کامل اس اندیشے سے کہ دُنیا کو منوّر کرنے میں اس کی برابری کا احتمال ہے اگر اپنی گستاخی کی معافی نہیں چاہتا ہے تو پھر کیوں ہر رات خوف سے گھٹتا رہتا ہے:

"وہ مالکِ تیغ و نگیں و علم ہے۔ وہ شہنشاہ سلطنت بخش اور بادشاہ ساز ہے صاحبِ دانش، فرخ طلعت اور نیک خو ہے۔ اس کا مرتبہ انصاف میں نوشیرواں سے بلند تر ہے۔ جمشید کے پاس جو درخشاں علم تھا وہ اسی لیے اس کو حفاظت سے رکھتا تھا کہ اس ملکۂ نامور کے سپرد کر دے۔

خسرو کی طرف سے ترنج زر اور اس کے ساتوں خزانے بغیر زحمت اٹھائے ہوئے ملکہ کو بطور تحفہ ملے ہیں۔

وہ تختِ (سلیمانؑ) جس کو ہوا اپنے کاندھوں پر لے جاتی تھی فرشتۂ غیب نے ملکہ کے سامنے بطور پیش کش پیش کیا ہے۔

تم نہیں دیکھتے ہو کہ پہاڑوں میں پتھروں کے جگر سے گوہر رنگارنگ برآمد ہوتے ہیں، سورج کو اس کے تاج کا خیال رہتا ہے، ورنہ اُسے موتیوں سے کیا کام۔

اگر وہ (ملکہ وکٹوریہ) موتی لٹانے کا ارادہ کریں اور لٹائیں تو، کثرتِ بخشش سے یہ حالت ہو گی کہ، اگر کوئی شخص ان موتیوں کو شمار کرنا چاہے گا تو شمار کرتے کرتے اس کی انگلیاں گھس جائیں گی۔

اس کی فوج کے خوف سے جو لڑائی کے وقت دریاؤں اور پہاڑوں کو تباہ کر دیتی ہے، پہاڑوں میں اژدہے اور دریاؤں میں نہنگ سر پٹک کر مر جائیں گے۔

اس کی شان و شوکت کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے بادشاہ (اس کے در کے) گدا ہیں۔

اس کی ضیا بخشی اور کرم بے دریغ کا یہ فیض ہے کہ یہ سورج روشن ہے اور بادل میں برسنے کی صلاحیت ہے۔

وہ کرم و فیاضی سے اہلِ علم و دانش کو نوازتی ہیں اور ان کی دانش مندی کی برکت سے دوسرے لوگ صاحبِ خرد ہو جاتے ہیں۔ ان کی سخاوت حیرت آفریں ہے اور ان کی عقل رسا، ان کا نام ملکۂ عالم وکٹوریہ ہے۔

خدائے پاک ان کا نگہبان رہے (خدا کرے) اس محفلِ (ہستی) میں ان کا قیام دیر تک رہے۔

اگر ملکۂ عالم کی بخشش سے میں کچھ حاصل کر لوں گا تو اس دُنیا سے ناکام نہیں جاؤں گا۔

"جب بات یہاں تک آپہنچی تو میں خاموش ہوگیا، میں داستان کہنا نہیں چاہتا ہوں"۔

مکمل ہونے کے بعد اس کتاب کا نام "دستنبو" رکھا گیا (یہ کتاب) لوگوں کو دی گئی، اور ادھر اُدھر بھیجی گئی تاکہ صاحبانِ علم و دانش کی روح کو تسکین بخشے، اور انشا پردازِ اندازِ نگارش پر) فریفتہ ہو جائیں۔ اُمید ہے کہ یہ مجموعۂ دانش (دستنبو) انصاف پسند لوگوں کے ہاتھوں میں گلدستۂ پُر رنگ و بو ہوگا اور شیطان فطرت لوگوں کی نگاہوں میں آتشیں گیند، آمین۔

"ہماری طبیعت جو ہمیشہ رواں رہتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم رازہائے آسمانی کا سرچشمہ ہیں۔ یہ کتاب دساتیر ہی کا ایک حصہ ہے اس کارروائی کے لحاظ سے (گویا) ہم ساسانِ ششم ہیں"۔

"دستنبو" طبع اول کے ۴۴ نسخے غالب کو ۱۲ نومبر ۱۸۵۸ء کو ملے اور ایک ہفتے کے اندر اندر یہ سب تقسیم بھی ہو گئے (دیکھیے تفتہ کے نام غالب کا خط مورخہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء)۔ اغلب یہ ہے کہ ان ۴۴ کتابوں میں سے جو ۱۲ نومبر سے ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء تک کے درمیان غالب کے ہاتھوں دوستوں اور شاگردوں میں تقسیم ہوئیں ایک کتاب پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں موجود اور محفوظ ہے (اندراج نمبر ۸-۲۰۹۲-۳۴۳ ح مخ ۴)

اس نسخے کا امتیاز خاص یہ ہے کہ اس مطبوعہ نسخے کے آخر میں غالب کی مہر ثبت ہے۔ مزید یہ کہ اس نادر مطبوعہ نسخے پر بخط غالب فارسی کی ایک سطر بھی درج ہے۔ زیر نظر کتاب میں "دستنبو" کی اشاعت اول کا عکس اسی نایاب نسخے پر مبنی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ اس مطبوعہ ایڈیشن کا یہ امتیاز خاص غالب دوستوں کے علم اور اطلاع میں آ رہا ہے۔

غالب نے "دستنبو" کا یہ نسخہ "بال مکند بے صبر" کی نذر کرتے ہوئے کتاب کے آخری صفحے (صفحہ ۸۰) پر مطبوعہ قطعات تاریخ کے بعد نسخے کے عرض حاشیے میں اپنے قلم سے یہ جملہ لکھا ہے:

"نور چشم بال مکند بے صبر این رسالہ را بہ دفع چشم زخم، تعویذ بازو سازند"

اس سطر کے نیچے دائیں جانب غالب کی مہر ثبت ہے۔ ذیل میں غالب کے قلم سے لکھے ہوئے اس جملے اور غالب کی مہر کا عکس پیش کیا جا رہا ہے:

العلم طاقة

کتاب مستطاب بزبان فارسی قدیم بے آمیزش لفظ عربی
تصنیف فردوسی ہند نواب اسد اللہ خان بہادر غالب تخلص دہلوی موسوم بہ
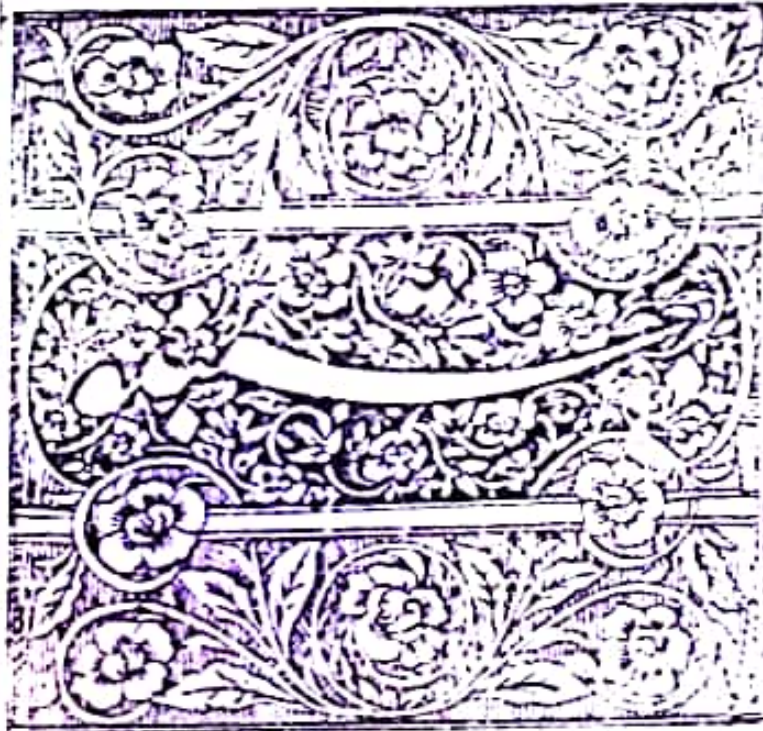
جسمیں مصنف نے اپنی سرگزشت ابتدای ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولای ۱۸۵۸ء تک
لکھی ہے مع قصیدہ تہنیت فتح ہند کہ وہ بزبان فارسی متعارفہ مروجہ ہے

مطبع مفید خلایق آگرہ میں واسطے افادہ خاص و عام کے باہتمام شیو نراین کے چھپا ہے

قصیدهٔ

برگزیده

در مدح خداوند روی زمین سایهٔ جهان

آفرین حضرت قدر قدرت ملکهٔ معظمهٔ انگلستان

خلد الله ملکها بالعدل والاحسان

مشتمل بر تهنیت فتح

هندستان

در روزگار ما نتواند شمار یافت	خود روزگار آنچه درین روزگار یافت

هر کار جز گردش فلک در میان مبین	حق داد داد حق که بمرکز قرار یافت

دریای آسمان بزمین باز گرداند	هر گوهری که آن ز تحیت بهر رهگذار یافت

آمد اگر بفرض ز بالا بلا فرود	بر روی خاک پیچ و خم زلف یار یافت

چون حسن او کشیده عنان رخ ماه	یا داشت جای گرد ازین شبهای تار یافت

چون برگ شد گل نگری شاد شو که گل	اجر جگر خراشی پیکان خار یافت

در خاک و باد و آتش و آب آشتی فزود	این پرورش که خلق ز پروردگار یافت

ناچار جز بدایع والیش نمیکند	در دهر هر چه صورت ازین هر چهار یافت

هر کس بقدر ظرفیت خویش ارجمند گشت	هر شی بجوهر خویش اعتبار یافت

گر خواجه بنده را خط آزادگی نبشت	هم بر در سرای خود این بنده وار یافت

ور بنده خود نخستم خط بندگی درست	توقیع خوشدلی ز خداوندگار یافت

سر روشنی و مهر فروزش ز سر گرفت	لیل و نهار صورت لیل و نهار یافت

بهرام دل ببستن تیغ و کمر نهاد	ناهید ذوق و مدرش مغز از نثار یافت

نظاره فتنه‌های عیان از نظر سترد — اندیشه گنجهای نهان آشکار یافت

جام از شراب روشنی آفتاب داد — بزم از بساط تازگی نوبهار یافت

روی سخن صفای بناگوش گل گزید — بانگ قلم نشاط نوای هزار یافت

برهم زدند قاعده‌های کهن به دهر — هر کس سرود تازه ز هر گونه کار یافت

فیض سحر بغالب پیمانه کش رسید — ذوق صبوح عابد شب زنده دار یافت

رهزن متاع خویش بر ابن السبیل بخشید — کودک رضای لهو ز آموزگار یافت

عاشق ز بسکه شاهد بیداد پیشه را — از بهر خویش غمگسل و غمگسار یافت

خون گشت در دل وی اگر حسرت نگاه — چشم سیاه را به لباس سوگوار یافت

گر زاهد است نیز ز من می بجام برد — ور مجرم است نیز ز شه زینهار یافت

قفل دل عدو که گشایش نداشت نیز — دندانه کلید ز دندان مار یافت

با فتنه هم مضایقه در خرمی نرفت — خود رخت خوابش از رگ گل پود و تار یافت

عنوان رنگ و بو رقم دلفروز جست — بستان ز آرزوی شجر میوه دار یافت

دولت سپند سوخت که شه کلک تازه روی — تمکین ز سرو و کوه ز دولت مدار یافت

از انتظام شاهی و آیین خسروی — شور و سرور و دانش و داد انتشار یافت

بر خستگان بند ببخشود از کرم — و کشور را که رونق از روزگار یافت

جشنی بکارسازی اقبال ساز داد — کاقبال ناز را به منش سازگار یافت

بالد چنان زمانه که پهلو زند بتاج — از بسکه تخت پایه ی ماهی استوار یافت

نازد چنان بخویش که بالد بروی تخت — از بسکه تاج کام دل اندر کنار یافت

بالیستی انجم از پی ترصیع تاج و تخت — تا زیم فروتنی که جواهر قرار یافت

یاقوت ساز جیغه کز معدن و کان است — آورد هر چه در کمر کوهسار یافت

سنگی که نقش لعل و زمرد نبسته بود — در سینه خار خار ز جوش شرار یافت

خورشید را بچشم کواکب فزود اوج — تنها نه آبرو گهر شاهوار یافت

جمشید کش بشاه سری همسری نبود — ساقیگری گزید و دران پرده بار یافت

زین پس بسی میانه مردم سخن بود — زان دور باش ها که جم از پرده دار یافت

همت نخواست باده ز انگور ساختن — در دور شه بمیکده بیرون فشار یافت

زحمت کشید گرچه بهار اندر اهتمام — دانه همی که سود برون از شمار یافت

آورده گونه گونه نشانهای رنگ و بو | با خویش هر دو هر چه نه در خورد کار یافت

گل را ز جوش رنگ بهنگامه جا کجاست | آورد گر بهار تمنش را فگار یافت

در راه پای هر دو غریبان شمرده شد | در بزم قوت روح عزیزان قرار یافت

موجیکه آب در دگمر بشنا سوار زد | جوشی که خون بناف غزال تتار یافت

روزیکه زیر ران شهنشاه کامران | توسن شرف بحیله سیر و شکار یافت

از گرد راه لیلی گیتی نقاب بست | وز خط جاده ناقه گردون مهار یافت

ور در شکارگاه خدنگی ز شست جست | چشم غزال سرمهٔ دنباله دار یافت

باشد بجای شیهه بمنزل زند فرس | بالیدنش بسر وکه چنین شهسوار یافت

تاج و نگین علامت شاهی است در جهان | این هر دو هر که شد بجهان شهریار یافت

فرمانروای ماست که از فر شوکتش | شد تاج سرفراز و نگین اعتبار یافت

زینسان بفیض نامیه می گشته بود | صد بار هرگدا ز نفس آبیار یافت

دانم کز اقتضای زانست کاین زمان | شاخ بریدهٔ قلم این برگ و بار یافت

آری چرا چنین نبود کز علای جهر | آبان و مه دسترس نوبهار یافت

کوه از هجوم لاله ز خود رو بجان خفت
خاکی ز سوسن و ریحان غبار یافت

لی آن که خواهش ز رگل در میان بود
دامان گل نسیم بدست چنار یافت

امروز لاله را بسر کوهسار دید
دهقان که دی بدامنه کوهسار یافت

در وصف رنگ و بوی قوافی تمام شد
ناچار مدح شه بدعا اختصار یافت

این خوی شعلی ز روز ازل بود آن شاه
وقت آمد از سروش ثنا منت بسیار یافت

دانا که مستعار بود همچو عمر خلق
عمری که شاه زنده دل از کردگار یافت

نتوان شمار دولت جاوید یافتن
در خود ز روی هندسه گاهی شمار یافت

از بس براست جیب مستی ز انقد اسم
هر جا الف نوشت محاسب هزار یافت

بنام خداوند پیروزگر
مه و مهر ساز و شب و روزگر

توانا داور نهٔ سپهر فراز هفت اختر فروز و دانا خدای
روان با تن آمیز دانش و داد آموز که این هفت و نهٔ رابی مایهٔ
افزار فراز آورد و کارهای آسان و دشوار را روائی و بندی
سست و استوار را کشایش بکشش و کوشش ایشان باز بست
اندازهٔ این بر بست و بر نهادنه بدان انداز بست که این کالبدها
با هم ستیزندهٔ از یکدگر گریزندهٔ بهم آمیزنده روان نداشته
باشند و در فرماندهی از فرمانبری نشان و در گرایش و درایش از

سخت پاس فرمان نداشته باشند ؎ نه راز اختر و گردون چه دم زنی

که هنوز * همی زهم نشناسی ستان و دروا را * مشو ستاره

پرستار کافتابی هست * فروگرفته فروغش نهان و پیدا را *

زاور و زاوش را در پیمودن سود دست و بهرام و کیوان را

در آمودن زیان دستگاه اگر بست گو باش دانا داند

و شناسا شناسد که خجستگی و خستگی را مایه از کجاست

ستارگان سرهنگان دادارند و سرهنگان دادگاه با آنکه

هیچگاه از چنبر داد سر برون نیارند در منش و روش باهم

انبازی و کار جز کارسازی ندارند اگر یکے بدرشتی درستی

کار خواست دیگرے به نرمی گرمی هنگامه روا داشت

همه پیراستن و آراستن است نه سختگیری و فروگذاشت ؎

چنگر که زخمه زخم برچنگ زند | پیداست که از بهر چه آهنگ زند
در پردهٔ ناخوشی خوشی پنهانست | گازر نه زخشم جامه برسنگ زند

در آتیع فروغ بر فروزنده بیستی و به جستهٔ دلی است
برائینه هرچه از آرام و آزار و برتری و پستی است از آن رو
که رایگان بخشی و تردستی است همه سود و بهبود فرو بارد و
همه شادی و شادمانی بار آرد توانگر از مس و سیم و پرنیان
و گلیم هرچه مه و بیش و بد و بش و داد است و جدا شناس
خوب و زشت و کم و بیش پندار و سمرا داست آیا درباره
این نمودهاے بلی بود که پیوسته در زیستی پستند اینها به
بخشش برمیت که بستهٔ سخن از اندازهٔ دید و دانست
خفته خردان گزشت و سخنگوی را با خویش برو ناچار
پایهٔ چند فرود آیم تا همان گفتار پیشین سرایم گشتن آسمان
به گشتن آسیا ماند دانی که آسیا را بگردش آوری بہت
چرا ندانی که آسمان را داوری مبت به تار و پود ریسمانی
که از نگاه مهر و کین ستاره بچرخهٔ چرخ رشته اند پرده چند

بفتہ بردی ، روزگار نزد وبشتہ اند دیدہ وران نشان شناس کہ از
آفرینش ہا آفریدگاری ہمی برند کار فرمائی و فرمانروائی یزدان
از این حر پردہ می نگرندے — چون جنبش سپہر بفرمان داور است
پیدا و نبود آنچہ بما آسمان دہد — نبی بود بخشش نابود رباے
و داد گستر پیدا و زدای ہم بداد توانا را نیرو کاہ و ہم بمہر ناتوان
را زور افزای گوییم کہ بخاک خون خفتن آشفتہ سران پیل سوار
بآسیب سنگریزہ پرستوک و جان سپردن نمرود بزخم نیش
پشہ از چہ روست ہانا کہ این نشانہای روشن ہمہ باز نمود سرو آن
و زور افزائی اوست ورنہ بمن بنمای کہ این دو گونہ خستگی کہ بریک
ہنگام جداگانہ بود ناوک نگاہ کدام اختر ستمگستر انشانہ بودے
دہ آک از جم و اورنگ وافسر برد — سکندر جگرگاہ دارا درد
بر دیوزان دست انگشترے — کہ سختی رگ جان دیو و پرے
نہ یا وا آتش دانی بکیفر ہمی — سرا پی جان چرخ واختر ہمی

آری خداوند چنان که نیست را هستی ده است هستی پذیرفته را

نیست ساز نیز تواند بود و آنکه همه را در یکدم به نوید نشوید آورد

اگر دم دیگر به نوای مباش بهم زند زهره آن کراست که ازچون و چرا

دم زند درین روزگار که هر زمزمه را هنجار و هر همه را رفتار و هرکجا سیاهی

بود از سپهدار سخن پیوندی بگزار و بگو می که خود روز و روزگار به گشت

اختر شناسان سپهر پیمای بر آنند که در آن روزگار که بزم بازیزد جیرد شهریار

پارسیان ترکتاز تازیان بهم خورد کیوان و بهرام در خرچنگ انجمن آرای

و نبرد آزمای بودند اینک همان پایه ستیزد بهم اندر خرچنگ بهم پیوستگاه

بهرام و کیوان است و این شورش و پرخاش و جنگ و خواری

و خونخواری و نیرنگ و نیرنگ نمایه آنست و انا بدین گفتار کی گردد

آن تاختن لشکری دیگر بود از کشوری دیگر و این برگشتن لشکر است

از خداوندان لشکر چنانکه از داستان باستان پارسایان پارسی

بهم نمانستن این دو ستیز داو نیز هویدای دارد در آن بار که

سخن در کیش نو دایران ویران به فره و فرهنگ کیش نو فرجام
آبادی واز بند آور بندگی آزادی یافت درین بارگه گفتار در آئین
است بندیان بچشم داشت کدام آئین تازه شادمان باشند
پارسیان سخ از آتش تافتند وسوی خدا راه یافتند بندیان دامن
دادگران از دست دادند و در شکنجه دام همدمی دِدان افتادند
نمی بینی که از دامن تا دام واز داد تا دد چه مایه دُوری است داد
آنست که آرامش جُز در آئین انگریز از آئین های دگر چشم داشتن
کُوری است زخم تازیانهٔ تازیان از خوبیٔ آن کیش فرخ مرهمی داشت
روزگار در نوردِ این خستگی خجستگی اگر میداشت بار اندوه از دوش
دلهای نژند بر میداشت اگر در اندیشهٔ راز دانان بهر دانش
وداد ازین پس پیش آمدی هست بمن نشان دهند و بر دل
اندوهگین همناک سپاس نهند جهانیان با جهانبانان ستیزند
ولشکریان خون لشکر آرایان ریزند وانگاه شادی ورزند

برخویشتن نلرزند هان ای دانندگان فرّ بود و شناسندگان
زیان و سود این هنگامه به آتش خشم خداوند گرم است ورنه کارزا
پارسی اینچنین امید سوز و آرزو گداز نبودی زخمه بر تار
پریشان میرود + کاین نواهای پریشان میزنم + نادان نیم که
ستاره را بدین روشنی و گردون را بدان بزرگی بی فر و فروغ
و کارگزاری برینیان را دروغ پندارم یا از نزدیکی این دو گرونده
ورزم هرچه در هزارهٔ پیشین گذشت همان گونه اکنون چشم دارم
این رنجور بدرمان درمان آن نمی پسندد که بیچاره زمینیان
که نه خرچنگ را دیده اند و نه از بهرام و کیوان جز نام شنیده اند
از نادیده و ناشنیده سخن نیارند و چنان انگارند که روزگار
که رازهای رفته و آینده در سینهٔ اوست و آلی کردن کار
نیکوان آیین دیرینهٔ اوست از درون فرهنگیان فرنگ بدست
برد سپاه بنگاله روا نداشت که لشکرهای هر سویهٔ این گروه

براین گروه گماشت نگرندهٔ نگارش دریابد که من که در نامه
از جنبش خامه گهر فرو می ریزم از کودکی نمک پروردهٔ سرکار
انگریزم گویی تا در دهن دندان یافته ام از خوان این جهانستانان
نان یافته ام هفت هشت سال است که اورنگ نشین دهلی سوی
خودم خواند و کردار گزاری جهان جویان تیموریه بدست مزد
ششصد روپیه سالانه از من خواست خواهش پذیرفتم و بدان کار
پرداختم پس از چندی که کهن استاد شاه را مرگ فرا آمد
آموزگاری شیوهٔ سخن نیز بمن بازگشت پیری و ناتوانی و انگاه
خو بزیر گوشه گیری و تن آسانی با اینهمه از گرانی گوش بار
دلهای دگران بودن و هر که در انجمن سخن گوید سوی
لبش نگران بودن ناکام در هفته یکدو بار به ارک رفتمی
واگر شاه از مشکوی برآمدی لختی به پیشگاه ایستادمی ورنه
به دیوانخانه دمی چند نشستمی و باز آمدمی و هرچه درین درنگ

رنگ نگارش یا فنی یا خود بُردمی یا فرستادمی پیشه و اندیشه

وکار و بار من این و چرخ تیزگرد درین اندیشه دُوربین که

بیرنگ نیرنگ دیگر زند و این آسایش بے آرایش پاک از

آلایش بهم برزند ۵ بنام آنکه گر دشمن وگر دوست +

نگار تیغ بی پروائی اوست + درین سال که شمارهٔ آنرا

بآئین برآورد از رستخیز بی جا برآورند و اگر آنکه را پرسی

یک هزار و دویست و هفتاد و سه شمرند چاشتگاه دوشنبه

شانزدهم ماه روزه و یازدهم مئی سال یکهزار و هشت صد و

پنجاه و هفت ناگرفت در و دیوار بارهٔ و بارهٔ دهلی

بجنبید و آن جنبش زمین را فراگرفت سخن در زمین لرز

نمیرود در آن روز جهان سوز بخت برگشته و گشته چند

از سپاه کینه خواه میرٹ بشهر درآمدند همه بی آزرم

وشور انگیز و بخداوندکشی تشنهٔ خون انگریز دیدبانان

دروازه های شهر که برون از هم گوہری و هم یگی نشگفت

که هم از پیش هم سوگند نیز باشند هم پاس نمک و هم پاس

شهر گزاشتند و مهمانان ناخوانده یا خوانده را گرامی داشتند

آن سواران سرگران سبک جلو و پیادگان تندخوے

تیزدو چون درها باز و دربانان را میهمان نواز یافتند

دیوانه وار هر سو شتافتند و هر کرا از فرماندهان و هر کجا

آرامشگاه آن مهمانان یافتند تا از کشتند و پاک نسوختند

روی ازان سوی برنتافتند مشتی گدایان گوشه گیر از بخشش

انگریزی توشه گیر که نان باتره و دوغ میخورند و در شهر

دور از کید گر پراگنده جا بجا روزگار بسر می برند همه تیراز

تیرناشناسندگان و از غوغای دُزد در تیره شب هراسندگان

نه یارگی در دست و نه خدنگی در شست اگر راست پرسی

این مردم بهر آبادی کوی و برزن تنند نه برای آنکه به آهنگ

بیکاردامن بکمر برزنند با اینهمه ازان رُو که راه آب تیزرو
بخاشاک نتوان بست دست از چاره کوتاه دیده بریکی در
سرای خویش باتم نشست یکی ازان ماتم زدگان منم که در
خانهٔ خویش بودم چون غریو وغوغا شنودم تا از پژوهش
دم زدم در آئینه در رنگ که مژه برهم زدم آوازهٔ بخون غلتیدن
صاحب اجنت بهادر و قلعه دار درارک و دویدن سواران
و پیاپی رسیدن پیادگان در راستهٔ بازار از هر گوشه و
کنار بلند گشت هیچ مشت خاکی نماند که از خون گل اندامان
ارغوان زار نشد و هیچ کنج باغی نبود که از بی برگی مانا بدخمه
نوبهار نشد های آن جهانداران داد آموز دانش اندوز
نکوخوی نکونام وآه ازان خاتونان پریچهرهٔ نازک اندام
بارُخی چون ماه و تنی چون سیم خام و دریغ آن کودکان
جهان نادیده که درشگفته روئی بر لاله و گل می خندیدند

و در خوشخرامی بر کبک و تذرو و آهو میگرفتند که همه یکبار بگرداب خون فرو رفتند اگر مرگ اخگر بار زبانه برگ که مردم از دست وی روی بناخن کنند و جامه در نیل زنند بر بالین این کشتگان بموبه خروشد و درین سوگ سیاه پوشد رواست واگر سپهر خاک گردد و فرو ریزد و زمین سراسیمه چون گرد از جا برخیزد بجاست ٥ ای نوبهار چون تن لسمل بخون لغلت ای روزگار چون شب بی ماه تار شو + ای آفتاب روے بسیلی کبود کن + ای ماهتاب داغ دل روزگار شو + باری چون آن روز تیره بشام رسید و گیتی تاریکتر گردید سیه درونان خیره کش هم در شهر جابجا رخت تن آسانی انداختند و هم در ارک بلند خسروی را آخر آسیان و نشیمن شاهی را خوابگاه خویش ساختند رفته رفته از شهرهای دور دست آگهی رسید که شوریدگان بر سپاه در هر فرود آمد نگاه خون سپهبدان

ریخته اند و چنانکه رامشگران را نوا از پرده ساز خیزد او زنگیان
از ناسازی بی پرده شور انگیخته اند گروها گروه مردم را از سپاهی
و کشاورز دل یکی گشت و همه بی آن که باهم سخن برود دور و
نزدیک یکدست بر یک کار کمر بستند و آنگاه چسان پر زور
کمری و چگونه استوار بستنی که جز به جنبش جوش خونی که از کمر گذرد
گشاد نه پذیرد پنداری این لشکرهای بیمر و جنگجویان بیشمار را
جاروب وار کمر بندیست آری رفت و روب هندوبوم بدانسان
که آرایش و آسایش اگر جویند باندازهٔ پرّهٔ کاهی گاهی نیابند
همچنین جاروب گیتی آشوب همیخواست اینک هزار لشکرگری؛
همه بی لشکر آرای آراسته و لباس سپاه دینی یکسره بی سپهدار
بجنگ برخاسته توپ و گوله و ساچمه و بارود همه از خانهٔ انگریز
آورده و با گنجینه داران روی بر ستیز آورده آئین نبرد و
ورزش پیکار همه از انگریز آموخته و رخ به کین آموزگاران

افروخته دلست سنگ و آهن نیست چرا نسوزد چشم است رخنه
و روزن نیست چون نگرید آری هم بداغ مرگ فرماندهان باید
سوخت و هم بر ویرانی هندوستان باید گریست شهرهای
بی شهریار پر از بنده های بی خداوند چنانکه باغهای بی باغبان
از درختان نابرومند رهزن از گیرودار آزاد و بازرگان از تمغا
خانها ویرانها و کلبها خوان یغما گمنامان نهانخانه نشین تا
خویش را آرایند و شوخ چشمی خویش بمردم نمایند رده رده چون
مژه خنجر آخته و نیکمردان آسودگی گزین دمیکه برفتار آیند
تا از خانه ببازار آیند هزار جا سپر انداخته دزدان بلکه در
روز سیم و زر دلیرانه ربایند شبها از پرنیان و دیبا
بستر خواب آرایند روشنگران را روغن نماند که شبانه
بکاشانه چراغ افروزند همیدون در شبهای تار چون تشنگی
زور آورد بدرخشیدن آذرگشسپ چشم دوزند تا بنگرند که کوزه

کجا نهاده است و پیمانه کجا افتاده. بی نیازی را نازم و ناپروائی را

میرم خسانی که بروز از بهر فروختن خاک زمین می کافتند و در خاک

خرده زر یافتند و کسانی که شب در بزم می از آتش گل چراغ

می افروختند در کلبهٔ تار بداغ ناکامی سوختند زیور و پیرایهٔ

تولیان شهر جز آنمایه که در گردن و گوش زن و دختر

ستمگر داست همه در کیسهٔ شهروان سپه کار ناجوانمرد است

نیم نازی که بدان نازنینان بازماند گدازادگان توانگر بردند

تا سرمایهٔ تماشای خویش سازند اکنون مهرپیشگان نازی که

از خوبان بالیستی کشید از بدان همی کشند برناکس از آن رو که با دیندار

سری در سر آورده است تا اندازهٔ اندازدی گیری بیزری یا که

خویشتن را به پیکر گردباد در آورده است و هر ستمگر از آنجا که به ناز بردم از جا

همی رود چون بدیدنش نشتابی دریابی که خس بروی آب می رود آن یکی که

او را خردی روشن و نامی بلند بود خاک کویش به آبرویش گل

کردند دیگری را که نه آب داشت و نه گهر آب از اندازه برون رفت و گهر در شمار از ریگ دریا فزونی گرفت آنکه پدرش گوی بگوی با دیهودی باد را به بندگی میخواند و آنکه نادرش از خانهٔ همسایه آتش آوردی بر آتش فرمان همی راند فرومایگان کار از آتش کام از باد میخواهند و ما از آن خستگانیم که دم آسایش و نوید داد میخواهند ع درد دلم که پیش تو افسانه بیش نیست + چشم ستاره را مژهٔ خونچکان و به + برافتادن آئین پیام کار را از روانی وا داشت هر کجا یکی بود دره بُریدن و نامه بُردان فرو گذاشت در سر رشتهٔ پیام پیام نگنجد آمد شد نامه آئین است و بس خود این کارگاه را رشتهٔ دیگر بود که نه بجنبش زخمه ها نا بزخمه جنبشی که از خویش انگیختی جهان جهان پیام از درون برون ریختی ای که در پاس کیش و آئین از سنگ سخت تری انداد نگزرد بگوئی که برهم خوردن این بربست و برنهاد دیباد رفتن

گنج بادآورد خداداد به مویه نیرزد و نارواییِ نامه و نا آگهی از
دوست ماتم را نسزد و نترسیدن دلیران از سایهٔ خویش
فرمان راندن سرهنگان بر شاه و درویش دریغ را نشاید
و دیده ازین درد روان آزار را نگرید و برین مویه سرزنش
و برین ماتم بیچاره و برین دریغ چشمک و برین گریه خنده روا
باشد و بیزاری ازین زاری و جگرخواری درین خواری سستی
کیش و نادرستی آیین شمرده شود ع چه دل نهم بگهرپاشی سخن
چو مرا + بزار آبله بر دل بود ز گرمی آه + ز کار رفته دل و دست
من چنان که مرا + نمانده شادی پاداش و رنج پادافراه + باز
این خستهٔ نشتر بستر از اندوه اندوزی سرنوشت گزشته سرگزشت
همی نویسد نخستین بار که آن بیهده ستیزان چنانکه گفته آمد
آمدند گنجی که آورده بودند بگنجور دادند و سرکه از سران بیهده
بودند بر آستان شهریار نهادند و دو نه دیر روزگار از بر درا

سپاهی و از هر رهگذری لشکری و از هر سوی اردوی گرد آورده و بدان

سرزمین روان داشت چون شاه سپاه را توانست راند سپاه

فرود آمد و شاه فرو ماند بس ۵ شاه را در میان گرفت سپاه

وین گرفتن بود گرفتن ماه   ماه نو هیچگه نمی گیرد

جز مه چارده نمی گیرد   شاه ماه گرفته را ماند

نه که ماه دو هفته را ماند   نگفتم و گفتنی بود که این آویزندگان

آوازه جوی از هر جا که پوی پوی براه روی نهاده اند زندان را

در گشاده اند و زندانیان را سر داده کهن گرفتار نو رهائی یافته

اند و به دریچه خانه رخ بخاک سود و کارکیائی سرزمینی خواست بنده

گریزپای از خداوند رو تافته آستان بوسید و فرمانروائی آباد

بومی جست کس نگوید و من نیز ندانم که برخواهنده را بار و بر یافته

از نهار چرا امید بند شگرفکاری روزگاران و روزگار شگرفکاران

است اکنون بیرون و درون شهر دهلی کما بیش پنجاه هزار پیاده

سوار را فراهم آمدنگاه است فرماندهان فرخ فرهنگ فرنگ را ازین
مرز و بوم فراخ جز کوچه که باختر سوی شهر از شهر آنمایه دور است
که نزدیک نتوان گفت در دست نیست هنرمندانه بهر آن
جای تنگ دمدمه‌ها ساخته سنگین و تندی استوار
پرداخته اند و چند توپ اژدر توپ تندر خروش گرداگرد
فرو چیده در بی آرامی از روی پاداری آرامیده اند
لشکریان شهر نشین نیز از آن میگزین که ازین شهر
فرا جنگ آورده اند ولی چند فراز بار و برده خود را در
ناورد باسران هم آورد شمرده اند دود توپ و تفنگ زیر این
گنبد پیروزه رنگ ابر تگرگ بار را ماند و شب و روز از هر دو سو گلوله
بسان سنگچه از هوا همی ریزد تابستان منی و جون است
و تابش آفتاب روز افزون دانی که خرشید در گاو
و دو پیکر چه آتش می فروزد که پنداری خود در میان همی سوزد و از

پروردگان پرواز بر روز از بی سایگی آفتاب می خورند و شب
در آن سنگهای تفته تافته از خشم پیچ و تاب اگر اسفندیار
درین رزمگاه بودی از هراس زهره در تن رویینش گداختی
و اگر رستم دستان این داستان شنودی با همه تهمتنی از بیم جگر
باختی شمشیرزنان اردوی گرد آمده از هر سوی بر روز پس از آنکه
پرتو خور جهان را فرا گیرد به نبرد شیرمردان می روند و زمین
همی نوردند و پیش از آن که چراغ مهر فرو میرد روی میگردانند
و بر میگردند درین روزان و شبان که رود اد پر روزه بیرون
شهر است سرگذشت یکروزهٔ درون شهر نیز شنیدنی دارد

در رگ ساز من نوای هست — که بمرغوله اخگر اندازد
زین نوای شررفشان ترسم — کآتش اندر نوا گر اندازد
سرگذشتی است بر زبان که زبان — بر من از خویش خنجر اندازد

آن که بر آتش سرکی و باد کردار بند ار برتری داشت با پروزند

و بر وی کار آورنده خویش بهالی ورآویخت همانا بدین
اندیشه که بی آنکه این کارگزار رازوان نمانده رازدستی
وی درانداختن گنج نهان نماند هموار و به ناهمواری کین توختی
و بدین واگویه که حکیم احسن الله خان شوگیر دبیر روزی خواه
انگریزان است میان وی و سرهنگان سپاه آتش افروختی
روزی آن تیزآهنگان با آهنگ کشتن فرزانه بیسرای ارم
آسای وی ریختند چون خواجه در آن گاه در ارک پیش پادشاه
بود آشفته چندا زآن گروه به ارک رفتند و خواجه را در میان
گرفتند خداوندبنده نگهدار از مهر خویشتن را بر وی گسترد
تا در آن اشتلم از گرداب آب تیغ جان برد اگرچه بروانش
گزندی نرسید بین آن آشوب ناروا تا از دودمانش گرد برنخاست
فرو نه نشست خانه که به نگارخانه چین همانست به یغما بردند
و در آستانه ایوان آتش زدند هر زرسب و هر تخته که در آن

برکشمیری دروازه ریختند که سپاه و سپاه چرده را از گریزگزیر نماند

منی گرز دهلی برون برد داد   ستمبر ستم برد و آورد داد

پس از چار ماه و پس از چار روز   فروزنده شد مهر گیتی فروز

تهی گشت دهلی ز دیوانگان   بمردی گرفته فرزانگان

هرچند از یازدهم منی تا چهاردهم ستمبر چهار ماه و چهار روزه

درنگ است پس از انجا که اندازهٔ بست و کشاد کار بدین رنگ است

که شهر بروز دوشنبه از دست رفت و هم بروز دوشنبه

فراچنگ آمد میتوان گفت که از دست رفتن و بدست آمدن

شهر همان در یکروز بوده است کوتاهی سخن پیروزی

یافتگان و سرپنجهٔ دشمن تافتگان هم بدان راسته بازار

که در پیشروی پیش روی داشتند شتافتند و کشتند

هرکرا در رهگذر یافتند از بلند پایگان و فرزانگان شهر

کس نبود که سرای را در فرو نبست و به نگهبانی گوهر شهوار

بجای پنجه‌های فارسی بیکنم

۲

آبرو نشست ازان سیاه زشت سرشت که در شهر جا
داشتند بسیاری را اندیشه به گریزدانگی زارگ گردن
به ستیز رهنمون شد ها ناآوارهٔ چند و بیچارهٔ چند با شیر
مردان شهر کشای آویختند و بگمان خود خون دیگران
و بدانست من آبروی شهر ریختند دو سه روز در شهر از
کشمیری دروازه تا چار سوهر سر را و رزمگاه مانده و اجمیری
دروازه و ترکمان دروازه و دهلی دروازه این سه دربند
بدست این توده سیاه ماند ماتمکدهٔ این مرده دل به پهنای
شهر در میان کشمیری دروازه و دهلی دروازه بوده است
چنانکه دوری هر دو دروازه ازین کوچه بیک اندازه بوده
است باآن که کوچه را در فراز کرده اند هنوز آنمایه دلیری
می گنجد که در میکشایند و برون میروند و سامان خورواشام
همی آورند گفتم که هزبران خشمگین و میکه در شهر پا گزاشته اند

از سر آتش جستند و در بایستگاه ای دگر به گرده خویش پیوستند
واندی از سران با چندی از کهتران در بیلی گارد که در لکنؤ
نام آور جاییست نشستند: واز پردلی در برودی دشمن و دوست
بستند کاردان بسیاردان شرف الدوله که بروزگار اورنگ
نشینی خانان اود دستور گفته میشد به برش دید از بود و
نبود آن گرده اندک شماره فراوان شکوه کودکی ده ساله را
از فرزندان واجد علی شاه برودی برداشته بر چار بالش
نازنشاند و او را دستور خسرو بند و خود را پیشکار و دستیار
دستور خواند نام آور هما بدام آور را نازم که تاردی بکار سازی
آوردیکی را از گزیدگان با پیشکشی بایسته گسیل کرد و فرستاده
آمد و دو روز از رنج راه آسود و بیارگاه رفت و دو توسن
آهو تگ و دو پیل الوندرگ و یکصد و بست و یک دژ رست
و زرین کلاهی به رنگارنگ گوهرهای نابسوده آموده گزراند

وجفت بازوبند الماس پیوند از بهر بانوان بانوی هنگوی

فرستاد پنداری این فره و فرتاب بخانه روشن کردن

چراغ همیمانست و روزگار از بهر رساندن چشم زخم چشم

درراه این بار نامه داشت دمیکه شهریار از پیشکش او د

کام یافت کارنامه آئینه و سکندر بر هم خورد و هنگامه جم و جام

انجام یافت بخت که در غوغای سپاه و سراز خواب گران

برداشته بود بچشم نیم باز باز فرو خفت لی لی اختر بخت

خسرو در بلندی بجائی رسید که رخ از خاکیان نهفت

جائی که ستاره شوخ چشمی ورزد | افسر افسار و گرزن ارزن ارزد
خورشید ز اندیشه جا در گردش | بر چرخ نه بینی که چسان می لرزد

روزی که این ناخجسته هرد میانجی گری و شاه رهی پروری

کرد فردای آن که دوشنبه لبت و چارم ماه تازیان و چارده همین

روز از ستمبر بود سایه نشینان دامن کوه بدان فر و شکوه

اسمانه به پرچنین کاری بهم پیوسته بود خاکستر شد و فرو ریخت و دیوارها دود اندود گشت گوئی آن کاشانه در ماتم خویش کبود پوشید ؎ فریب مهر زگردون مخور که این بیمهر * دهد فشار کسی را که در کنار کشد * زنهار بزار زنهار هیچ رنجی از روسیهی با خواجه اینچنین کین نه ورزد تا مادرش وزان کنونه کرد مشتان بوده باشد باز نگرفته باشد این ریمن خواجه کش که رخ آبله خورد او را چشمی دریده و دهانی فراخ داده اند خود را در پری وشی سیمین ماه و ناهید می شمرد هر گجا جفته گردان وکرشمه سنج گزرد سنجد که در خرام از کبک گوی وازند رو گرو همی برد نامش ازین رهگزر که گدازاده گمنام است نمی برم ولغزیدنی درخور آفرین سروده هم ازان راه که میگزشتم همیگزرم بلند آوازگی نام شهریار از گرد آمدن پیاده و سوار بر هر کرا در هر گوشه و کنار بشور آورد تفضل حسین خان نام آورد فرخ آباد

پیچیده بر سر شانه ... ... فرو ریخت ... ...

که گاهی بگرایش رودی و به نیایش خوی نداشت هم ازدو پیشت

به پیشگاه خسرو سود و دران نیایش نامه که خامه فرسود خود را

به دیرین بندگی ستود خان بهادر خان نامجوی بیرایه بوی که

در بریلی از روی لشکر گرد آوری به انداز لشکری گردن

افراشت یک سد و یک زرین درم و پیل و اسپ سیمین ستام

به درگاه روان داشت چشم بد دور فروزنده گوهر نواب

یوسف علیخان بهادر فرمانروای رامپور که از دیرباز دران

سرزمین به مرزبانی و شاه نشانی نیاگان خویش را جانشین است

و احبا نبا ان انگلند در مهر ورزی و یکدلی استواری پیمانش

بدان آئین است که دست روزگار در هزار سال بهزار گونه

کشاکش آنرا نیارد گسست چار ناچار لب فرستادن پیام خشک

زبان همسایگان از گفتگو بست در لکهنو ازان پس که لشکریان

بند آزرم گسستند و گیتی ستانان انگلند نگرویدند و انبندوا

گشتن بهوای چند و سوختن برای چند روا داشته اند آری
در جایگاهی که آنرا بجنگ گیرند کار بر مردم همچنین تنگ گیرند
بوادیدا این خشم و کین همه را از بیم رنگ بر روی شکست از نامداران
و خاکساران و دوربینان و پرده نشینان آنمایه که کس نیارد
شمرد از راه آن بر سر دروازه بدر رفتند و در آباد و چه ا
دگورگاهای بردن شهر دم گرفتند تا کدام هنگام از بهر
بازگشت اندیشیده باشند یا در آنجا نیز نیاسوده بگرد اوا
بمرز و بوم دیگر رسیده باشند امر نگار کردار گزارانه دل
در برتپید و نه پای از جای جنبید نه رفتم و گفتم که چون گنهگار نیستم
بسرزنش سزاوار نیستم نه انگلیسیان بیگناه کش و نه آب و
هوای شهر ناخوش مرا چه افتاده که در اندیشه های تباه افتم
و افتان و خیزان براه افتم در گوشه بی توشه با خامه سیه
جامه همزبانم و هم از مژه شوراب بارد و هم از رگ خامه خونابه فشان

پرتیمیه ستم و بی برگ خدایا تا چند   بسخن شاه شوم کاین گرازکان منست

فرمانیکه در ناآغاز روز رفت برگردد و ولاد بر آن که برآفریده راهبران

گاه سرنوشت نوشته و برنا و فرناتش را فراخور آن سازشت

شریه اندرم و آرام ما نیز هم از روی آن فرانمان است برآئینه

آن به که نه از بیدان و بیگران باشیم و چنانکه کودکان هر

بازیچه را بشادی گرمه نیرنگ شگفت آورد و نگار بزار زنگ را

در پیرانه سرکه بخشنودی نگران باشیم آدینه روز که بت دشنم

ماه ماتم و نزد همین روز از ستمبر بود بگام چاشت در آن کنونه

که این چنبر واژگونه پایه از پایه های کژدم برکناره خاوری داست

بخشنده شور درخشنده هور در یکی از پایه های پائین خوشه

گرفت و بر چشم جهان بین جهانیان از تیرگی بیدا در رفت درین

بجروزرد سیاهان گم کرده راه از بیرون و درون شهر

بهمن گرازان گریزان رفتند و کشورگیران شهروارگ سرتاسر

روئی نیست لشکریان کلبهٔ چند را در شکسته اند نه آرد در انبان دیده اند و نه روغن در آوند گفتم روزی خواران به که سخن از آوند و انبان و روغن و آرد نیارد روزی ما بر کم یا بیش است که ما را فرو گزارد سپاس ایزدی بخشش ناگزاردن اهریمنی است درین روزها کیابرانیم که زندانیانیم و بدرستی که زندانیانه زندگی میگزرانیم نه کس می آید تا اگر غمخوارش بگوش خورد و نه خود بیرون میرویم تا دیده دیدنیها نگرد هر آئینه می توانیم گفت که گوشهای ما کر است چشم ما کور و بیرون از این گوگوی و کشمکش نان ما شیرین است و آب ما شور روزی ناگهان ابر آمد و باران بارید چادری بستیم و خمی زیر آن نهادیم و آب گرفتیم گویند ابر آب از دریا بردارد و بر روی زمین فرو بارد این بار ابر گرانمایه هما سایه آب از چشمه زندگی آورد هر آئینه آنچه سکندر در پادشاهی جست این تلخکام شوربه انجام در تباهی یافت

غالب شود کو تهی از دست ما

ایاغ تهی
ناشتا
انبان ترا
انبان
یزداں

زانسان دہدم کام کہ بسیار زبانم   گناہ آنست کہ بدان آئین کہ سخن
برون ازین نوردنورد و برسن تابی آواز پیچشی در تار گفتار اندازم
و پارهٔ از کار و بار و ماند و بود خویشتن آشکار سازم ؎ مرہم ز داغ
تازه بر زخم جگر نہم + پیکان ز دل بکاوش نشتر بر آورم + امسال کہ
آغاز شصت و دو و ہمین سال است کہ درین کہن خاکدان خاکبازی
و از پنجاه سال در ورزش شیوهٔ سخن جانگدازی میکنم و پنج سالگی
پدرم عبدالله بیگخان بہادر را کہ بر روانش از جہان آفرین
فراوان آفرین باد چراغ ہستی فرو مرد گرامی او در من نصرالله
بیگخان بہادر مرا بپسر خواند و بناز پرورد چون پیکر پذیرفتن
من شمار نہمین سال پذیرفت بخت بیدار من ہمانا ہم او درو ہم
خداوندگار من بدراز خواب نیستی خفت ستوده جا ہمنہ
بسروری چہار صد سوار با جرنیل لارڈ لیک بہادر پیوند پیمان
جانفشانی داشت و از بخشش آن جہانستان جہانبخش در نزدیکی

شهر از پانزدهم ستمبر بر خانه و هر کلبه را در فراز است و فروشندگان و
خرندگان ناپید ا گندم فروش کجا که دانه خرند گازر کو که جامه بهر شستن
بوی سپرند گرّا را کجا جویند که موی سترد پاکار را کجا یابند که پلیدی
ببرد باری در آن بحر و زچنان که گفتم میرفتند و آب همیشه و نمک و
آرد گاه گاه اگر می یافتند همی آوردند سپس آن فرجام برجاست
و دروازه سنگ بست و آئینه دلها زنگ بست گردید ۵ هنگامه
گرم سازی کوشش بجا نماند ٭ خون همچنان به آتش سوزان برابر است
خوش و ناخوش از خورش هر چه یخنی بود خورده شد و آب بدان کوشش
که پنداری چاه بناخن کنده اند آشامیده آمد دیگر در کوزه و سبو
آب و در مرد و زن تاب نماند روزگار گذشتن روز به شکیب و
دست بهم دادن آب و دانه بغریب سیری گشت ؛ دو شبانه روز
در تشنگی و گرسنگی گذشت ۵

فریاد از آن زاری و خونابه فشانی
فریاد از آن خواری و بی برگ و نوائی
فریاد ز بیچارگی و خسته درونی

فریاد ز آوارگی و بی سروپائی   سوم این روز چنانکه در آن

هنجار سخن سروده آمد پاسداران از سپاه مهاراجه آمدند و نشستند

و کوچه نشینان از بیم درآمدن لغمائیان رستند هرچه باداباد

گویان رفتند و از سرهنگان دستوری برون شد گرفتند چون

پاسبانی از دوستی بود نه از دشمنی خواهش بدینگونه روائی گرفت

که تا سر بازار چارسو میتوان رفت آنسوی چارسو کشتنگاه و بیمناک

راه است از شومی پاس بیرون و به پاس رهنمون فرومانده گان

بند از دروازه برداشتند آگنش و مشک و خیک فرگفت سیر غ

و شهپرش داشت از هر خانه مردی و از چاکران من دو تن رفتند

چون آب نوشین دور بود و دور نمی بایست رفت ناکام

آب نیم شور در خم و سبو آوردند تا آن آتش که نام دگرش

تشنگی است بدان نمک آب فرونشست برون روندگان

و آب آورندگان میگفتند که درین کوی که ما را ازین پیش برنتن

گرفتند غوغای زد و گشت و گیر و دار تا بدین کوچه نیز رسید
و همه را از بیم دل دو نیم شد باید دانست که این کوچه جز یک راه و
بیش از ده دوازده خانه وار ندارد و چاه درین کوی نیست بیشتر از
زن و مرد بدین نورد که زن را بچه در آغوش است و مرد را پشتواره
بر دوش بدر زدند تنی چند که بجا مانده اند به بداستانی من که
از سخن پذیری گزیر نداشتم در از درون بستند و پیرامن آن
سنگ بسنگ بهم پیوستند تا کوچه چنان که بسته بود دربسته نیز
شد ~ جان اگر خسته تر از تن بودم نیست شگفت + زانکه دل
تنگ تر از گوشهٔ زندان منست + درین بستگی کشایش پدید آمد رود داد
اینکه مهر چهر کیوان ایوان بهرام رام راجه نرندر سنگه بهادر فرمانروای
پتیاله درین یورش با کشورکشایان همراز و سپاهش از آغاز با لشکر
انگریزی در جنگ و تاز انباز بوده است و تنی چند از ویژگان راجه
که بسرکارش در نوکری از پایه برتران و بشهر در توانگری از نام آورانند

همانا حکیم محمود خان و حکیم مرتضی خان و حکیم غلام الله خان که از
تخمه و نژاد مینو نشیمن حکیم شریف خانند درین کوچه میهمانند
آستان در آستان و بام در بام دورویه تا دور تارستان
ایمان و نامه نگار را ز ده سال همسایهٔ دیوار بدیوار یکی ازان خجسته
آیینانست نخستین کس ازان سه تن با گروهی از پیوستگان و
پردگیان به آئین نیای خویش در شهر جا بهمندا نبری برد
و آن دو تن دیگر در پتیاله به همدمی و همنشینی راجه کامرانی
میکنند چون کشایش دهلی دلنشین بود راجه را از راه بهی پروری
بازور آزمایان نبرد پیمای پیمان این بود که چون به بهروزی
پیروزی گزینند پاسبانان بر در این کوی نشینند تا
لشکریان انگلند که آنان را گوره خوانند به کاخ و کوی
آسیب نرسانند در سپردن راه سخن. ازان که ربودگانی
چند به بهنارهٔ سپرد و بازوی براه آورد گزیر نیست در همه

اگرچه بر دو پرگنه دسترس فرمانروائی و مرزبانی داشت پس
از وی بر دو پرگنه بسر کار انگریزی بازگشت و بهر من و برادر من
که با من از یک پدر و یک مادر است اندک مایه زری بجای آن
جاگیر سرمایهٔ آرامش و نازگشت چنانکه درین سال که یکهزار و هشتصد و
پنجاه و هفت نویسند تا پایان اپریل از گنجینهٔ کلکتری دهلی یافته ام
از مستی خود آن گنجدان را در فراز و مرا کار با بخت ناساز و دل در
اندیشه های دور و دراز است پیش ازین تنها زنی داشتم و پسری
و دختری نبود کما بیش پنجاه سالست که دو کودک بی مادر و بی پدر هم
از دودهٔ آن زن که خون منش بگردن بفرزندی برداشته ام
و با آن شیرین گفتاران نو بسخن آمده از مهر آمیزشی چون شیر و شکر
داشته ام اینک درین درماندگی با منند و گل و گوهر گریبان
و دامن برادر که دو سال از من کوچک است در سی سالگی
خرد بباد داد و دیوانگی و کالیوگی گزیده سی سال است که آن

دیوانهٔ کم آزار بیچاره وشی هست ولی هوش تیز بیند خانهٔ وی از خانهٔ من
جداست و گامش دوری دو هزار گام در میان زن و دخترش با
فرزندان و کنیزان زندگی در گریختن پنداشتند و خانهٔ خداوند دیوانه را
با خانه و کالا و دربانی کهن سال و کنیزی پیر زان جا گذاشتند که فرستادن
و آن ستدن و کالا را بدینجا آوردن اگر جادو دانمی نتوانمی این خود گران
اندوهی دیگر و بر دل از بار این اندوه کوهی دیگر است دو کودک نازنین
از پرورد شیر و شیره خوابند و میوه و تره جویند و دست به روائی خواهش
نرسد هی هی چه جای این گفتن است تا زنده ام سگالش در آب و نان و
چون بمیریم در خاک و خشت سخن است من همه در بند آنم که برادر شب
چون خفت و بروز چه خورد و ناآگهی بدان پایه که نمی توانم گفت

زنده است یا بسختی مرده   نه هین ناله و فغان بلبم
من و جان آفرین که جان بلبم   آنچه گفته ام جانگزاست و آنچه
نگفته ام روان فرساست از کار آگهان چشم دارم که گوش بفریاد نهند و

چون بشنیدند دار و بند در پایان زندگی که نه بهبانه روشنی و نه
به نشانه پرتو انگنی بما از روی فرومردان سوز و از راه سرآمدن روز
چرخ بامداد و آفتاب لب بام را مانم دو سال است که در ستایش دارای
دادگرای گیتی آرای و شهنشاه سپهر پایگاه ستاره سپاه ملکه وکتوریا
هنگامه نگاشتم و بستهٔ نامی که راست از دهلی به بمبئی و از آنجا به لندن
می‌رود به پیشگاه خداوند نیز پسند و داور نام آور لارڈ الن برا بهادر
که بروزگار گورنری ما من از مهر گستری آیین روان پروری داشت
روان داشتم سه راه سخن گشودم اگر خود نشد که بخت + راهم به بزم
بانوی گیتی ستان دهد + این نگارا زان هنگامه نشانی دلنشین است
و هنگامه ایستادنم و پیوند همین است کرا در اندیشه میگذشت که ایا نخستین این
کار دشوار بدین سامانی سره خواهد گشت سپس سه ماه ناگاه پیک پی خجسته
از کارگاه پیام خرامان و گل بدامان آمد و نوازشنامهٔ آن سهی سرو
بوستان سروری آورد نامهٔ انگریزی و نگارش بدین سان انگریزی

که چکامه بما رسید و ما بجز آن که پیش شهنشاه برنهیم و نزدیکان بارگاه

فرستادیم برای نوید شادمانی جاوید و پاسخ فرخ بسی روز گذشته بود

که نامی نامهٔ سرور دل بدست آور گستر ز نگاشتن بهادر همچنان دس

ستوده پیام و دیگر نامه بدین پیام آمد که در بارهٔ آن چکامه که از لارد

الگن برا بجادر بها رسیده فرمان آنست که سخن پیوند آرزومند آئین

نگاه دارد و در گزارش آن به بهانجی گری فرمانده هندروی نیاز

بدین درگاه آرد فرمان پذیرانه نیایش نامه بنام نامی گرامی

شهنشاه انگلند به پیشگاه سکندر در فریدون فر لارد کیننگ نواب

گورنر جنرل بهادر فرستاده آمد و در آن نوزشنامه از آز و آرزو

بدین انداز نشان داده آمد که خسروان روم و ایران و دیگر گیتی گیران را

با سخن گستران و ستایشگران در بخشایش و بخشش رنگا رنگ شمار رفته

و دین بگهر انباشتن و پیکر بزر سنجیدن و ده دادن و گنج فشاندن بکار

رفته این سخن گستر ستایشگر بهمه جوانی از زبان شهنشاه و سراپای

بفرمان شهنشاه و نان ریزهٔ از خوان شهنشاه میخواهد بهانا
بایخوان مهرخوان و سراپا در تازی گفتار خطاب و خلعت وجیم
نان ریزه در انگریزی زبان پنسن تواند بود والا کار فرما نواب گورنر
جنرل بهادر به پاسخ مژدهٔ درمان و فرهٔ فرمان فرستاد و آگهی داد
که نیایشنامه رسید و به انگلستان روانی گزید دل از انگیختن برخو
چندان بخویشتن بالید که خود در تن و تن در پیرهن نتوانست گنجید
پس از چهار ماه و بخشایش نامه نگاشته کلک مشکبار فرزانه جهاندار همایون
خوی فرخ تبار ستر رسل کلرک بهادر که پاسخ نگارش منت ساز
امیدواری و آزرو شماری افزوده انم که اگر آرامشی داد و از هندرم
نخوردی و از دست سپاهیان خدا ناشناس ناسپاس دادگده ها
برهم نخوردی از گلستان انگلستان فرمان با برگ و ساز رسیده
بودی و دل و دیدهٔ من چشم روشنی گوی همگر گردیده بودی اینک
آن همایون نامه که سپایهٔ آرزوی سرجوش من و کمایهٔ بازوی

خرد و سوزش منت با من است و بر کاله چند از جگر که در جوش گریه از مژه برون ریخته ام بهر نشان خون بالای مراد در دامن هست

نی کشته زخم ناوک و شمشیرم نی خسته ناخن پلنگ و شیرم
لب میگزم و خون بزبان میلیسم خون میخورم و ز زندگانی سیرم

چهارشنبه سی ام ستمبر روز بندهم از گشایش شهر بستگی دروازه کوچه آگهی آوردند که یغمائیان بخانه براور ریختند و گرد از کوچه و کاشانه انگیختند میرزا یوسف خان دیوانه و آن فرتوت مرد و پیره زن را زنده گذاشته اند و آن زن و مرد سالخورده بهمپائی و دستیاری دو هندو که درین گیر و گریز از جای دگر آمده در آنجا دم گرفته اند و سرانجام آب و نان کوشش دریغ نداشته اند نهفته مباد که درین شهر آشوب گیر و دار چنان که در هر کوچه و بازار ستم را یک هنجار نیست سپاهیان را نیز در خونریزی و انداز و انگیز یک رفتار نیست اگر آزرم و در سرزنش است فراخور خوی و منش است دانم که درین تاخت فرمان نه آنست که هر که گردن ننهد

از سر خونش درگذرند و اندوخته برند و هر که چیره شود در نورد سرمایه

ستانی جانش نیز بنگرند هر آئینه برگشتگان گمان میرود که گردن

کشیده اند تا سر بر دوش ندیده اند آوازه نیز همین است که بیشتر

کالا همی ربایند و جان نمی گزایند کمتر و آنهم در دو سه کوچه بخت سر از تن

و سپس [illegible] از زمین برداشته اند و کشتن پیران و کودکان و زنان

روا نداشته اند خرام خامه در نگارش آمد چون بدینجا رسید ره انجام

از رفتار باز ماند مگر بانگ بر توسن زنم تا گام پیش نهد خدا را ای خدا

پرستان داد ستان ای ستم نکوه اگر در ستایش داد و نکوهش ستم زبان

شما با دل یکی است کردار هندستانیان یاد آورید که بی آن که دشمنی را

از پیش پایه و کین را از بخت برآیه بوده باشد و همه کس داند که خداوند

کشی گناه است بر خداوندان خود تیغ آختند و زنان بیچاره و کودکان

در خورد گهواره را تن از روان پرداختند اینک انگلستانیان را

بنگرید که چون از روی کین خواهی بجنگ برخاستند و بهر گوشمال

انبگاران لشکر آراستند از آنجا که از شهریان نیز دلی برداشتند
جای آن بود که پس از چیره دستی در شهر دهلی سگ و گربه را زنده
نمیگذاشتند آنچنان خشمی که پنداری آتش در جگر زبانه میزد فرو
خوردند و بر اندام زنان و کودکان تار موئی نیازردند هم از بهر
خداشناسی بیگناه از گناهگار است که بجان و جامه و جا زینهار داده اند
و هیچکس را جز کسی که از بهر بازپرس سوی خویش خوانده اند آزار نداده اند
از فرومایگان شهر بسیاری را برون رانده اند و اندکی همچنان در بند
بیم و امید فرو مانده اند درباره بیابان گردان بیغوله نشین
هیچ فرمان نیست مگر در برون رفتگان و درون خفتگان را درمان
نیست کاش درونیان و بیرونیان را از مرگ و زیست یکدیگر آگهی بودی
تا بیتابی و پراگندگی روی نمودی اینهمه خود از بهر دانستن بسند است
که هرکس هر جا که هست مستمند است اگر با تشنگان دم سرد
اندر به رنجگان هرزه گرد همه را دل پر از درد است و همه را

از بیم مرگ سرخ رخ زرد و بچشم اکتوبر روز اندوه اندوز دوشنبه
چاشتگاهان ناگاهان گوره چند از راه دیواری که بدروازه سنگ
بست پیوسته است فراز بامی برآمده از آنجا بجستن در کوچه فرود آمدند
چون دورباش سپاهیان راجه نرندر سنگه بهادر سودمند نیفتاد
از دیگر خانهای کوچک چشم پوشیده جائی که نامه نگار بود آمدند
از روی خبلی خوی خویش از همه کالا دست برداشتند و مرا با آن دو
کودک فرخ دیدار و دو سه غمخوار و تنی چند از همسایگان نکوکردار ۵
گرفتند و بردند و بگذاشتند + از کوچه دورتر از دو تیر پرتاب و آنهم
برنج و آنج و تب و تاب نرفته ام بیش اندازه دان و دانشور کرنیل
برون بهادر که این سوی چارسوی بکاشانهٔ قطب الدین سوداگر
فرود آمده است بردند با من بنرمی و مردمی سخن گفت و از من نام
و از دگران پیشه پرسید و بخشنودی همدسان زودی سوی
آرامشجا پدرود کرد یزدان را سپاس گزاردم در آن خجسته خوی

آذرین خواندم و باز آمدم چهارشنبه هفتم اکتوبر و چهار دین پاس

از روز بست و یک بانگ توپ شنیدن انواخت و دانستن را

بشگفت زار انداخت خدایا آمدن لفتنت گورنر بهادر هفده آواز

و رسیدن نواب گورنر جنرل بهادر نوزده آوازه شگون دارد

بست و یک نوای هوش فزای راتنو چیست روز دیگر هیچ از

سوی سکنا ست و بر آگهی نفزود گمان کنیم که همواره سازندگان

نشیب و فراز کشور را و جای دگر بر سرکشان پیروزی روزی

گردیده است نهان مماناد که هنوز سرکشان گروها گروه و فرسنگ

در فرسنگ و گروه در گروه در بریلی و فرخ آباد و لکهنو شور انگیزی

و هرزه ستیزی آماده اند و ولی که خون باد به پیکار بسته دوستی

که بریزاد به پیکار کشاده اند دیگر در سرزمین سوهند و نوه میواتیان

بدان پیرایه روی شور برداشته اند که پنداری دیوانگان را بند

زنجیر گسسته است و تلارام نام پرخاشخری یکچند در ریواڑی

هنگامه‌آرا مانده‌ست پرنمونی دلیرا همی پیوسته است این گروه را
در آن دشت و کوه جداگانه با جهانداران سر جنگ و ستیز است
گویی آب و خاک بند بر سو کارگاه باد تند و آتش تیز است درین
ماتم آورجا و ده که آغاز آن فراموش است و انجام آن ناپدید اگر جز
گریستن به نگریستن سر داشته باشد روزن دیده به خاک انباشته
باد جز روز سیاه دیدنی نیست که گویم دیده‌ام آن دیده و برتخت دیدار نیز
پندار روز سیاه خود چیزی است که در تاریکی آن هیچ توان دید
برآمدن از خانه و پا نهادن بر آستانه پیمودن زمین بازار و
کوی و از دور نگریستن چارسوی بیرون از آن روز که سرهنگان
فرنگ بیرون نم برده‌اند روی نموده است گویی دانش گنجور گنجه
از زبان من همی گوید ــ ندانم که گیتی چسان میرود * چه نیک و چه بد
در جهان میرود * ازین دردهای دارد گمزین و زخمهای مرهم
نپذیر آن می‌بایدم اندیشید که من مرده‌ام و مرا از بهر باز پرس

انگیخته اند و تجیغ گرداندی گوبید: سه ازیر در چاه دوزخ
آویخته اند ما چارجاودوان درین بند خسته و نژندی باید زیست
سه آه اگر باشد همین امروز من فردای من + سرتاسر این نگارش ها
آنست که برمن هیر و ویا آن خواهد بود که شنیده میشود اگر آن گفته ام که شگفته آ
کس گمان نبرد که من آراسته شده و بشیم یا کاسته برده باشم از گروه آ
بخدای بیاهم و براستی ستمگری میخواهم دیده بسیار است و زال در بند
لب خاموش و دریوزه آگهی از دربانها بکشاول گوش بر آگداپی و انگاه
بیند بپیرو پانی واین که فرجام کار پادشاه و پادشاهزادگان که زندگاه
داستان کشایش شهر بابلی نخست نگاشته ام نیز لا و برین است
که مرا اندرین نامه شنیدن سرمایه گفتار و هنوز سخنهای ناشنیده
بسیار است هر آئینه آن بجوییم که چون ازین تنگنا برون آییم
رازهای ناشنیده از هر سو فرا آرم و رازها از روی نبشتن
راز آرم امید که نگرندگان نگارش دلیلی و پیشی نه دیدار از روی

داد خرده بر من نگیرند. نوزدهم اکتوبر همان دوشنبه که نامش از
سیاهه روزهای هفته همی باید ستردن بادمی چون اژدر آذرفشان
جهان را در خویش فرو برد همانا در پاسخ نخستین آن روز دربان
دژم روی ژولیده موی مژدهٔ مردن برادر آورد و میگفت که آن
گرمرو راه نیستی نیمروز بسهمی تب سوزنده زنده ماند و شبانگام در دل
شب توسن ازین تنگنا برون جهاند از آب و آئین بگذر و مرده
شوی و گورکن مجوی از سنگ و خشت مپرس و از آژده و آژند مگوی
دگر بگوی که چگونه روم و کجا برم و در کدام گورگاه بخاک سپرم از
پرنیان و دیبا ناگزیر پاس نازیبا هیچ چیز در بازار نمی فروشند
فرودان زمین کننده و به بیل و کلند کار کننده گوی هیچگاه در
شهر نبوده اند هندو همی تواند که مرده را به دریا برد و بر لب آب
در آتش سوزاند مسلمانان را چه زهره که دو سه کس همپای یکدگر
دوشادوش براهی گزرند چه جای آن که مرده را از شهر برون برند

همسایگان بر تنهائی من بخشودند و بسر انجام کار کمر بستند یکی را از سپاهیان
بنیاله پیمایش و دو تن را از چاکران من با خویش گرفتند و رفتند و تن
مرده شستند و در دو سه جا در سپید که از اینجا برده بودند پیچیدند
و به نمازگاهی که به پهلوی آن کاشانه بود زمین کندند و مرده را
در آنجا نهادند و مغاک بخاک انباشتند و برگشتند ٥

دریغ آن که اندر درنگ سپنج — سه و ده شاد و سی سال ناشاد زیست
به خاک بالین ز خشتش نبود — بجز خاک در سر کو خشتش نبود
خدایا برین مرده بخشایشی — که نادیده اند زیست آسایشی
سروشی بدلجوئی او فرست — روانش بجاوید مینو فرست

این فرزانه سرشت نکوهیده سرنوشت که شصت سال خوش و ناخوش زیست
و از آنمیان سی سال هوشمند و سی سال بیهش زیست و در هوشمندی
خشم فرو خوردن و در بهشتی نیاز زدن آئین داشت و در بیست و دوئین
شب از ماه بهمن سال یکهزار و دو صد و هفتاد و چهار جامه گذاشت ٥

ز سال مرگ ستمدیده میرزا یوسف — که زیستی بجهان در بزم خویش بیگانه

یکی در انجمن از من همی پژوهش کرد — کشیدم آهی و گفتم دریغ دیوانه

اندیشهٔ سخن رسان را به آرش این نگارش رسائی باد که دریغ دیوانه

باندازه اندازه که فراخور هنجار است یکهزار و دوصد و نود و در شمار است

وانچه این از کشیدن آهی که هر آئینه شانزده میتوان کاست باز میماند

همان یکهزار و دوصد و هفتاد و چهار است که درین هنگام در کار است

بنام آنکه پوزش درخور اوست — بهر جا فر و داری در اوست

نام آوران از داد و دانش بهره ور امین الدین احمد خان بهادر و محمد

ضیاء الدین خان بهادر راهروان هفته که شهر بر دست سپاه انگریز

گشایش یافت اندیشهٔ پاساد در آرزوی به باد بگزاشتن شهر گرایش یافت

با فرزندان و پردگیان و سه پیل و کابیش چهل تگاور تنها و ریویه در گشتند

وسوئی پرگنهٔ لوهارو که به نشانمندی جاوید تمغا جاگیر ایشانست

رو گشته به بند نخست به مهرولی گزارا فتاد و در آن فروغ بارگورستان

بنه و بار گشودن و دو سه روز آسودن روی داد و در آن درنگ
لشکریان لیغا بیتهٔ بنگاه را فرو گرفتند و جز رخت تن هر چه بود ستدند
و رفتند گمر آن هر سه بیل که همراهان مهر کیش و همدمان به اندیشه آغاز
آن آشوب مد برده بودند از بهر نشان زیان زدگی چون سه خرمن
سوخته بجا ماندند شتلم لیغا دیدگان و آزار دستبرد کشیدگان به بیسر و سامانی
چنانکه دانی سوی دو جانه ره نورد شدند تا بدار پسند دیده کرد احسن جهانیان
بهادر از راه مردمی و جوانمردی پذیره شد و خانه شمامت گویان
به دو جانه برد و درازی گفتار پیشکش ستوده سرور در سروری با همراهان
آن کرد که خسروایران در خسروی با همایون همان کرد صاحب گنج بهادر
دهلی پس از آگهی سوی خود خواند بشهر رسیدند و فرمانروا را دیدند داور
لختی به بیغاره سخن راند چون آزرم آمیز پاسخ شنفت دیگر هیچ نگفت
و در ارک ایوانی به پهلوی ایوان خانسامانی نشان داد و در آن جایگاه
بفرو د آمدن فرمان داد پاس همواری را گزارش نگذاشت که کردار

گزار سرگزشت ویرانی این خانمان می نگاشت چنان دان که دیمهر ولی
برخداوندان خانه دست یغما دراز گشت و در دہلی خانہ ہای بی خداوند
پامال ترکتاز گشت هرچه آنجا باخویش برده بودند جز نیم جانے که
به دو جانه بردند همه روزی یغمائیان شد وایدنجا در خانه و کاشانه
و کاخ و کوخ بیرون از سنگ و خشت و کلوخ هرچه بود بتاراج رفت
نه از سیمینه و زرینه نام و نشان ماند و نه از گستردنی و پوشیدنی
باندازه تار موئی در میان ماند ایزد بر بیگناہان به بخشاید و این
آغاز نا سازرا خجسته انجامشی و این آزردگی را آرامشی پدید آید
همانا شنبه هفدهم اکتوبر بود که این دو فرزانه یگانه در شهر گام
زدند و چنانکه گفتم در ارک دم از آرام زدند پس از دو سه روز
ازین روداد بر سیاه فرمان رفت تا رفتند و عبدالرحمن خان
مرزبان جهجر را بدانسانکه بزه مندان را آورند آوردند و در ارک
بگوشه ایوانی که آنرا دیوان عام نامند جا دادند مرز و بومی که

مر این مرد را بود به جنبر جهانماری و بلج ستانی سرکار انگریزی
درآمد روز آدینه سی ام اکتوبر احمد علیخان شهرکیای فرخ نگر را
چنانکه آن یکی را آورده بودند آوردند و در ارک دهلی بگوشهٔ
جداگانه نشستنگهش ساختند شهر فرخ نگر زیر دست زد چابکدستان
خانه برانداز شد و اندوخته های شهریان بباد رفت دوشنبه
دوم نومبر بهادر جنگخان کنار نگ بهادر گڈه و داوری گرفتار آمد
و در ارک بجائی که نشاندند نشست شنبه هفتم نومبر در آن سرای
که در ارک جا بجا دور از هم گرجا دارند از آمدن راجه ناهر سنگه بهادر
مرزبان بلب گڈه یک کس در شمار افزود راز پژوه فرا رسد که مرزبانی
پیرامن دهلی که در فرمان بری به اجنتی دهلی همی پیوند داز روزهای
هفته در شمار بیش و کم نیست جهجر بهادرگڈه بلب گڈه لوهارو فرخ نگر
دوجانه پاتودی همین هفت جاست فرماندهان پنج سرزمین
در ارک دهلی چنانکه گفتم جاگزین و آن دو تای دیگر در پاتودی و

دو جانه ناوک بهم زانشانه تا دگر چشم جهان بین ایشان از روزگار

چه بیند و کار آنان بکدام هنجار پایان گزیند بلی آنکه گویم نهان ماناد

نهان نمیتواند ماند که مظفرالدوله سیف الدین حیدر خان و ذوالفقار

الدین حیدر خان که حسین میرزا مهر خوان اوست درین هنگامه چون

دیگر آیمندان باز نان و فرزندان از شهر برون رفته اند خانها

پر از در بایستهای گرانمند بجا گذاشته راه بیابان گرفته اند ماند

جای این دو روشن گهر کاخی چند و خانهٔ چند و ایوانی چند است

همه با یکدگر بهم پیوسته چنانکه اگر آن همه زمین را به پیمایش دارآری

اگر نه باشهرے باری برابر شماری شارستانی بدین بزرگی در آن

گونه که سرتاسر از آدم زاد تهی بود بجاروب تاراج رفت و رُوب

یافت و ترت و مرت و تار و مار شد گر از کالای شگب بهاے

گران سنگ پردهای ایوان و خرگه و سایبان و زیلو و دیگر گستردنی

ماند آن نیز آن ماند بجای بجای ماند ناگاه بشبی که آبستن روز

گرفتاری راجه با بستگان بود و زان ریخت آتش در گرفت و زبانه زد

و چوب و سنگ و در و دیوار را سوخت آن سهمیت با ختر سوی سرای

من بدان نزدیکی است که در آن نیم‌شب فروغ آتش فروزان از

فراز بام همی نگریستم و گرمی دود به چشم و رخ من میرسید و از آن رو که

در آن دم باد برین می وزید خاکستر به پاهای من همی افتاد آری

سرود خانه همایه گلبانگ رود آور زد و دار و آتش زبانه سمایه خاکستر

چرا نبارد چنین خامه کردار گزار که برفتار مور نیم مرده باندازهٔ چه پایه

گرد تواند انگیخت که نگریستن آنرا در باید از شاهزادگان بیرون از این

نتوان سرود که اندکی را اژدهای مرگ بدان زخم گلولهٔ تفنگ فرو بود

و چندی را در خم بند چاه آویزه کش رسن روان در تن افسرده

چندان از آنمیان زندان نشین اند و شمرده چند از آن دودمان آوارهٔ

روی زمین بر باد شاه ترک آرامگاه که ماتم زده تاب و توانست

زبان گیر و دار به اندازه باز پرس روانست دد کیای جهجر و بلب گڈه

وچهار بالش آرای فرخ نگر را جدا جدا بروزهای جداگانه بگلو آویختند

گوی بدانسان گشتند که کس نیارد گفت که خون ریختند در ماه جنوری

آغاز سال یکهزار و هشت سد و پنجاه و هشت هندوان فرمان آزادی

و فرازمان آبادی یافتند و از بر جایگاهی که در آن بودند سوی شهر

شتافتند مسلمانان از خانمان آواره را بسکه اندیشیدن سبزه در دیوار

خانهای آنان سبز است بر دم از زبان سبزه سر دیوار این نوا گوش

میخورد که جای مسلمانان سبز است مگر فرمانده شهر را از گفتار رازگویان

نسازخوی در دل گزشته باشد که کاشانهٔ پزشکان راجه نرندر سنگه بهادر

فراهم آمدگاه و پناه جای مسلمانان است و نگفت که از هنگامه گرم

سازان بزه تا زیکه و تن در آن انجمن باشند بدین اندیشه روز

شنبه دوم فروری با گروهی از سرهنگان بدان جایگاه روی

آورد و خداوندان خانه را با شصت کس دیگر از زنهار جویان آمیده

درون با خویش برد اگرچه شبا روزی چند همه را بدان دریگاه داشت

پن آبروی اَبمندان نیز نگاه داشت بجشم فروری روز آدینه
حکیم محمود خان و حکیم مرتضی خان با او درزادهٔ خویش عبدالحکیم خان که
حکیم کالی مهرخوان اوست فرمان بازگشت یافتند و آدینه دگر دوازدهم
فروری تنی چند دگیر و شنبه سیزدهم فروری سه کس دگیر باز آمدند
وازهمه فزونتر درنوا خانه ماندند ازین آشوب که در همسایه خاست دورین
برابر که درکوی افتاد این درویش دلریش را نیز دل بجای نماند با آنکه
درآن دار و گیر با من پژوهشی نرفت هنوز آن بر وند و دوله بودن
و شب دلشاد نغنودن که نه بیجاست همچنان بجاست همه درین ماه فروری
فروزی که ازین فرهنگاخ تا فروردین که روزگار روز افزونی فره
فروزنده مهر است همه یکجا به راه مهر سپهر است آوازه آمد آمد مهربان
داور مهر پیکر پروین لشکر سرجان لارنس صاحب چیف کمشنر بهادر
بلندی گرفت از آنجا که آئین من باداورانی که بهر فرماندهی بدین
کشور و بیژه بدین شهر گرایند روان داشتن چکامه های ستایش

آنمود است در ستایش آن والا شکوه جامه در گیرند و بچشم
روشنی فرجام پیروزی و روان افزای با دنورودزی سرانجام
دادم و روز آدینه نوزدهم فروری بستر شتیه یام فرستادم شنبه
بستم فروری هنگام شام بست و یک بانگ توپ دیو غریو نهنگ
آهنگ و بگاه دیکشنبه مژده گشایش شه لکنو جین بگ شنیده آمد
که شانزدهم فروری فروزنده اختر آسمان سروری سپه سالار نام آور
کمندر ان چیف بهادر در یورش بدان روش بر سپه سویان ستیزه
جوی سپه راند که سپهر سپهبد نمایه دست مرتجاد گفت و چندان
آفرین باد خواند که لبش تبخاله زد و زبان از جنبش باز ماند جهان را
به آبادی مژده و جهانیان را به آزادی نوید که آرزوی آزادان
و نیک نهادان برآمد و بدان و بدگهران را در آنجا نیز روز و روزگار
سرآمد دگر ره شنوده شد که به نوا آوردن توپ دمیدن شور نامی
شادیانه چیره دستی بود گردان سپاه پیروزی دستگاه در نورد

این ناورد بر شهر دست نیافته اند دلیرانه به تیغ زنی و دشمن افگنی
شتافته اند و پس از کشتن و خستن زمی بنگاه جلو تافته اند روز
گیتی فروز چهارشنبه بست و چهارم فروری بهنگام همایون چاشت ؎

بوستان داور را آزاد سرو   آسمان جاه را تابنده ماه

فرخ روی فرخنده خوی چیف کمشنر بهادر ستاره سپاه به نشان
سم رخش سرزمین دهلی را آسمان آسا ستاره زار ساخت و تفیر زده
آواز توپ دلهای خسته را به نوید مرهم مهر و آزرم نواخت ؎

در کالبد شهر روان باز آمد   فرمانفرمای شه نشان باز آمد
زین شادی و خوشدلی که رو داد بشهر   گوئی که مگر شاهجهان باز آمد

شنبه بست و هفتم فروری چون روز شب گشت و از آن شب
سه بهره گزشت دود دل دادخواهان بر ماه شب افروز دامان
راه گرفت که گمرندگان بخواست فغان برداشتند که ماه گرفت
هم بروز شنبه که نشان داده آمد فرجام دور باش برخاست

داد پژوهان رنجور را بار و آرند و مندان آذور را زنهار داد و نداد بینی

که درین شهر زندان از شهر بیرونست و نواخانه اندرون درین بر دو جا

آنمایه مردم را بهم در آورده اند که پنداری پیکر در پیکر همی خرد شماره

آنان که ازین هرد و بندیخانه در روزهای جداگانه به پیچش ریسمان

جان باخته اند فرشتهٔ جانستان واند ملمان در شهر از هزار کس

افزون نیابی و نامه نگار نیز در آن هزاریکی است دیگر از آن انبوه

که راه گریز پیموده اند مکی را در دور گردی چنان پندار که خود از ین

سرزمین نبوده اند بسیاری از گران پایان گرداگرد شهر به دو

گروهی و چهار گروهی در بیغوله و مغاک و گومه و کازه چون بخت خود

غنوده اند درین گریوه گزین گروه یا بود و باش شهر را نمو هستار اند

یا نمویشا وندان گرفتاران یا ارزانش خوار اند همانا پیسن داران

هر آئینه داد نامهای مردم از خواهش ستمگاری و آرزوی آرامش

و دریوزه. دانی رستا د بیرون نیابی مرد سه هزار در خوا ماز کا نمدی

بیزبان به دادگاه فراهم آمده و خواهان چشم براه اند و گوش بر

آواز تا چه بینند و چه شنوند مرا نیز دل از آرزوی پاسخ آن

نیایش نامه و ستایش نامه که بهنجار یام روان داشته ام ذرّه ذرّه

است و در ینجا بفر و د آمد نجای داور رفتن و داور را دیدن

از رهگذر اندیشه های بیچ در بیچ پیکر بسته است کوتاهی سخن

آن ارهاست که پنداری خارهاست اگر روی براه آوری در راه

نگری و اگر نشینی به بیرون بینی هنوز شکیبائی بر بیتابی چیرگی

داشت که روز دوشنبه ششم مارچ آن نامه بهر گونه نگارشی

که در نورد آن بود بمن باز رسید پیشانی نامه بجنبش خامه از

پیشگاه داور فرهنگ آموز بدین فرمان فروغ اندوز که نامه را

سوی فرستنده باز گردانند تا بمیانجی گری داور شهر بانا

فرستند همه گفتند و من نیز دانستم که این سودا مو دا پاسخ نشانیست

امید فزای دا زپذیرفتن آگهی بخش بر آنند آن نامه بفرمان

نشانمند ما به افزودن نگارشی که همی شایست به نگاه جای سرور
دادگستر شهرآرای شهریاران پرور فرزانه چارلس ساندرس صاحب کمشنر
بهادر فرستادم و نامهٔ ویژه بنام نامی ستوده نامور درگیرنده
بخواهش یافتن دیرینه نشین با آن نامه همراه ساختم چهارشنبه
ششم هم ماه پاسخ از پیشگاه فرمانروا دربارهٔ نخستین شاد خواست
فرمان رسید که فرستادن این نامه که جز ستایش و چشم
روشنی هیچ ندارد هیچ گونه ناگزیر نیست من نیز اندیشیدم که در پی
بگنجم و هنگامهٔ مهر و آزرم و لابه و لاغ چون گنجد من که شکم بنده ام
مر آنان همی باید بینم که آن دو پیمن آرند و بکدام فرمان درخور آید
شامگاه پنجشنبه نوزدهم ماه پاسخ آواز روان توانا ساز توپ به مژده
رسانی فیروزی در گنبد فیروزه رنگ پیچید و بدست آمدن لکنو
و پهن گشتن سپاه کینه خواه انگریزی در آن شارستان
چنانکه دلخواه بود نشیمن گردید آبادی آن شهر درود بند

و باره و بارو ندارند تا نا دیواری از انبوه آنسوی سپاه بوده باشد
که زور آوران این سوی را سنگ راه بوده باشد دمی که آن دیوار
نااستوار به تُند باد کوشش مردان کار از هم ریخته باشد بر آئینه
خرام پیاده و سوار گرد از هر رهگذار انگیخته باشد آری فرهٔ ایزدی
به کرا شهریاری بخشد هم تاب جهانستانی افزاید و هم فر آب جهانداری
بخشد ناگزیر هر که گردن از فرمانش بپیچد سزایش درخور کفش است
و ستیزهٔ زیردست با زبردست همان مشت است و درفش
جهانیان را سزد که با خداوندان بخت خداداد به خشنودی
فرو آرند و بردن فرمان جهانداران را پذیرفتن فرمان
جهان آفرین انگارند چون دانستیم که تیغ و نگین و بخت و تخت
بخشیدهٔ کیست دیگر سرکشی و ناخوشی از بهر چیست زمزمه سنج
شیراز را میرم که درین پرده هوش فزا نوای دارد ع چه کند
بنده که گردن ننهد فرمان را ؛ چکند گوی که تن در ندهد چوگان ما ؛

Scanned by CamScanner

انزست ؛ دوم مارچ روز دلنوازانه بمی خامد که گیتی فروردینے و

نوروزی داشت و آن روز جهان فروز را به این روزها دی و فردا

این روز نشان می یافتیم امسال مگر این شهر شهر خاموشان است

که از آمد آمد نوبهار هیچ گلبانگ نمی شنویم کس نمیگوید که این سال از

سالهای دوازده گانهٔ ترکان کدام است و برابر گشتن روز و شب را

در شب و روز چه هنگام است اگر نه دل نهان را خار از خاک رست

روزنامچه جهانگردی خسرو روز از نگارش وامانده و نگاه چند

کم گیر و دروغی چند ناشنیده و پندار بحر پیمودن بیره فراموش کرده

است که سبزه نروید و گل نشگفد آری آفرینش را هنجار برنگردد

و چرخ جز به هنجار گردشی که مراد است از لا دره نه نوردد برخویشتن

همیگریم نه برگلزار از بخت گله می سنجم نه از نوبهار

جهان از گل و لاله پر بوی و رنگ — من و گوشه و دامنی زیر سنگ

بهاران و من مانده بی برگ و ساز — در خانه از بی نوایے فراز

می نالم و می سگالم که روزگار بی پرواست اگر من که در کنج اندوه روز
بی نوایی دارم سبزه و گل ننگرم و مغز خود را بوی گل نپرورم از بهار
چه کاهد و از باد که تاوان خواهد در ماه اپریل که دو بهره از فروردین
و یک بهره از اردی بهشت است کسانیکه از جرگهٔ حکیم محمود خان و نوابخان
باز مانده بودند از بند رستند و از دام بدر جستند هر یکی راه خویش
گرفت و آن ستوده مرد ناز پرورد با همه خویشان و خویشاوندان
و پرده نشینان و فرزندان سوی پتیاله رفت گویند هنوز
در کرنال روز را شب همی آرد تا سپس چه در سر دارد
سرآغاز مئی شنیدن را به نوازش این آوازه نازش روی
داد که دلیران سپاه کینه خواه مرادآباد را که گذرگاه بداندیشان
بود به ناوردی نورد از هم کشادند و آن شهر را بهر گستردن
داد به سرچشمهٔ دانش خدا داد نواب یوسف علیخان بهادر فرخ
نژاد دادند همیدون آن بجهانگیری سزاوار و بجهانداری

درخور در آن سرزمین از ژودی فرمان پذیرے فرمان همی راند
امید که جاودان فرمانروا ماند دیگر سراید که کوهه انگریزے
لشکر اژدر شکر کوه شکاف پس از آن که شور در آن رودبار
افکند خس و خاشاک تردامنان هرزه ستیز از بن برکنار افکند
چون چنین است ژودا که بر گرانجانی چند که از هر سنگلاخ
بجا مانده جا بجا در شهر و روستا مردم را آسوده نمیگذارند
و در رهگذر با رهروان راهی آزار زند روزگار سراید و کشور
بند سرتاسر بسایهٔ پرچم دارایان دادگستر درآید سیزدهم
چون روز یکشنبه نزدیک به انجامیدن روز فرمانفرمای شهر
بهادر جنگ خان را که در ارک گرفتارانه همی ماند نزد خود خواند
امیدوارانه شتافت تا فرمان یافت که به مژدهٔ جان بخشی
و نوید بخشش یکهزار روپیه ماهانه شادمان گردد و سوی لاهور
ره نوردد بسپر روزگار آزادانه زندگانیست و در آن شهر

فرجام ماند و بود جاودانی است بر آئینه و سائینه بگیران روداد

سزاوار آنست که از بند دریغ دروغ جاه و دستگاه آزاد

و بدین آزاد زیستن خشنود و دلشاد باشد بهرام روز بیست و دوم

چون هنوز هنگام فرمان رانی ستاره روز نگذشته بود و

خیره در روز که بر روزش برنیزه همیگردانند از کناره خاور

نیزه بالا بلند نگشته بود که خروش توپ آسمان غریو آشوب

هم شماره روزهای گذشته ماه چون دلهای دوستان را

بانداز سرخوشی و شادمانی از جا برانگیخت و خاکستری

سوزنده تر از آتش بر سر و روی دشمنان ریخت نوید

گشایش شهر گوالیار و بدست آمدن آن سنگین دژ که جگر

گوشه زمین است و لخت دل کوهسار از آن رو که از فرگاه

جهان آفرین پروانه نیستی سرکشان آورد هم بهر فرماندهان

و هم برای فرمانبران از روشنی چراغ آرزو نشان آورد

پیکره پیدائی این رُوداو آنست که سرکشان گوالیار را گرفتند
وستانندهٔ باج و ساو مهاراجه جیاجی را و شهر و شهریاری
نرو هشت و به آگره رفت و از جهانبانان انگلسیه یاوری جُست
و سپاهی گران به یارگیری یافت و به زادبوم شتافت تا
پیروزی روزی شد بامانا ازروی برگونه و آگویه سرانجام
گراهان بر سویه جز آن نیست که چون درگه یزاگر یزاز هر سو گوالیار
رُو آورده اند و در ینجا اینچنین شکست نمایان خورده اند همیدون
روزی چند خسته و نژند به رہزنی و در بروآزاری سو بسو زمین
نوردند و پایان کار جابجا بخواری گشته گردند بارگیان دشت
پیمای را در بیابانهاے بی گیاه سینه بر زمین سای بینی
و باران گروه را درگذرگاههای آب گل اندای یا بے
باز کشور هند به انسان بخس و خار گردد که بر گوشهٔ راغ
بسبزی انگارند باغ و بر رهگذار در آبادی نمایه بازار گردد

امه نگار را خود شصت و سه سال از زندگانی گذشت و

ازین گونه گون گداز شبهای پنهان پیداست که اکنون از

روزگار چشمداشت بیشی درنگ بیجاست ناچار آواز دلنواز

جادو نوای شیراز که از من بر روان روشنش درود باد یاد میکنم

و به انسان که ماتم زده از ماتم زدهٔ دیگر اندرز پذیرد بدین زمزمه

خود را اگر شاد نتوان گفت باری از بند رنج آزاد میکنم ؎

دریغا که بی ما بسی روزگار — بروید گل و بشگفد نوبهار

بسی تیر و دیماه و اردی بهشت — بیاید که ما خاک باشیم و خشت

به راستی که راستی نهفتن شیوهٔ آزادگان نیست من نیم مسلمان

که هم از بند پیوند آئین و کیش آزادم و هم از رنج شکنج بدنامی

خویش وارسته پیوسته خوی آن داشتمی که بشب جز فرنج

هیچ نخوردمی و اگر آن نیافتمی خوابم نبردی درین هنگام

که بادهٔ فرنگ در شهر بسیار گرانست و من تهیدست

اگر جوانمرد خدادوست خداشناس دریا دل مهیش داس

بفرستادن بادهٔ شکری هندی که در رنگ با فرنج برابر و

در بوی از آن خوشتر ستی بر آتش دل آب نزدی جان

نبردمی و از جگر تشنگی مردمی

از دیر دلم وایهٔ زهر در می جست | از بادهٔ ناب یکدو ساغر می جست

فرزانه مهیش داس بخشید بمن | آبی که برای خود سکندر می جست

از داد نتوان گزشت و دیده را نا گفته نتوان گزاشت این نکوئی دوست در بارهٔ آبادی مسلمانان

شهر کوشش دریغ نداشت چون سرنوشت آسمانی بدان یار نبود

درستی کار دشوار نمود آبادی و آزادی هندو گروه همه

دانند که از روی آزرم مهربان داوران رخ نموده است

باری به اندیشی و کارسازی این بهی پسند نیکی گزین را در نیز

آرامش داد بار بوده است کوتاهی سخن نیکبخت کسی است نیکی

بمردم رساننده و روزگار به نای و نوش خوش گزراننده

با آنکه پای پیوند کهن آشنائی در میان نیست ناگاه به
همنشینی و همزبانی و گاه گاه بفرستادن ارمغانی بر منت
سپاس می نهد و داد مهربانی میدهد دیگر از آشنازادگان
و شاگردان من بیراسنگه که برنامی نیک نهاد و نیکنام است
در راه پاس مهر تیزگام است همی آید و اندوه همی زداید
دیگر از مردم این شهر نیمه ویران نیمه آباد شیوجی رام برهمن
برهما نژاد که جوان خردمند و مرا بجای فرزند است این
درویش دلریش را اکثر تنها میگذارد و به اندازهٔ تاب و توان
خویش فرمانبری و کارسازی بجا همی آرد پسرش بالمکند نام نوجوان
نیکخوی پارساست نیز همچون پدر خویش در فرمان پذیری
چست و در اندوه گساری یکتاست از دوستان دوردست
آن سپهر مهر را ماه دو هفته شیوا زبان هرگوپال تفته که دیرین
هم بهم آواز من است و از آن رو که در سخن آموزگا

خودم همیگوید سخنش با آنهمه خوبی خداداد سرمایهٔ نازمن است
سخن کوتاه آزاده مردیست همه تن مهر و سراپا آزرم
او را بسخن فروغ و سخن را بوی، بنگامه گرم بسکه از مهر
جا درون جانش داده ام میرزا تفته مهر خوانش داده ام
از میرٹھ سفتهٔ زر بمن فرستاد و جامه و نامه پیوسته میفرستد
این سخن که گزاردن آن ناگزیر بود ویژه از بهر آن آوردم
که سپاس مهرورزی و مردمی ناگزارده نماند و نیز چون
دوستان را این داستان بدست افتد دریابند که شهر از
مسلمان تهی است شبانه خانه هاے این مردم بچراغ است
و روزانه روزن دیوارہا بی دود غالب شہر آشنائے
ہزار دوست که در ہر کاشانه یگانهٔ و در ہر سرای آشنائی
داشت درین تنہائی جز خامه ہمنوای وی نه جز سایه کس
ہمپای وی نیست ــــ اکنون منم که رنگ بر رویم نمیرسد

تا رخ بخون دیده نشوییم هزار بار — دیگر بگریم زدنده دریغ است همان ال

ور بسترم زخاره و خار است پود و تار — اگر در شهر این هر چهار تن

نیز نیستی نپذیرند گواه بیکسی من نیز نیستی شگرف کار رسے

روزگار را میرم که درین تاراج گه شهر در هیچ خانه از کاه و

کاه و خاک نیز بجا نماند با آنکه خانهٔ من از دراندوختی اخیانیان

برکرانه ماند سوگند نتوانم خورد که جز آنچه پوشند و گسترند

هیچ در سرا نماند کشایش این گره دشوار کشای دیگر

هویدائی این راستی دروغ نما آنست که دران هنگام

که سیه جردگان شهر را فرو گرفتند کمه بانو بی آنکه بمن

گوید چیزهای گران ارز از زیور و رخت هرچه داشت

نهانی در خانهٔ کالی صاحب پیرزاده فرستاد و تا در آنجا

در نهانخانه نگاه داشتند و در نگل انباشتند چون

لشکرآرایان شهر را کشودند و لشکریان فرمان یغما

یافتند رازدان آن راز با من در میان نهاد که رانش
دست رفته بود و رفتن و آوردن را گنجایی نمانده
تن زدم و خود را بدان فریفتم که چون رفتنی بود نیک است
که از خانهٔ من نرفت ایدون که این جولائی ماه پانزدهم
است و دیرین پس سه کار انگریزی را سررشتهٔ بازیافت
گم است بفروختن آن گستردنی و پوشیدنی جان و تن
همی پرورم گوئی دیگران نان میخورند و من جامه میخورم
ترسم که چون پوشیدنی همه خورده باشم در برهنگی از
گرسنگی مُرده باشم از آن جاگی خواران که از پیش بهستند
درین رستاخیز دو سه تن از من گسستند هر آئینه ایشان را
نیز همی باید پرورد و داد آنست که آدم را از آدمی گزیر
نیست و کار بے کارگزار از پیش نتوان بُرد بیرون
ازین گروه بونده گان دگر که از پیش بچیدن خوش

در حاشیه:
پانزدهم جنوری
سنہ ۵۸
پانزدهم جولائی
سنہ ۵۸

در بودن بهره خوی دارند درین ناخوش هنگام نیز
به نوای جانگزای ناخوشتر از خروش خروش بی هنگام
همی آزارند اکنون که فشار آزارهای تنهائی وگدازش رنجهای
روانی روان و تن را بهم بر زد ناگاه در دل فرود آمد
که به آراستن این بازیچهٔ نگارش نام چند توان پرداخت
همانا درین کشاکش پایان کار یا مرگ است یا در یوزه
در نخستین پیکر از آن نگزیرد که این داستان جاودان
از کران برکران و از انجام بی نشان ماند و نگرندگان را
افسرده دل کند در دومین پیکر پیداست که سرگذشت
جز آن نخواهد بود که از آن کوی به دورباش سرباز
آزار دادند و از آن در به بانگی وانگی فرستادند و خود
اینها تا کجا توان سرود و در بند رسوائی خویش باید بود
کهن نسخ اگر بدست آید نیز زنگ از آئینه نمی زداید

واگر فرا چنگ نیاید برآبگینه جز سنگ نیاید و شگفت تر
آن که در برد و نیرو لیش از آنجا که آب و ہوا ے اینجا
خستہ را نیک نمی پرورد و برآئینه از شہر باید رمید و
در آبادانی دگر ماند و بود گزید از مئی سال گزشته تا
جولائی سال یکہزار و ہشت سد و پنجاه و ہشت رُوداد
نبشته ام و از یکم اگست خامه از دست فرو ہشته ام
کاش درباره آن خواہشہای سه گانه ہمانا مہر خوان
و سراپای و ماه نه چنانکه ہم درین نگارش از آن
گزارش آگہی داده ام و اینک چشم نگران بدان دوخته
و دل پر امید بدان نہاده ام از فرگاه شہنشاه فیروز بخت
مہر دیہیم سپہر تخت جمشید شید فریدون فر
کاؤس کوس سنجر سنج سکندر در آن که فرمانروای
زدم از دی بسپاس گزار بجا ماندن آبروی تخت و دیہیم است

ولشکرآرای سدس را در اندیشهٔ ترکتاز سپاهش دل
از بیم دو نیم است اگر ستارهٔ روز بدین سگالش که در جهان نور
ناخشنودی اوست براس نمی ورزد چرا همه روز دمبدم
برخویش همی لرزد و ماه دو هفته بدین اندیشه که در گیتی فروزی
گمان همچشمی اوست از گستاخی خویش زنهار نمیخواهد چرا بر شب
از بیم همی کاهد ـــــــ

خداوند تیغ و نگین و نشان

شهنشاه شاهی ده شه نشان — خردمند فرخ رخ نیک خوی
زنوشیروان برده در دادگوی — درخشان درفشی که جمشید داشت
ندانی که از بهر جاوید داشت — بدان داشت تا اندرین روزگار
شمارد بدین نامور شهریار — زخسرو ترنج زر و هفت گنج
ره آورد شاه است بی دسترنج — خود آن تخت کش با دبردی بدوش
به شه پیشکش کرده فرخ سروش — نبینی که در کوه از مغز سنگ
بر آید همی گوهر رنگ رنگ — بود مهر را چشم بر افسرش

وگرنه چه کاراست با گوهرش — گرانگ گوهر فشانی کند
چنان در فشاندن روانی کند — که آن گوهر آرد اگر در شمار
شود سوده انگشت گوهر شمار — زبیم سیاهش که گاه نبرد
برآرد ز دریا و کهسار گرد — بکوه اژدها و بدریا نهنگ
دهد جان که در آب و زند سر بسنگ — ز فر و شکوه نمایان او
خدیوان گیتی گدایان او — بافروزش و بخشش بی دریغ
درخشنده خرشید و بارنده میغ — به فرگفت بخشش خرد ور نواز
بفرمان دانش خردمند ساز — به بخشش شگرف و بدانش رسا
جهاندار فرزانه وکتوریا — که یزدان پاکش نگهدار باد
درنگش درین بزم بسیار باد — از روی فرمان روائی

فرمان روائی در رسد تا چون از بخشش جهان داور بهره
برگرفته باشم هنگام رفتن از جهان ناکام نرفته باشم ؎

چون نگارش بدین نشان پیوست — تن زدم داستان نمیخواهم

این نامه را پس از انجامیدن دستنبو نام نهاده آمد و دست بدست و سوی بسوی فرستاده آمد تا دانشوران را روان پرور و سخن گستران را دل از دست برد امید که این دانشی دستنبو به دست یزدانیان گلدستهٔ رنگ و بوی و در دیدهٔ اهرمن منشان آتشین گوی باد ترآج

زینسان که همیشه در روانی مائیم   چشمهٔ راز آسمانی مائیم

لختی ز دساتیر بود نامهٔ ما

ساسان ششم به کاردانی مائیم

تمام شد

اس کتاب کو بغیر اجازت مہتمم مفید خلائق کے کوئی صاحب چھاپنے کا ارادہ نہ کریں فقط

قطعه تاریخ

آغاز کتاب از میرزا حاتم علی بیگ مهر تخلص سلمه الله تعالیٰ

اسدالله خان غالب مهر — حبذا از رقم چه دستنبو
نامه خود سال خویش داد نشان — ید بیضاستیم چه دستنبو
سنه ۱۲۷۴ھ

قطعه تاریخ

انجام کتاب از میرزا آغفته سلمه الله تعالیٰ

کتابی ز در رقم غالب که آنرا — بجان و دل جهانی گشت طالب
نوشتم تفته سال اختتامش — بیا بنگر چه دستنبوی غالب
سنه ۱۲۷۵ھ

نوچشمهال کنند برهمنان این رساله را بهر دفع چشم زخم در تعویذ بازو بندند

اِنقلابِ ۱۸۵۷ء :

رودادا اور اثراتِ مابعد

ماٰخذ : خطوطِ غالب

"ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں مر گئے، جو زندہ ہیں اُن میں سینکڑوں گرفتارِ بندِ بلا ہیں ..... جو زندہ ہے، اُس میں مقدور نہیں۔"

(غالب، بہ نام شیو نرائن آرام، ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء)

"میں نہیں جانتا کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو پہر دن چڑھے وہ فوجِ باغی میرٹھ سے دہلی میں آئی تھی۔ یا خود قہرِ الٰہی کا پے بہ پے نزول ہوا تھا۔ بہ قدرِ خصوصیتِ سابق، دلی ممتاز ہے ورنہ سرتاسر قلمروِ ہند میں فتنۂ و بلا کا دروازہ باز ہے۔"

(بہ نام انورالدولہ شفق، ۲۴ اگست ۱۸۶۰ء)

"دو (کئی) لشکروں کا حملہ پے در پے اس شہر (دلی) پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر اس میں اہلِ شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں[ل] کا۔ اس میں جان و مال و ناموس۔ مکان و مکین و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر لٹ گئے۔"

(انورالدولہ شفق، ۱۸۶۰ء)

"آدمی تو آتے جاتے رہتے ہیں، خدا کرے یہاں کا حال سن لیا کرتے ہو۔ اگر جیتے رہے اور ملنا نصیب ہوا تو کہا جائے گا، ورنہ قصہ مختصر قصہ تمام ہوا، لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں اور وہ بھی کون سی خوشی کی بات ہے جو لکھوں۔"

(ثاقب، ۸ر فروری ۱۸۵۸ء)

"مبالغہ نہ جاننا۔ امیر غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے تھے نکالے گئے، جاگیردار پنسن دار، اہلِ حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصّل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں ملازمانِ قلعہ پر شدّت ہے۔ بازپرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک

[ل] "خاکیوں سے مراد انگریزی فوج کے آدمی ہیں، ہندوستانی بھی اور گورے بھی، کیوں کہ ان کی وردی خاکی تھی۔"

(مولانا غلام رسول مہر: خطوطِ غالب، جلدِ اوّل ۱۹۴۹ء، صفحہ ۲۳۲)

رہے ہیں۔" (تفتہ، ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء)

"انصاف کرو، (خط) لکھوں تو کیا لکھوں؟ کچھ لکھ سکتا ہوں؟ کچھ قابل لکھنے کے ہے؟... بس اتنا ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے، نہ میں لکھوں گا۔"

(غلام نجف خاں، ۲۶ دسمبر ۱۸۵۷ء)

"مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یاز دہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو معلوم نہیں، بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کی توجہ بھی نہیں، دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے؟"

(تفتہ، ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء)

"جو دم ہے، غنیمت ہے، اس وقت تک مع عیال و اطفال جیتا ہوں، بعد گھڑی بھر کے کیا ہو، کچھ معلوم نہیں۔ قلم ہاتھ میں لیے پر جی بہت لکھنے کو چاہتا ہے مگر کچھ لکھ نہیں سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے ورنہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔"

(غلام نجف خاں، ۱۹ جنوری ۱۸۵۸ء)

"منہ بیٹھتا ہوں اور سر پٹکتا ہوں کہ جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں، نہیں لکھ سکتا، الٰہی حیاتِ جاودانی نہیں مانگتا، پہلے انوار الدولہ سے مل کر سرگزشت بیان کردوں، پھر اس کے بعد مروں۔" (انوار الدولہ شفق، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"وہ عزت اور ربط ضبط جو ہم میں رئیس زادوں کا تھا، اب کہاں! روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے تو غنیمت ہے۔"

(تفتہ، ۱۲؍ مارچ ۱۸۵۸ء)

"کئی دن ہوئے۔۔۔ جو میں نے ایک ولایتی چغہ اور ایک شالی رومال ڈھائی گزا (پیسوں کی ضرورت سے فروخت کے لیے) دلاّل کو دیا تھا اور وہ اس وقت روپیہ لے کر آیا۔"

(تفتہ، ۱۸؍ جولائی ۱۸۵۸ء)

"روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں، لحاف توشک کی فکر ہے۔"

(مجروح، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"پندرہ دن پہلے تک دن کو روٹی، رات کو شراب ملتی تھی، اب صرف روٹی ملے جاتی ہے، شراب نہیں۔ کپڑا ایام تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے، اس کی فکر کچھ نہیں۔"

(تفتہ، ۵؍ نومبر ۱۸۵۹ء)

"نہ کاغذ ہے، نہ ٹکٹ ہے۔ اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتاب میں سے یہ کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں اور بیرنگ لفافے میں لپیٹ کر بھیجتا ہوں۔ غم نہیں نہ ہونا۔ کل شام کو کچھ فتوح کہیں سے پہنچ گئی ہے، آج کاغذ اور ٹکٹ کہیں سے منگالوں گا۔"

(مجروح، ۸؍ نومبر ۱۸۵۹ء)

"جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہوں۔ اُس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اِس وقت

کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں سے قرض کی اُمید، نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔ اگر رام پور سے کچھ آیا تو خیر، ورنہ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔"

(یوسف میرزا، ۱۵ جولائی ۱۸۵۹ء)

"۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والیِ رام پور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں، اس سال (۱۸۵۵ء میں) میرے شاگرد ہوئے۔ ناظمؔ اُن کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اُردو کی بھیجتے، میں اصلاح دے کر بھیج دیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ اُدھر سے آتا رہتا۔ قلعے کی تنخواہ جاری، انگریزی پنسن کھلا ہوا۔ اُن کے عطایا فتوح گنے جاتے تھے۔ جب وہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگی کا مدار اُن کے عطیے پر رہا۔"

(خواجہ غلام غوث بے خبر، مارچ ۱۸۶۰ء)

"فتنہ و فساد کے دنوں میں قلعہ کی آمد مفقود۔ انگریزی پنسن مسدود ـــ یہ بزرگوار (والیِ رام پور) وجہ مقرری ماہ بہ ماہ اور فتوح گاہ گاہ بھیجتا رہا تب میری اور میرے متوسلوں کی زیست ہوئی۔"

(میاں داد خاں سیاح، ۲۰ جولائی ۱۸۶۵ء)

"خاص اپنا دکھ روتا ہوں: ایک بیوی، دو بچے، تین چار آدمی گھر کے کلو، کلیان، ایاز، یہ باہر۔ مداری کی جورو بچے بدستور، گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے گئے بھینے بھرے آگئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی، تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں، بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود مقامِ معلوم (رام پور) سے کچھ آئے جاتا ہے۔ وہ بہ قدرِ سدِ رمق ہے۔ محنت

وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں، دیو نہیں، بھوت نہیں۔ اِن رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں؟" (یوسف میرزا، ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء)

"اب یوں سمجھو کہ نہ ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے، نہ جاہ و حشم رکھتے تھے، نہ املاک تھے، نہ پنسن رکھتے تھے۔"

(حسین میرزا، ۳۱ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"عمر بھر نوکری نہ کی، نوکری کی تو بہادر شاہ سے نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب پایا۔ کچھ دنوں بادشاہ کا مصاحب رہا، پھر اُستاد کہلایا۔"

(میر بندہ علی خاں، ۱۸ جنوری ۱۸۶۴ء)

"بادشاہِ دہلی نے پچاس روپے مہینہ مقرر کیا۔ اُن کے ولی عہد (مرزا فخرو) نے چار سو روپے سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ دلی کی سلطنت سخت جان تھی، سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، نومبر ۱۸۶۰ء)

"..... واز مئی (۱۸۵۷ء) خود آشکار است کہ حال چیست؟ پیوندِ تعلق با بہادر شاہ جز آن نبود کہ از ہفت ہشت سال بہ تحریرِ تاریخِ سلاطینِ تیموریہ واز دو سہ سال بہ اصلاحِ اشعارِ شہر یاری پرداختم۔ درین ہنگامہ خود را بکنار کشیدم و بدین اندیشہ کہ مبادا گر یک قلم ترکِ آمیزش کنم خانۂ من تاراج رود و جان در معرضِ تلف افتد، بہ باطن بیگانہ و بہ ظاہر آشنا ماندم ہرگاہ شہر بر دستِ سپاہِ انگریز فتح شد، ہمہ جاگیرداران و پنسن داران

از شہر بدر رفتند، چناں کہ تا امروز آوارۂ دشت و کوہ اند، من از جا نجنبیدم و ہم چناں گوشہ گیر ماندم ۔ درین بند و بست کہ خاصہ از بہر سیاست مجرمان است و تحقیقاتِ جرم از روی دفترِ قلعہ و اظہارِ مخبران می کنند، ہیچ گونہ آلایشِ دامنِ من پدید نیامد ۔ و دار و گیر و باز پرس رو نہ داد ۔ بودنِ من در شہر از حکام نہان نیست ۔ اما چوں پرسشی درمیان نیست، لاجرم محفوظ ماندہ ام ۔ می بایست کہ خود سلسلہ جنبان گشتمی و با حکام پیوستمی ۔ درین بارہ سخن آن ست کہ درین فرماندہان با ہیچ کس سابقۂ معرفتی ندارم و مع ہٰذا ہنوز موقع و محلِ آن نمی نگرم کہ نامہ نویسم و خواہشِ ملاقات بہ میان آورم ۔ راستی این کہ درین فتنہ و آشوب خدمتی بجا نیاوردہ ام، لیکن مقام شکر است کہ بہ تقدیم نرسیدنِ خدمت از راہِ بے دستگاہی است، و ذریعۂ اخلاص و خلوص ہمان بے گناہی است ۔"

(نواب یوسف علی خاں، ۴؍ جنوری ۱۸۵۸ء)

"میں غریب شاعر، دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہُوا ہوں ۔ خواہ اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو ۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا ۔ صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا ۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے مگر چوں کہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی، لہٰذا طلبی نہیں ہوئی، ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیر دار بُلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں میری کیا حقیقت تھی ۔"

(تفتہ، ۵؍ دسمبر ۱۸۵۷ء)

"حقیقتِ حال، اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں، بھاگ نہیں گیا، نکالا نہیں گیا، لُٹا نہیں، کسی محکمے میں اب تک بُلایا نہیں گیا، معرضِ بازپُرس میں نہیں آیا۔ آئندہ دیکھیے کیا ہوتا ہے؟"

(غلام نجف خاں، ۲۱ر دسمبر ۱۸۵۷ء)

"بھائی! میرا خیال ہے کہ دفترِ شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا کسی مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی۔ حکامِ وقت میرا ہونا شہر میں جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں، بلایا نہیں گیا، دار و گیر سے محفوظ ہوں، کسی طرح کی بازپُرس ہو تو بلایا جاؤں مگر ہاں، جیسا کہ بلایا نہیں گیا، خود بھی بروے کار نہیں لایا، کسی حاکم کو نہیں ملا، خط کسی کو نہیں لکھا، کسی سے درخواستِ ملاقات نہیں کی۔"

(تفتہ، ۳۱ر جنوری ۱۸۵۸ء)

"میرا حال بہ دستور ہے، دیکھیے خدا کو کیا منظور ہے؟ حاکمِ اکبرآباد نے آکر کوئی نیا بندوبست جاری نہیں کیا۔ یہ صاحب، میرے آشنائے قدیم ہیں لیکن میں مل نہیں سکتا۔ خط بھیج دیا ہے، ہنوز کچھ جواب نہیں آیا۔"

(تفتہ، ۵ر مارچ ۱۸۵۸ء)

"میں مخفی نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں۔ حکام جانتے ہیں کہ یہاں ہے مگر نہ بازپُرس و دار و گیر میں آیا ہوں، نہ خود اپنی طرف سے قصدِ ملاقات کیا ہے۔ بہ ایں ہمہ ایمن بھی نہیں ہوں۔ دیکھیے انجامِ کار کیا ہے؟"

(مجروح، ۷ر فروری ۱۸۵۸ء)

"بھائی، بُری آ بنی ہے، انجام اچھا نظر نہیں آتا۔"
(تفتہ، ۳؍فروری ۱۸۵۸ء)

"میرا حال بدستور ہے: نہ نوید کامیابی، نہ نہیب ناامیدی۔"
(تفتہ، ۱۸؍جولائی ۱۸۵۸ء)

"میں مع زن و فرزند، ہر وقت اسی شہر میں قلزم خوں کا شناور رہا ہوں دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ نہ پکڑا گیا، نہ نکالا گیا، نہ قید ہوا، نہ مارا گیا۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، ستمبر ۱۸۶۰ء)

"مئی (۱۸۵۷ء) سے پنسن نہیں پایا۔ کہو یہ دس مہینے کیوں کر گزرے ہوں گے؟ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا؟ زندہ ہوں، مگر زندگی وبال ہے۔" (تفتہ، ۳۱؍جنوری ۱۸۵۸ء)

"کیا پنسن اور کہاں اس کا ملنا! یہاں جان کے لالے پڑے ہیں ؎

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو!
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے!

اگر زندگی ہے اور پھر مل بیٹھیں گے تو کہانی کہی جائے گی۔"
(مجروح، ۷؍فروری ۱۸۵۸ء)

"یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا کچھ شمیل فساد میں پایا نہیں گیا اور میں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنسن کی کیفیت طلب

ہوئی ہے اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو (۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے) لگاؤ نہ تھا۔"

(تفتہ، ۱۲ر مارچ ۱۸۵۸ء)

"خدا کا شکر ہے کہ باوجودِ تعلقِ قلعہ، کسی طرح کے جُرم کا بہ نسبت میرے احتمال بھی نہیں۔"

(نواب یوسف علی خاں، ۷ر نومبر ۱۸۵۸ء)

"پنسن کی درخواست دے رکھی ہے۔ بہ شرطِ اجرا بھی میرا کیا گزارا ہوگا؟ ہاں، دو باتیں ہیں: ایک تو یہ کہ میری صفائی اور بے گناہی کی دلیل ہے۔ دوسرے یہ کہ موافق قولِ عوام: "چولھے دلدر نہ ہوگا۔"

(غلام نجف خاں، اپریل ۱۸۵۸ء)

"مجھ کو صاحب ڈپٹی کمشنر نے بُلا بھیجا تھا۔ صرف اتنا ہی پوچھا کہ "غدر" میں تم کہاں تھے؟ جو مناسب ہوا، وہ کہا گیا۔ دو ایک خط آمدۂ ولایت میں نے پڑھائے۔ تفصیل لکھ نہیں سکتا۔ انداز و ادا سے پنسن کا بحال و برقرار رہنا معلوم ہوتا ہے۔"

(غلام نجف خاں، جولائی، اگست ۱۸۵۸ء)

"پنسن اگرچہ ملے گا، لیکن دیکھیے کب ملے گا؟ اس کے ملنے تک کیا ہوگا اور اس کے ملنے سے میرا کیا کام نکلے گا؟ قطع نظر ان اُمور سے، اس وجہِ قلیل کو کس بستی میں بیٹھ کر کھاؤں گا؟ یہ شہر، اب شہر نہیں، قہر ہے۔"

(غلام نجف خاں (؟) ۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء)

"بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اس مہینے میں پنسن کی تقسیم کا حکم آ جائے گا دیکھیے کہ آتا ہے یا نہیں؟ اگر آتا ہے تو میں مقبولوں میں ہوں یا مردودوں میں؟" (یوسف میرزا، ۱۵ر جولائی ۱۸۵۹ء)

"للہ الحمد کہ گنہ گار نہیں ٹھہرا"

(چودھری عبدالغفور سرور، فروری مارچ ۱۸۵۹ء)

"گنہ گار ٹھہرتا، گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ میں بے گناہ ہوں، مقیدا ور مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں"

(خواجہ غلام غوث بے خبر، ۲۰ر جنوری ۱۸۵۹ء)

"(رہا میرا حال) تو بے کسی و غریبی تراکہ می پرسد؟ نہ جزا، نہ سزا، نہ نفرین نہ آفریں، نہ عدل، نہ ظلم، نہ لطف، نہ قہر"

(تفتہ، ۵ نومبر ۱۸۵۹ء)

"دربار میں جاتا تھا، خلعتِ فاخرہ پاتا تھا۔ وہ صورت اب نظر نہیں آتی نہ مقبول ہوں، نہ مردود ہوں، نہ گنہ گار ہوں، نہ مخبر، نہ مفسد"

(یوسف میرزا، ۲۸ر نومبر ۱۸۵۹ء)

"میرا دربار اور خلعت، دریا برد ہو گیا۔ نہ پنسن کی توقع، نہ دربار اور خلعت کی صورت، نہ جزا، نہ سزا، نہ انعام، نہ رسم معمول قدیم"

(حسین میرزا، ۱۶ر دسمبر ۱۸۵۹ء)

"اب تک میں اپنے کو یہ بھی نہ سمجھا کہ بے گناہ ہوں یا گنہ گار؟ مقبول ہوں یا مردود؟ مانا کہ کوئی خیر خواہی نہیں کی، جو نئے انعام کا مستحق ہوں لیکن کوئی بے وفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستورِ قدیم کو برہم مارے۔"

(نواب یوسف علی خاں، ۲۷ر نومبر ۱۸۵۹ء)

"نانا نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو؟ وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے؟"

(یوسف میرزا، جون ۱۸۵۹ء)

"میں کروں کیا؟ فی الحال دودمانِ معنیٰ کا وہ حال ہے جو ہندوستان کا غدر کے بعد ہو گیا۔ جہلا جانتے نہیں، علما اعتنا نہیں کرتے۔"

(جنوں، ۸ر مئی ۱۸۶۴ء)

"(میرا) حال بہ سبیلِ اجمال یہ ہے کہ سیاست سے محفوظ ہوں اور حکام کی عنایت سے محفوظ ہوں۔ بے وفائی کا داغ نہیں لگا ہے۔"

(احمد حسن عرشی، ۱۸۶۰ء)

"میرا دکھ سنو: بھاگا نہیں، پکڑا نہیں گیا، دفترِ قلعہ سے کوئی میرا کاغذ نہیں نکلا۔ کسی طرح کی بے خیالی و نمک حرامی کا دھبا مجھ کو نہیں لگا۔ یہاں ایک اخبار جو گوری شنکر یا گوری دیال یا کوئی اور، غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا۔ اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی کہ فلانی تاریخ اسد اللہ خاں غالب نے یہ سکہ کہہ کر گزرانا ہے:

بہ زر زد سکۂ کشور ستانی
سراج الدین بہادر شاہِ ثانی

مجھ سے عند الملاقات صاحب کمشنر نے پوچھا کہ یہ کیا لکھتا ہے؟ میں نے کہا غلط لکھتا ہے۔ بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے نوکر شاعر۔ خدا جانے کس نے کہا۔ اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر میں نے کہہ کر گزرانا تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا گزرتا اور آپ کو چاہیے حکیم احسن اللہ خاں سے پوچھیے۔ اس وقت تو چپکا ہو رہا۔ اب جو اس کی بدلی ہوئی تو جانے سے دو ہفتے پہلے ایک فارسی روبکاری لکھی کہ یہ جو اسد اللہ خاں فارسی کے علم میں یکتا مشہور ہے، اس سے کام نہیں نکلتا۔ یہ شخص بادشاہ کا نوکر تھا اور اس کا سکہ لکھا۔ ہمارے نزدیک پنسن پانے کا مستحق نہیں ہے۔"

(حسین میرزا، ۱۸؍جون ۱۸۵۹ء)

"بھائی، یہاں منشی میر احمد حسین ولد میر روشن علی خاں نے مجھ سے کہا کہ حضرت! جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں، تو میں مرشد آباد میں تھا، وہاں میں نے یہ سکہ سنا تھا۔ ان کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ مولوی محمد باقر نے خبر وفات اکبر شاہ و جلوس بہادر شاہ جہاں چھاپی تھی، وہاں اس سکے کا گزرانا ذوق کی طرف سے چھاپا تھا اور جلوس بہادر شاہ اکتوبر کے مہینے ۱۸۳۷ء یا ۱۸۳۸ء میں واقع ہوا ہے۔ بعض صاحب اخبار جمع رکھتے ہیں۔ اگر وہاں کہیں اس کا پتا پاؤ گے اور وہ پرچہ اخبار اصل بجنسہٖ مجھ کو بھجواؤ گے تو بڑا کام کرو گے۔ میں نے اکبر آباد و فرخ آباد و مارہرہ و میرٹھ اپنے احباب کو لکھا ہے۔ اب تم کو بھی لکھا ہے۔ ایک کاپی کو لکھنا باقی ہے۔ وہ بھی کل پرسوں لکھوں گا۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر

۱۸۳۷ء یا ۱۸۳۸ء تین مہینوں کے بارہ پرچۂ اخبار دیکھے جائیں۔"
(حسین میرزا، ۱۸ر جون ۱۸۵۹ء)

"جناب چودھری صاحب! آج کا خط کاسۂ گدائی ہے۔ یعنی تم سے کچھ مانگتا ہوں۔ تفصیل یہ کہ محمد باقر دہلوی کے مطبع سے ایک اخبار ہر مہینے میں چار بار نکلا کرتا تھا مسمّٰی بہ "دہلی اُردو اخبار" بعض اشخاص سنینِ ماضیہ کے اخبار جمع کر رکھا کرتے ہیں۔ اگر احیاناً آپ کے یا کسی آپ کے دوست کے ہاں جمع ہوتے چلے آئے ہوں تو اکتوبر ۱۸۳۷ء سے دو چار مہینے آگے کے اوراق دیکھے جائیں، جس میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر اور میاں ذوق کے ذو سکّے اُن کے نام کہہ کر نذر کرنے کا ذکر مندرج ہو سبے تکلف وہ اخبار چھاپے کا اصل بجنسہٖ میرے پاس بھیج دیجیے۔ آپ کو معلوم رہے کہ اکتوبر کی ساتویں، آٹھویں تاریخ ۱۸۳۷ء میں یہ تخت پر بیٹھے ہیں اور ذوق نے اس مہینے کے بعد سکّے کہہ کر گزرانے ہیں۔ احتیاطاً پانچ مہینے تک کے اخبار دیکھ لیے جائیں۔ یہاں تک میری طرف سے ابرام (اصرار) ہے کہ اگر بمثل کسی اور شہر میں کوئی آپ کا دوست جامع ہو اور آپ کو اس پر علم ہو تو وہاں سے منگوا بھیجیے۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، جون ۱۸۵۹ء)

"وہ "دہلی اُردو اخبار" کا پرچہ اگر مل جائے تو بہت مفید مطلب ہے، ورنہ خیر کچھ محلِ خوف و خطر نہیں ہے۔ حُکّام صدر ایسی باتوں پر نظر نہ کریں گے۔ میں نے سکّہ کہا نہیں، اگر کہا تو اپنی جان و حُرمت بچانے کو کہا یہ گناہ نہیں۔ اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے؟ سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی

اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں؟ ہاں صاحب، گولہ انداز کا بہنوئی مددگار رہے، اور شاعر کا سالا بھی جانب دار نہیں۔"

(یوسف میرزا، جون ۱۸۵۹ء)

"سکے کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا، یا کوئی گراب۔ کس سے کہوں، کس کو گواہ لاؤں؟

۔۔یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے ہیں یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوق نے یہ دو سکے کہہ کر گزرانے۔ بادشاہ نے پسند کیے۔ مولوی محمد باقر جو ذوق کے معتقدین میں تھے اُنھوں نے "دلی اُردو اخبار" میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس کے علاوہ اب تک وہ لوگ موجود ہیں کہ جنھوں نے اُس زمانے میں مرشدآباد اور کلکتے میں یہ سکے سنے ہیں اور اُن کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت ہوئے ہیں۔ میں نے ہر چند قلمروِ ہند میں "دلی اردو اخبار"[ل] کا پرچہ ڈھونڈا۔

[ل] "لیکن اگر یہ پرچے دستیاب ہو جاتے تو بھی اُن کے مفید مطلب نہیں ہو سکتے تھے۔ کیوں کہ اگرچہ اُس وقت میرزا غالب کو اس کا علم نہ ہو سکا، یہ سکہ ذوق کا کہا ہوا تھا ہی نہیں۔ اس لیے پرچے مل جاتے جب بھی یہ سکہ ان میں موجود نہیں تھا۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ مخبر (گوری شنکر) کی یہ اطلاع محض اختراع تھا۔ نہ یہ سکہ میرزا نے کہا تھا، نہ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے سامنے پیش کیا۔ بلکہ یہ سکہ جیسا کہ صادق الاخبار (دہلی) کی اشاعت ۱۳۔ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ / ۶ جولائی ۱۸۵۷ء سے عیاں ہے، حافظ غلام رسول ویران (تلمیذ ذوق) نے لکھا تھا۔"

(مالک رام، ذکرِ غالب، طبع چہارم، دہلی ۱۹۶۴ء، صفحہ ۱۲۴)

"غالب کی طرف جو سکہ منسوب کیا گیا تھا، وہ ذوق کا نہیں، بلکہ ذوق کے شاگرد حافظ ویران کا تھا جو انھوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت شروع ہونے کے بعد کہا تھا اور یہ سکہ دہلی کے صادق الاخبار میں "سکہ نو" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔۔۔ (صادق الاخبار، ۱۳ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ، نیشنل آرکائیوز آف انڈیا (نئی دہلی) میں "غدر کی دستاویزیں" میں جو مخبروں کے خطوط ہیں، اُن میں سے ایک میں گوری شنکر نے یہی سکہ میرزا غالب سے منسوب کیا ہے۔ غالباً اسی خط کی بنا پر غالب پر سکہ کہنے کا الزام لگا تھا۔" (عتیق صدیقی، غالب اور ابوالکلام، دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۱۵۲)

کہیں بات ہونہ آیا۔ یہ دھبّا مجھ پر رہا۔ پنسن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام، نشان، خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر، جو کچھ ہوا، چوں کہ موافق رضائے الٰہی کے ہے، اس کا گلہ کیا:

چوں جنبش سپہر بہ فرمان داور ست
بے داد نبود آنچہ بما آسماں دہد

(صاحب عالم مارہروی، ۱۸۵۹ء)

"آپ نے خط لکھا اور میرا حال پوچھا۔ یہ پرسش، حکم نشتر کا رکھتی ہے۔ اب رگِ قلم کی خونابہ فشانی دیکھو۔"

(خواجہ غلام غوث بے خبر، مارچ ۱۸۶۰ء)

"گورنر اعظم نے میرٹھ میں دربار کا حکم دیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے سات جاگیرداروں میں سے جو تین بقیۃ السّیف تھے (پاٹودی، دوجانہ اور لوہارو) اُن کو حکم دیا اور دربارِ عام میں سے سوائے میرے کوئی نہ تھا۔ یا چند مہاجن۔ مجھ کو کوئی حکم نہ پہنچا۔ جب میں نے استدعا کی تو جواب ملا کہ اب نہیں ہو سکتا۔ جب یہ سرزمین مخیم خیام گورنری ہوئی۔ میں اپنی عادتِ قدیم کے مطابق خیمہ گاہ میں پہنچا۔ (میر منشی) مولوی اظہار حسین خاں صاحب بہادر سے ملا۔ چیف سکرتر بہادر کو اطلاع کی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ میں سمجھا کہ اس وقت فرصت نہیں۔ دوسرے دن پھر گیا میری اطلاع کے بعد حکم ہوا کہ ایامِ غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے، اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ اُس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خط اُن کے نام کا لکھ کر، اُن کو بھیجا۔ مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اخلاص مظنّہ محض ہے، اُمیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو، تاکہ میری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب

نہ ہوا۔ اب ماہِ گذشتہ یعنی فروری میں پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے۔ پس یہ مقدمہ طے ہوا۔ دربار و خلعت موقوف۔ پنسن مسدود۔ وجہ نامعلوم۔ لاموجود اِلّا اللہ۔ لامؤثر فی الوجود اِلّا اللہ۔

(خواجہ غلام غوث بے خبر، مارچ ۱۸۶۰ء)

"۱۸۶۰ء میں لارڈ صاحب بہادر نے میرٹھ میں دربار کیا۔ صاحبِ کمشنر بہادر دہلی اہالیِ دہلی کو ساتھ لے گئے۔ میں نے کہا "میں بھی چلوں" فرمایا "نہیں"۔ جب لشکر میرٹھ سے دلّی میں آیا، موافق اپنے دستور کے، روز دروُدِ لشکر منیم میں گیا۔ میر منشی صاحب سے ملا۔ اُن کے خیمے میں سے اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر بہادر کے پاس بھیجا۔ جواب آیا کہ تم غدر کے دنوں میں بادشاہ باغی کی خوشامد کیا کرتے تھے۔ اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں۔ میں گدائے مبرم اس حکم پر ممنوع نہ ہوا۔ جب لارڈ صاحب بہادر کلکتہ پہنچے۔ میں نے قصیدہ حسبِ معمولِ قدیم بھیج دیا۔ مع اس حکم کے واپس آیا کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔ میں مایوس ہو کر بیٹھ رہا اور حکّامِ شہر سے ملنا ترک کیا۔"

(خواجہ غلام غوث بے خبر، مارچ ۱۸۶۳ء)

"دربار لارڈ صاحب کا میرٹھ میں ہوا۔ دلّی کے علاقے کے جاگیردار، بموجب حکم کمشنر دہلی، میرٹھ گئے۔ موافق دستورِ قدیم مل آئے۔ غرض کہ پنج شنبہ ۲۹ دسمبر کو پہر دن چڑھے لارڈ صاحب یہاں پہنچے۔ کابلی دروازے کی فصیل کے تلے ڈیرے ہوئے۔ اُسی وقت توپوں کی آواز سُنتے ہی میں سوار ہو کر گیا، میر منشی سے ملا۔ اُن کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سکرتر کو خبر کروائی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں، یہ جواب سُن کر نومیدی کی پوٹ باندھ کر لے آیا۔" (مجروح، یکم جنوری ۱۸۶۰ء)

"پرسوں (پنج شنبہ ۲۹ دسمبر ۱۸۵۹ء)، پہر دن چڑھے لارڈ صاحب کا لشکر آیا۔ کابلی دروازے کی فصیل کے قریب، بھولو شاہ کی قبر کے سامنے خیمۂ خاصہ برپا ہوا اور باقی لشکر تیس ہزاری باغ تک اترا ہے۔ (میں)... لشکر کو گیا۔ میر منشی سے ملا۔ اُن کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سکرتر بہادر کو اطلاع کروائی۔ چپراسی کے ساتھ کلّو بھی گیا۔ جواب آیا کہ ہمارا اسلام دو اور کہو فرصت نہیں ہے۔ خیر میں اپنے گھر آیا۔ کل پھر گیا، خبر کروائی، حکم ہوا کہ غدر کے زمانے میں تم باغیوں کی خوشامد کرتے رہتے تھے، اب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو؟ عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا۔ یہ جواب پیامِ نومیدیِ جاوید ہے: نہ دربار، نہ خلعت، نہ پنسن۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ راجعُون۔"

(حسین میرزا، ۳۱ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"سنو داستان: صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی جناب سانڈرس صاحب بہادر نے مجھ کو بلایا۔ پنج شنبہ ۲۴ فروری کو میں گیا۔ صاحب شکار کو سوار ہو گئے تھے۔ میں اُلٹا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵ فروری کو گیا، ملاقات ہوئی، کرسی دی۔ بعد پرسشِ مزاج کے ایک خط انگریزی چار ورق کا اٹھا کر پڑھتے رہے۔ جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے میکلوڈ صاحب، حاکم اکبر صدر بورڈ پنجاب کا۔ تمھارے باب میں لکھتے ہیں کہ ان کا حال دریافت کرکے لکھو۔ سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکہ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو؟ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمدۂ ولایت لے گیا تھا، وہ پڑھوا دیا۔ پھر پوچھا تم نے کتاب کیسی لکھی ہے؟۔ اس کی حقیقت بیان کی۔ کہا: "ایک میکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے اور ایک ہم کو دو۔" میں نے عرض کیا: "کل حاضر کر دوں گا۔" پھر پنسن کا حال پوچھا، وہ گزارش کیا۔ اپنے گھر آیا اور خوش آیا۔

دیکھو میر مہدی، حاکم پنجاب کو مقدمۂ ولایت کی کیا خبر؟ کتابوں سے کیا اطلاع؟ پنسن کی پُرسش سے کیا مدّعا؟ یہ استفسار بہ حکم نواب گورنر جنرل بہادر ہُوا ہے۔ یہ صورت مقدمۂ فتح و فیروزی ہے۔ غرض کہ دوسرے دن یک شنبہ یومِ تعطیل تھا، میں اپنے گھر رہا۔ دوشنبہ ۲۸ فروری کو گیا۔ باہر کے کمرے میں بیٹھ کر اطلاع کروائی۔ کہا: "اچھا توقف کرو۔" بعد تھوڑی دیر کے ... باہر نکلے میں نے کہا: "وہ کتابیں حاضر ہیں۔" کہا "منشی جیون لال کو دے جاؤ۔" سہ شنبہ یکم مارچ کو پھر گیا۔ بہت التفات اور اختلاط سے باتیں کرتے رہے۔ کچھ سرٹیفکیٹ گورنروں کے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ دکھائے ایک خط میکلوڈ صاحب بہادر کے نام کا لے گیا تھا، وہ دیکھ کر استدعا کی کہ کتاب کے ساتھ یہ بھی بھیجا جائے: "بہت اچھا" کہہ کر رکھ لیا پھر مجھ سے کہا کہ ہم نے تمھاری پنسن کے باب میں اجرٹن صاحب بہادر ... (مجسٹریٹ دہلی) کو کچھ لکھا ہے، تم اُن سے ملو۔ عرض کیا: "بہتر۔" اجرٹن صاحب بہادر ... گئے ہوئے تھے، کل وہ آئے۔ آج میں نے اُن کو خط لکھا ہے۔ جیسا وہ حکم دیں گے، اُس کے موافق کروں گا۔ جب بلائیں گے، تب جاؤں گا۔

دیکھو سیّد، اسد اللہ الغالب علیہ السّلام کی مدد کو، کہ اپنے غلام کو کس طرح سے بچایا۔ بائیس مہینے تک مجھ کو پیاسا بھی نہ رہنے دیا۔ پھر کس ڈھب سے کہ وہ آج سلطنت کا دھندا ہے، میرے تفقّد کا حکم بھجوایا۔ حکام سے مجھ کو عزّت دلوائی۔ میرے صبر و ثبات کی داد ملی۔ صبر و ثبات بھی اُسی کا بخشا ہوا تھا، میں کیا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا؟"

(مجروح، مارچ ۱۸۵۹ء)

"راہ و رسمِ مراسلت حکامِ عالی مقام سے بہ دستور جاری

ہو گئی ہے :

(بہ چودھری عبدالغفور سرور، اپریل ۱۸۶۰ء)

" دلّی کے سب پنسن داروں کو مئی ۱۸۵۷ء سے پنسن نہیں ملا۔ یہ فروری ۱۸۵۹ء بائیسواں مہینہ ہے۔ چند اشخاص کو بائیس مہینے میں سال بھر کا روپیہ بطریق مدد خرچ مل گیا۔ باقی چڑھے ہوئے رُوپے کے باب میں اور آئندہ ماہ بہ ماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں ہوا... علی بخش خاں[1] پچاس رُوپے مہینہ پاتے تھے۔ بائیس مہینے کے گیارہ سو رُوپے ہوتے ہیں ان کو چھ سو روپیہ مل گیا، باقی روپیہ چڑھا رہا، آئندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں غلام حسن خاں[2] سو روپیہ مہینے کا پنسن دار۔ بائیس مہینے کے بائیس سو رُوپے ہوتے ہیں، اس کو بارہ سو رُوپے ملے۔ دیوان کشن لال کا ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ تھا۔ بائیس مہینے کے تین ہزار تین سو ہوتے ہیں، اس کو اٹھارہ سو روپے ملے۔ مناجماعہ دار دس روپے کا سکّہ لمبر، سال بھر کے ایک سو بیس لے آیا۔ اسی طرح پندرہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے۔ آئندہ کے واسطے کچھ حکم نہیں۔ مجھ کو مدد خرچ نہیں ملا۔ جب کئی خط پر خط لکھے تو آخر خط پر صاحب کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ سائل کو بہ طریق مدد خرچ سو رُوپے مل جائیں۔ میں نے دہ سَو رُوپے نہ لیے اور پھر صاحب کمشنر بہادر کو لکھا کہ میں باسٹھ رُوپے آٹھ آنے مہینہ پانے والا ہوں۔ سال بھر کے ساڑھے سات سو رُوپے ہوتے ہیں۔ سب پنسن داروں کو سال بھر کا رُوپیہ ملا، مجھ کو سو رُوپے

---

[1] علی بخش خاں بن الٰہی بخش خاں معروف، میرزا غالب کے برادرِ نسبتی۔

[2] غلام حسن خاں محو، بن غلام حسین خاں مسرور، جو غالب کے ہم زلف تھے۔

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب جلد ۱، ص ۳۵۳)

کیسے ملتے ہیں؟ مثل اوروں کے مجھے بھی سال بھر کا رُوپیہ مل جائے، ابھی اس میں کچھ جواب نہیں ملا۔"

(میر مہدی مجروح، فروری ۱۸۵۹ء)

"میرے پنسن اور ولایت کے انعام کا حال کما حقہ، سمجھ لو۔ وللہ حسن الطاف خفیہ۔ ایک خاص طرز پر تحریک ہوئی۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکم پنجاب کو لکھا کہ حاکم دلّی سے فلاں شخص کے پنسن کے چڑھے ہوئے رُوپے یک مُشت پانے کی اور آئندہ ماہ بہ ماہ ملنے کی رپورٹ منگوا کر، اپنی منظوری لکھ کر، ہمارے پاس بھیج دو تاکہ ہم منظوری دے کر تمھارے پاس بھیج دیں۔ سو اُس کی تعمیل بہ طرزِ مناسب یہاں ہوگی۔ کم و بیش دو مہینے میں سب روپیہ مل جائے گا اور ہاں، صاحب کمشنر بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو رُوپے کی ضرورت ہو تو سو رُوپے خزانے سے منگوا لو۔ میں نے کہا: صاحب، یہ کیسی بات ہے کہ اوروں کو برس دن کا رُوپیہ ملا، اور مجھے سو رُوپے دلواتے ہو؟ فرمایا کہ اب چند روز میں سب روپیہ اور اجرا کا حکم مل جائے گا، اوروں کو یہ بات برسوں میں میسّر آئے گی۔ میں چُپ ہو رہا۔ آج دو شنبہ یکم شعبان اور ہفتم مارچ ہے، دو پہر ہو جائے تو اپنا آدمی مع رسید بھیج کر سو رُوپے منگالوں۔ پر، یار، ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے۔ حکم تو اسی حکم کے ساتھ اُس کی رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے، مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی راے لکھو۔ اب دیکھیے، یہ دو حاکم یعنی حاکم دہلی اور حاکم پنجاب، اپنی راے کیا لکھتے ہیں۔ پنجاب کے گورنر بہادر کا یہ بھی حکم ہے کہ "دستنبو" منگا کر اور تم دیکھ کر ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اس میں کیا لکھا ہے؟ چناں چہ حاکم دہلی نے کتاب بھی کہہ کر مجھ سے مانگی اور میں نے دی۔ اب دیکھو، حاکم

پنجاب کیا لکھا ہے ؟ "

(میر مہدی مجروح ، ۷ر مارچ ۱۸۵۹ء)

"پنسن جاری ہو گیا۔ تین برس کا چڑھا ہوا روپیہ مل گیا۔ بعد ادائے قرض ستاسی رُوپے گیارہ آنے بچے۔ اب ماہ بہ ماہ روپیہ ملتا ہے، مگر یہی تین مہینے ستمبر، اکتوبر، نومبر ملیں گے۔ دسمبر ۱۸۶۰ء سے تنخواہ ششماہی ہو جائے گی۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ چار رُوپے سیکڑا سالانہ عموماً وضع ہوا کرے گا۔ اس حساب سے میرے حصّے میں ڈھائی روپیہ مہینہ آیا۔ باسٹھ رُوپے آٹھ آنے کے ساٹھ رہیں گے "

(چودھری عبدالغفور سرور، ستمبر ۱۸۶۰ء)

"صاحب! میری داستان سنیے۔ پنسن بے کم وکاست جاری ہوا۔ زرِ مجتمعہ سہ سالہ یک مُشت مل گیا۔ بعد ادائے حقوق چار سو روپے دینے باقی رہے اور ستاسی رُوپے گیارہ آنے مجھے بچے۔ مئی کا مہینہ بہ دستور ملا۔ آخر جون میں حکم ہو گیا کہ پنسن دار علی العموم ششماہی پایا کریں۔ ماہ بہ ماہ پنسن تقسیم نہ ہوا کرے "

(علائی، ۸ر جولائی ۱۸۶۰ء)

"اب میری کہانی سُنو: آخر جون میں صدر پنجاب سے حکم آگیا کہ پنسن دارانِ قدیم ماہ بہ ماہ نہ پائیں۔ سال میں دو بار، بہ طریق ششماہہ فصل بہ فصل پایا کریں۔ ناچار ساہو کار سے سُود کاٹ کر روپیہ لیا گیا "نارام پُور کی آمد میں مل کر صرف ہو۔ یہ سُود چھ مہینے تک اسی طرح کٹوان دینا پڑے گا۔ ایک رقم معقول گھاٹے میں جائے گی " (تفتہ، ۲۰ جولائی ۱۸۶۰ء)

"تنخواہ کی سلنو : دو برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوتے ۔ سو رُوپے، مدد خرچ کے جو پائے تھے ، وہ کٹ گئے ۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں اُٹھ گئے مختار کار دو ہزار لایا ۔ چوں کہ میں اس کا قرض دار ہوں ، رُوپے اُس نے اپنے گھر میں رکھے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجیے ۔ حساب کیا ، سود مول سات کم پندرہ سو رُوپے ہوئے ۔ میں نے کہا ، میرے قرضِ متفرق کا حساب کر ۔ کچھ اُوپر گیارہ سو روپے نکلے ہیں ۔ میں کہتا ہوں یہ گیارہ سو رُوپے بانٹ دے ، نو سو بچے ، آدھے تو لے ، آدھے مجھے دے ، وہ کہتا ہے پندرہ سو مجھ کو دو ، پانچ سو سات تم لو ، یہ جھگڑ مٹ جائے گا ۔ تب کچھ ہاتھ آئے گا خزانے سے رُوپیہ آگیا ہے ۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں ۔
بات رہ گئی ، پت رہ گئی ۔ حاسدوں کو موت آگئی ۔ دوست شاد ہو گئے ۔
میں جیسا ننگا بھوکا ہوں ، جب تک جیوں گا ، ایسا ہی رہوں گا ۔ میرا دارو گیر سے بچنا کرامت اسد اللہی ہے ۔ ان پیسوں کا ہاتھ آنا عطیۂ ید اللہی ہے حاکم شہر لکھ دے کہ یہ شخص ہرگز پنسن پانے کا مستحق نہیں ، حاکم صدر مجھ کو پنسن دلوائے اور پورا دلوائے ۔"

(مجروح ، مئی ۱۸۶۰ء)

"بعد غدر ، بجرم مصاحبت بہادر شاہ ، دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے ۔ میری برارت کی درخواست گزری ، تحقیقات ہوتی رہی ، تین برس کے بعد پنسن چھٹا ۔"

(حبیب اللہ ذکا ، ۱۵ فروری ۱۸۶۷ء)

"غدر کے رفع ہونے اور دلّی کے فتح ہونے کے (تین برس) بعد میرا پنسن کھلا ۔ چڑھا ہوا رُوپیہ دام دام ملا ۔ آئندہ کے لیے بے کم و کاست جاری

ہوا ــــ مگر لاٹ صاحب کا دربار و خلعت جو معمولی و مقرری تھا، مسدود ہو گیا۔ یہاں تک کہ صاحب سکرتر بھی مجھ سے نہ ملے اور کہلا بھیجا کہ اب گورنمنٹ کو تم سے ملاقات کبھی منظور نہیں۔ میں فقیر متکبر، مایوس دائمی ہو کر اپنے گھر بیٹھ رہا اور حکامِ شہر سے بھی ملنا موقوف کر دیا۔"

(شیو نرائن آرام، ۱۸۶۲ء)

"اب میرا حال سنو:

در نومیدی بسے اُمید است

پایانِ شبِ سیہ سپید است

ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو سات پارچے اور تین رقم جواہر، خلعت ملتا تھا۔ لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار اور خلعت بند کر گئے ہیں۔ نا اُمید ہو کر بیٹھ رہا اور مدت العمر کو مایوس ہو رہا۔ اب جو یہاں لیفٹننٹ گورنر پنجاب آئے ہیں، میں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ کل انھوں نے مجھ کو بلا بھیجا۔ بہت سی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلی میں دربار نہ کریں گے۔ میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں ان اضلاع کے علاقہ داروں اور مال گزاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالے جائیں گے۔ دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہوگا، تم بھی انبالے جاؤ، شریک ہو کر خلعتِ معمولی لے آؤ۔ بھائی! کیا کہوں کہ کیا میرے دل پر گزری، گویا مُردہ جی اُٹھا۔"

(تفتہ، ۴ر مارچ ۱۸۶۳ء)

"بڑے لاٹ صاحب کے ورود کے زمانے میں نواب لیفٹننٹ گورنر بہادر پنجاب بھی دلی میں آئے۔ دربار کیا۔ خیر، کرو، مجھ کو کیا۔ ناگاہ دربار کے

تیسرے دن بارہ بجے چپراسی آیا اور کہا نواب لیفٹننٹ گورنر نے یاد کیا ہے۔ (بیماری کی وجہ سے)... اُٹھنا دُشوار ہے... بہ ہر حال سوار ہوا گیا۔ پہلے صاحب سکرتر بہادر سے ملا۔ پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ تصوّر میں کیا، بلکہ تمنّا میں بھی جو بات نہ تھی، وہ حاصل ہوئی یعنی عنایت سی عنایت۔ اخلاق سے اخلاق۔ وقتِ رخصت خلعت دیا اور فرمایا کہ یہ ہم تجھ کو اپنی طرف سے ازراہِ محبّت دیتے ہیں اور مژدہ دیتے ہیں کہ لارڈ صاحب کے دربار میں بھی تیرا نمبر اور خلعت کھل گیا۔ انبالے جا۔ دربار میں شریک ہو، خلعت پہن (بیماری کا) حال عرض کیا گیا۔ فرمایا خیر، اور کبھی کے دربار میں شریک ہونا۔ اِس پھوڑے کا بُرا ہو۔ انبالے نہ جا سکا۔"

(شیو نرائن آرام، ۱۸۶۳ء)

"نواب لیفٹننٹ گورنر جنرل منٹگمری بہادر اس شہر میں آئے تو مجھ کو یاد کیا۔ بہت عنایت فرمائی۔ ایک شالی رومال سوزن کار اور ایک گلوبند سوزن کار اور ایک الوان کی فرد چار گز لمبی، یہ تین کپڑے مجھ کو دیے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ میرا موجب اعزاز و افتخار ہے، مگر میری جان اُلجھی ہوئی ہے، لارڈ صاحب کے دربار و خلعت میں۔ فرمایا: "اچھا، اچھا"۔ دوسرے دن لارڈ صاحب آئے... تیسرے دن لیفٹننٹ گورنر پنجاب سے رُخصت ہونے گیا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ میں ہمیشہ لارڈ صاحب کے دربار سے سنہرے اساوری کے سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید تین رقم ہمیشہ پایا کیا۔ اب یہ، اور دربار اور خلعت بند ہے۔ اِس کا مجھ کو بڑا غم ہے، فرمایا کہ غم نہ کرو۔ تمھارا دربار اور خلعت کھل گیا۔ انبالے جاؤ گے تو دربار و خلعت پاؤ گے۔ میں نے اپنا ہاتھ دکھایا

کہ حضرت! بوڑھا ہوں اور زخمی ہو گیا ہوں۔ اب لارکس طرح جاؤں گا؟
..... خیر آئندہ دربار میں پاؤ گے..... مولوی اظہار حسین خاں میر
منشی کہتے تھے کہ لارڈ صاحب تمہارے دربار و خلعت کے واگزاشت
کا حکم دے کر کلکتے سے ادھر کو روانہ ہوئے ہیں۔"

(میرزا عباس بیگ، ۱۲ مئی ۱۸۶۳ء)

"اواخر ماہ گزشتہ یعنی فروری ۱۸۶۳ء میں نواب لیفٹنٹ گورنر پنجاب
دلّی آئے۔ اہالی شہر، صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر و صاحب کمشنر بہادر
کے پاس دوڑے اور اپنے نام لکھوائے۔ میں تو بے گانۂ محض اور
مطرود حکام تھا، جگہ سے نہ ہلا، کسی سے نہ ملا۔ دربار ہوا۔ ہر ایک کامگار
ہوا۔ شنبہ ۸ رفروری کو آزادانہ منشی من پھول سنگھ صاحب کے خیمے
میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر بہادر کے پاس بھیجا، بلایا
گیا۔ مہربان پاکر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی، وہ بھی حاصل
ہوئی۔ وہ حاکم جلیل القدر کی وہ عنایتیں دیکھیں، جو میرے تصور میں
بھی نہ تھیں..... میر منشی لیفٹنٹ گورنر سے سابقۂ تعارف نہ تھا، وہ
بہ طریقِ حُسنِ طلب میرے خواہاں ہوئے تو میں گیا[۱]۔ جب حکّام بہ مجردِ استدعا
مجھ سے بے تکلف ملے، تو میں قیاس کر سکتا ہوں کہ میر منشی کی حُسنِ
طلب بہ ایمائے حکّام ہوگی، وللہ رحمان الطاف خفیہ۔ بقیہ روداد یہ ہے
کہ دوشنبہ دوم مارچ کو سواد شہر مخیم خیام گورنری ہوا۔ آخر روز

---

[۱] کسی ذریعے سے میرزا غالب کو اطلاع پہنچی ہوگی کہ میر منشی ملاقات کے خواہاں ہیں۔ اسی بنا پر میرزا، لیفٹنٹ گورنر پنجاب کی خیمہ گاہ میں پہنچے اور منشی من پھول سنگھ سے ملے۔

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلدِ اوّل، ۱۹۶۹ء، ص ۲۶۴)

میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ تمھارا دربار و خلعت بہ دستور بحال و برقرار ہے۔ متحیر از میں نے پوچھا کہ حضرت کیوں کر ؟ حضرت نے کہا کہ حاکم حال نے ولایت سے آکر تمھارے علاقے کے سب کاغذ، انگریزی و فارسی دیکھے اور بہ اجلاسِ کونسل حکم لکھوایا کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت بہ دستور بحال و برقرار ہے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت یہ امر کس اصل پر متفرع ہوا ؟ فرمایا کہ ہم کو کچھ معلوم نہیں، بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ حکم دفتر میں لکھوا کر چودہ یا پندرہ دن بعد ادھر کو روانہ ہوئے ہیں۔ میں نے کہا، سبحان اللہ :

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما

فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما !

سہ شنبہ ۳ مارچ کو بارہ بجے لیفٹنٹ گورنر نے مجھ کو بلایا، خلعت عطا کیا اور فرمایا کہ لارڈ صاحب بہادر کے ہاں کا دربار اور خلعت بھی بحال ہے۔ انبالے جاؤ گے تو دربار اور خلعت پاؤ گے۔ عرض کیا گیا : حضور کے قدم دیکھے، خلعت پایا۔ لارڈ صاحب کا حکم سُن لیا، نہال ہو گیا۔ اب انبالے کہاں جاؤں ؟ جیتا رہا تو اور دربار میں کامیاب ہو رہوں گا :"

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد

ہر چہ گیرید مختصر گیرید

(غلام غوث بے خبر، مارچ ۱۸۶۳ء)

"غدر سے پہلے ہر دربار میں خلعت پاتا تھا۔ بعدِ "غدر" دربار اور خلعت اور ملاقات سکرتروں کی، یہ سب موقوف۔ اب جو لیفٹنٹ گورنر پنجاب آئے، تو انھوں نے خود مجھے بلا بھیجا اور خلعت دیا اور فرمایا کہ ہم اپنی

طرف سے ازراہِ محبت دیتے ہیں اور یہ نوید علاوہ کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں بھی دربار اور خلعت کھُل گیا۔ انبالے جاؤ گے تو پاؤ گے۔ میں انبالے نہ جا سکا۔ بالفعل نواب گورنر کے خلعت پر قناعت کی۔ اُس خلعت کو بہ شرطِ حیات اور وقت پر موقوف رکھا۔"

(میر سرفراز حسین، ۲۷ مارچ ۱۸۶۳ء)

"ماجرا یہ ہے کہ میں ہمیشہ نواب گورنر جنرل بہادر کے دربار میں سیدھی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت پاتا تھا۔ غدر کے بعد پنسن جاری ہو گیا، لیکن دربار اور خلعت بند۔ اَب کے جو لارڈ صاحب یہاں آئے تو اہلِ دفتر نے بموجبِ حکم مجھ کو اطلاع دی کہ تمہارا دربار اور خلعت واگزاشت ہو گیا، مگر دلّی میں دربار نہیں، انبالے آؤ گے تو دربار میں نمبر اور خلعت معمولی پاؤ گے۔ میں نے خبر میں وجدان کا مزا پایا اور انبالے نہ گیا۔ رابرٹ منٹگمری صاحب لیفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب یہاں آئے۔ دربار کیا۔ میں دربار میں نہ گیا۔ دربار کے بعد ایک دن بارہ بجے چپراسی آکر مجھ کو بُلا لے گیا۔ بہت عنایت فرمائی اور اپنی طرف سے خلعت عطا کیا۔"

(قدر بلگرامی، ۱۸۶۳ء)

"منگل ۳ مارچ کو جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے خلعت عطا کیا اور فرمایا کہ "ہم تمھیں مژدہ دیتے ہیں کہ نواب گورنر جنرل بہادر نے اپنے دفتر میں تمہارے دربار اور خلعت کے بہ دستور بحال رہنے کا حکم لکھوا دیا۔" میں نے عرض کیا کہ "میں انبالے جاؤں؟" فرمایا: "البتہ جانا ہوگا۔"

(نواب یوسف علی خاں، ۱۶ مارچ ۱۸۶۳ء)

"لو صاحب، ہم نے لفٹنٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کر کے انبالے کا جانا موقوف کیا اور بڑے گورنر کا دربار اور خلعت، اور وقت پر موقوف رکھا۔ بیمار ہوں، ہاتھ پر ایک زخم، زخم کیا غار ہو گیا ہے۔"

(تفتہ، ۴ر مارچ ۱۸۶۳ء)

"واگزاشت کا حکم سنتا ہوں کہ ہو گیا ہے۔ میرے پاس تحریر اس حکم کی بھی ابھی نہیں پہنچی اور تعمیل بھی ابھی نہیں ہوئی۔ یعنی نہ میں دربار میں گیا، نہ خلعت پایا۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی ملاقات اور ان کا خلعت اور امر ہے، یہ اور بات ہے۔ اس امر اور اس بات سے اُس کو ہرگز علاقہ نہیں۔ اب میں نے..... چیف سکرتر کو فارسی میں خط بھیجا ہے.. جاننا چاہیے کہ گورنمنٹ سے میرے واسطے تین دستور جاری ہیں: دربار، خلعت، خط، بعد غدر کے تینوں دستور بند ہو گئے۔ اب دربار اور خلعت کی واگزاشت کی خبر سن کر سکرتر صاحب کو خط لکھا ہے۔ جواب آنے پر دل جمعی کا مدار ہے۔"

(میرزا عباس بیگ، ۱۲ر مئی ۱۸۶۳ء)

"جب انبالے میرا جانا نہ ہوا تو میں نے قصیدۂ مدح جو دربار کی نذر کے واسطے لکھا تھا بہ طریقِ ڈاک جناب چیف سکرتر بہادر کو اس مراد سے بھیجا، کہ آپ اس کو جناب نواب معلیٰ القاب کی نظر سے گزرانیں اور یہ دستور قدیم تھا کہ جب میں قصیدہ مدحیہ بھیجتا تو صاحب سکرتر بہادر کا خط، بے واسطۂ حکّام ماتحت مجھ کو آجاتا۔ اب جو میں نے موافقِ معمول قصیدہ بھیجا، یقین ہے کہ مارچ یا اپریل کے مہینے میں وہ لفافہ یہاں سے لشکر کو گیا صدائے برنخاست، ناامید ہو کر بیٹھ رہا، بلکہ یہ خیال گزرا کہ جب رسم تحریر

خلوط نہ رہی تو دربار اور خلعت کہاں؟ ناگاہ کل شام کو صاحب سکرتر بہادر کا خط ڈاک میں آیا، وہی افشانی کاغذ، وہی القاب۔"

(نواب محمد یوسف علی خاں، ۴ اگست ۱۸۶۳ء)

"پیش از غدر گورنمنٹ کے دربار میں سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید، تین رقمیں جواہر کی مجھ کو ملتی تھیں۔ بعدِ غدر اگرچہ پنسن اور دربار بحال رہا، لیکن خلعت موقوف ہو گیا۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کا کل بارہ پر چار بجے دربار تھا۔ حکم سب درباداروں کو پہنچ گیا تھا۔ میں نواب مہدی علی خاں صاحب کو رخصت کر کے گھر آیا۔ دو گھنٹے کے بعد دربار میں گیا۔ خیال یہی کہ ملاقات ہوگی، ایک رُباعی کاغذِ مذہب پر لکھی ہوئی نذر کروں گا، کلماتِ عنایت سُن کر چلا آؤں گا۔ نہ مجھے کچھ احتمال، نہ صاحب کمشنر بہادر شہر کو علم[۱]۔ بارے بروقت

---

[۱] "میرزا صاحب کے اس بیان سے کہ نہ تو کمشنر کو علم تھا کہ اسداللہ خاں کو خلعت ملے گا اور نہ مجھے اس کا خیال گزرتا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ اب تک خلعت بحال نہیں ہوا تھا، صرف شرکتِ دربار کی اجازت ملی تھی، ورنہ گورنر خلعت دیتے وقت کیوں کہتا کہ یہ ہم نے آپ کے واسطے رکھا تھا۔ اس کے شکریے میں میرزا صاحب نے جو قطعہ لکھا۔ اُس کا ایک شعر (یہ) ہے:

چو بے طلب بمن این ہا رسیدہ است، بود
زبہرِ مطلبِ خویشم توقعِ امضا!

اُس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ میرزا صاحب خلعت سے مایوس تھے، ورنہ بے طلب کی قید کیوں لگاتے، لیکن وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ۱۸۶۳ء میں منٹگمری صاحب نے بلا کر خلعت دیا، تو کہا کہ "ہم تمھیں مژدہ دیتے ہیں۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے اپنے دفتر میں تمھارے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم لکھوا دیا۔" اس صورت میں یہ بھی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ انھوں نے کسی مصلحت سے اُس وقت یہ بات مشہور کر دی تھی۔" (مولانا امتیاز علی عرشی حواشی مکاتیبِ غالب طبع چہارم)

ملاقات، تعظیم معمولی اور مصافحہ کرکے لارڈ صاحب نے کھڑے کھڑے جیغہ سرپیچ میری ٹوپی پر باندھا اور فرمایا کہ یہ ہم نے آپ کے واسطے رکھا تھا۔ مالائے مروارید میر منشی نے گلے میں ڈال دی۔ یہ پارچے سات مرحمت ہوئے دوشالہ ایک۔ کم خواب کا تھان ایک۔ بنارسی تھان سنہری بوٹے ایک۔ بنارسی سیلا ایک۔ الوان کی چادر کلابتون ایک۔ کنا وِیز کا تھان ایک۔ الوان کی چادر بے کنارہ ایک۔"

(نواب کلب علی خاں، ۱۰ر دسمبر ۱۸۶۶ء)

"دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں، کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔"

(مجروح، ۲ر دسمبر ۱۸۵۹ء)

"مرزا تم بڑے بے درد ہو۔ دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا، بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں نیچہ بند تو میسر نہیں صحاف اور نقاش کہاں؟"

(تفتہ، ۳ر ستمبر ۱۸۵۸ء)

"کل تمہارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے، ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم ... مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ وہ دلی نہیں ہے کہ جس میں، میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے۔" (علائی، ۱۴ر فروری ۱۸۶۲ء)

"اللہ اللہ، دلّی نہ رہی اور دلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسنِ اعتقاد! ارے بندۂ خدا، اُردو بازار نہ رہا اُردو کہاں؟ دلّی، واللہ اب شہر نہیں ہے، کمپ ہے، چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔"

(مجروح، ۱۸۶۰ء)

"میں تم کو لکھ چکا ہوں کہ دلّی کا قصد کیوں کرو اور یہاں آکر کیا کروگے؟"

(تفتہ، ۳۱ جنوری ۱۸۵۸ء)

"یہ شہر، اب شہر نہیں، قہر ہے۔"

(غلام نجف خاں(؟) ۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء)

"یہاں سے باہر، اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا ابھی دیکھنا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔" (تفتہ، ۵ر دسمبر ۱۸۵۷ء)

"تم کہتے ہو کہ آیا چاہتا ہوں، اگر آؤ تو بے ٹکٹ کے نہ آنا۔"

(مجروح، ۱ر فروری ۱۸۵۸ء)

"مسلمان آدمی شہر میں سڑک پر بن ٹکٹ پھر نہیں سکتا۔"

(تفتہ، ۵ر مارچ ۱۸۵۸ء)

"اب اہلِ دہلی ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں، یا پنجابی ہیں یا

گورے ہیں۔" (مجروح، ماقبل ۱۸۶۱ء)

"..... ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالب وہ بے خود و مدہوش نہ سخنوری رہی، نہ سخندانی، کس برتے پر تتا پانی؟ ہائے دلی! وائے دلی! بھاڑ میں جائے دلی۔"

(مجروح، ۲۳ مئی ۱۸۶۱ء)

"(اب دہلی میں) مسلمان: اہلِ حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ (ظفر) کے ذکور، جو بقیۃ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں، کٹنیاں اور جو جوان ہیں، کسبیاں۔" (علائی، ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء)

"ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گزری؟ اموال کیا ہوئے؟ اشخاص کہاں گئے؟ خاندانِ شجاع الدولہ کے زن و مرد کا انجام کیا ہوا؟" (مہر، اوائل ۱۸۵۸ء)

"بھائی لکھنؤ میں وہ امن و امان ہے کہ نہ ہندوستانی عمل داری میں ایسا امن و امان ہوگا، نہ اس فتنہ و فساد سے پہلے انگریزی عمل داری میں یہ چین ہوگا۔ اُمرا اور شرفا کی حکام سے ملاقاتیں، بہ قدر رُتبہ تعظیم و توقیر پنسن کی تقسیم علی العموم، آبادی کا حکم عام۔ لوگوں کو کمال لطف اور نرمی سے آباد کرتے جاتے ہیں۔ اور دیک نقل سُنو، وہاں کے صاحب کمشنر بہادر اعظم نے جو دیکھا کہ علے میں ہنود بھرے ہوئے ہیں، اہلِ اسلام نہیں، ہنود کو اور علاقوں پر بھیج دیا اور اُن کی جگہ سب مسلمانوں کو بھرتی

گیا۔ یہ آفت تو دلّی ہی پر ٹوٹ پڑی ہے۔ لکھنؤ کے سوا اور شہروں میں عمل داری کی وہ صورت ہے جو غدر سے پہلے تھی۔"

(مجروح، فروری ۱۸۵۹ء)

"لکھنؤ کا کیا کہنا! وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اللہ اللہ! وہ سرکار امیر گر تھی جو بے سروپا وہاں پہنچا، امیر بن گیا۔ اُس باغ کی یہ فصلِ خزاں!"

(سیّاح، ۳۰ رجون ۱۸۶۰ء)

"رفعِ فتنہ و فساد اور بلاد میں مسلّم۔ یہاں کوئی طرح آسائش کی نہیں ہے۔ اہلِ دہلی عموماً بُرے ٹھہر گئے، یہ داغ اُن کی جبینِ حال سے مٹ نہیں سکتا۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، ۱۸۵۹ء)

"دلّی کے اُمرا خصوصاً اُمراے شاہی ہر شہر میں بدنام اتنے ہیں کہ لوگ ان کے سایے سے بھاگتے ہیں۔"

(یوسف میرزا، ۲۹ رنومبر ۱۸۵۹ء)

"دلّی اب شہر نہیں، چھاؤنی ہے، کمپ ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر کے اُمرا، نہ اطرافِ شہر کے روسا۔"

(نواب یوسف علی خاں، ۲۶ ردسمبر ۱۸۶۴ء)

"یہ شہر بہت غارت زدہ ہے نہ اشخاص باقی، نہ امکنہ۔"

(جنونؔ، ۲۲ رفروری ۱۸۶۱ء)

"نہ کہیں جانے کا ٹھکانا، نہ کوئی میرے پاس آنے والا۔"

(یوسف میرزا، ۲۸ر نومبر ۱۸۵۹ء)

"اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ ہے کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔"

تفتہ، ۵ر دسمبر ۱۸۵۷ء)

"میرن صاحب، کیوں شہر سے باہر ٹھہریں اور کیوں کسی کے بلانے کی راہ دیکھیں؟ شکرم میں، کرانچی میں، چوپہیے میں، یعنی ڈاک میں آئیں — بلی ماروں کے محلّے میں میرے مکان پر اُتر پڑیں..... ڈاک کو زنہار کوئی نہیں روکتا۔" (مجروح، مئی ۱۸۵۸ء)

"ڈاک کی سواری پر اگر آپ اس شہر میں میرے مکان تک آجاتے تو ممکن تھا، مگر رہنا شہر میں بے حصولِ اجازتِ حاکم، احتمال ضرر رکھتا ہے۔ اگر خبر نہ ہو تو نہ ہو، اگر خبر ہو جائے تو البتہ قباحت ہے۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، موسم گرما ۱۸۵۸ء)

"کہو، کوئی طرح شہر میں تمہارے آنے کی ٹھہری یا نہیں؟ بُعدِ نیس کوس اور آدھ کوس برابر ہے۔ میری جان، تم ہنوز دو جانے میں ہو، مجھ کو تم جانتے ہو کہ میرا شہر میں ہونا بے اجازت سرکار کے نہیں اور باہر نکلنا بے ٹکٹ نہیں، پھر میں کیا کروں؟ کیوں کر وہاں آؤں؟ شہر میں تم ہوتے تو جرات کر کے تمہارے پاس چلا آتا۔" (غلام نجف خاں، جولائی ۱۸۵۸ء)

"آج بدھ دوم فروری ہے۔ مجھ کو (میرٹھ سے) آئے ہوئے نواں دن ہے:

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھاکر سڑک پر بیٹھتا ہے، جو باہر سے گورے کی آنکھ بچاکر آتا ہے، اُس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپے جُرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔"

(مجروح، ۲ رفروری ۱۸۵۹ء)

"سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا: بھائی، تو مجھے نقشے میں نہ رکھ، میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ: اسدُاللہ خاں پنسن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا، نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نہ نکالا گیا۔ کرنل برن صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا، اب حاکمِ وقت کو اختیار ہے۔ پرسوں یہ عبارت جمعدار نے محلّے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی بھیج دی۔"

(مجروح، ۲ رفروری ۱۸۵۹ء)

"واللہ، ڈھونڈے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں..... ہنود البتہ کچھ کچھ آباد

ہو گئے ہیں۔" (تفتہ، ۵ر دسمبر ۱۸۵۷ء)

"شہر کی آبادی کا حکم خاص و عام کچھ نہیں۔ پنسن داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں..... خلق نے از رُوئے قیاس، جیسا کہ دلّی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، یہ بات اُڑا دی، سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے۔ اور پنسن داروں کو جھولیاں بھر بھر کر رُوپے دیے جائیں گے۔ خیر آج بدھ کا دن ۲۲ر دسمبر کی ہے۔ اب کے شنبے کو "بڑا دن" اور اگلے شنبے کو جنوری کا پہلا دن ہے، اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کیا ہوا۔"

(مجروح، ۲۲ر دسمبر ۱۸۵۸ء)

"اب یہاں آبادی کے ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ میں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے:

"ٹکٹ آبادی درونِ شہر دہلی بشرطِ ادخال جُرمانہ۔"

مقدار روپیہ کی حاکم کی رائے پر ہے۔ آج پانچ ہزار ٹکٹ چھپ چکا ہے کل اتوار یوم التعطیل ہے۔ پرسوں دوشنبہ سے دیکھیے یہ کاغذکیوں کر تقسیم ہوں؟"

(مجروح، فروری ۱۸۵۹ء)

"(آبادی کے) پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے، بہ قدر مقدور نذرانہ دے، اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے، آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھیے شہر کے بسنے کی

کون صورت ہے ؟ جو رہتے ہیں، وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں، وہ شہر میں آتے ہیں؟ الملک للہ والحکم للہ۔"

(مجروح، ۲ر فروری ۱۸۵۹ء)

"کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں ؟۔مکان بن چکے ہیں، انھیں ڈھادو اور آئندہ کی ممانعت کا حکم سنادو۔"

(مجروح، ۲ر فروری ۱۸۵۹ء)

"آبادی کا یہ رنگ ہے کہ ڈھنڈورا پٹوا کر، ٹکٹ چھپوا کر اجرٹن صاحب بہادر (مجسٹریٹ دہلی) بہ طریقِ ڈاک کلکتہ چلے گئے۔ دلّی کے حمقا جو باہر پڑے ہوئے ہیں، منہ کھول کر رہ گئے۔اب جب وہ معاودت کریں گے، تب شاید آبادی ہوگی یا کوئی اور نئی صورت نکل آئے۔"

(مجروح، فروری ۱۸۵۹ء)

"اہلِ شہر کی آبادی مسکن، یہاں اس صورت پر نہیں ہے جیسی اور کہیں ہے۔ اور جگہ سیاست ہے کہ منجملہ ضروریاتِ ریاست ہے۔ یہاں قہرِ الٰہی ہے کہ منشائے تباہی ہے۔

(انور الدولہ شفق، نہم مارچ ۱۸۵۹ء)

"دلّی کا حال تو یہ ہے :

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

یہاں دھرا کیا ہے جو کوئی لوٹے گا۔ وہ خبر محض غلط ہے۔ اگر کچھ ہے تو بدیں نمط ہے کہ چند روز گوروں نے اہلِ بازار کو ستایا تھا، اہلِ قلم اور اہلِ فوج نے بہ اتفاق ہمدگر ایسا بندوبست کیا کہ وہ فساد مِٹ گیا اب امن وامان ہے۔"

(مہر، ۱۸۵۹ء)

"آبادی کا آوازہ پھر فرو ہے۔ لاہوری دروازے کے علاقے میں کچھ کم سو گھر آباد ہوئے ہیں۔ کئی ہزار کی بستی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ دو چار برس میں وہ علاقہ آباد ہو جائے گا اور جب وہ علاقہ آباد ہو جائے گا، تو دوسرا علاقہ شروع ہو گا، گھبراؤ نہیں، جلدی کیا ہے۔"

(حسین مرزا، ۱۸ رجون ۱۸۵۹ء)

"آمد و رفت کا ٹکٹ موقوف ہو گیا۔ فقیر، اور ہتھیار جس کے پاس ہو وہ نہ آئے اور باقی ہندو، مسلمان، عورت، مرد، سوار، پیادہ، جو چاہے چلا آئے، چلا جائے، مگر بغیر آبادی کے ٹکٹ کے رات کو رہنے نہ پائے۔" (یوسف میرزا، ۱۸ راگست ۱۸۵۹ء)

"شہر کی آبادی کا چرچا ہوا۔ کرایے کے مکان ملنے لگے۔ چار پانسو گھر آباد ہوئے تھے کہ پھر وہ قاعدہ مٹ گیا۔ خدا جانے کیا دستور جاری ہوا ہے، آئندہ کیا ہو گا۔؟"

(مجروح، ۱۵ راکتوبر ۱۸۵۹ء)

"آبادی کا حکم عام ہے، خلق کا ازدحام ہے۔ آگے حکم تھا کہ مالکان رہیں،

کرایہ دار نہ رہیں، پرسوں سے حکم ہوگیا ہے کہ کرایہ دار بھی رہیں۔ کہیں یہ نہ سمجھنا کہ تم یا میں یا کوئی اور اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہیں رکھتے اور ہمیشہ سے کرایے کے مکان میں رہتے تھے۔ وہ بھی آ رہیں، مگر کرایہ سرکار کو دیں!"

(حسین مرزا، ۹ر نومبر ۱۸۵۹ء)

"مسلمان کی املاک کی واگزاشت کا حکم عام ہوگیا ہے۔ جن کو کرایے پر ملی ہے، ان کو کرایہ معاف ہوگیا ہے"

(مجروح، یکم جنوری ۱۸۶۰ء)

"شہر کی عمارت جو سڑک میں نہیں آئی اور برسات میں ڈھے نہیں گئی۔ وہ سب خالی پڑی ہے، کرایہ دار کا نام نہیں"

(یوسف میرزا، ۲۸ر نومبر ۱۸۵۹ء)

"مکانات کے گرنے کا حال یہ ہے کہ چار پانچ برس ضبط رہے۔ یغمائی (لٹیرے) لوگ، کڑی، تختہ، کواڑ، چوکھٹ، بعض مکانات کی چھت کا مسالا، سب لے گئے۔ اب ان غربا کو وہ مکان ملے تو ان میں مرمت کا مقدور کہاں؟ فرمائیے مکانات کیوں کر نہ گریں؟"

(انورالدولہ شفق، ۱۱ر اگست ۱۸۶۲ء)

"حضرت! انہدام مساکن و مساجد کا حال کیا گزارش کروں؟ بانیِ شہر کو وہ اہتمام مکانات کے بنانے میں نہ ہوگا، جو ابِ والیانِ ملک کو ڈھانے میں ہے۔ اللہ، اللہ! قلعہ میں اکثر اور شہر میں بعض بعض وہ شاہ جہانی

عمارتیں ڈھائی گئی ہیں کہ کدال ٹوٹ ٹوٹ گئے ہیں بلکہ قلعے میں تو ان آلات سے کام نہ نکلا، سرنگیں کھودی گئیں اور بارود بچھائی گئی اور مکانات سنگیں اُڑا دیے گئے۔"

(انورالدولہ شفق، ۲۴؍ اگست ۱۸۶۰ء)

"آغا باقر کا امام باڑہ، اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزا خانہ ہے، ایک بنائے قدیم رفیع مشہور، اس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہو گا۔؟"

(یوسف میرزا، ۲۶؍ جولائی ۱۸۵۹ء)

"مسجد جامع کے باب میں کچھ پرسشیں لاہور سے آئی تھیں، یہاں سے ان کے جواب گئے ہیں۔ یقین ہے کہ واگزار کا حکم آئے اور مسلمانوں کو مل جائے۔ ہنوز بہ دستور پہرا بیٹھا ہوا ہے اور کوئی جانے نہیں پاتا۔"

(سیاح، ۲؍ مئی ۱۸۶۲ء)

"مسجد جامع کی واگزاشت کی خبر مشہور ہے۔ اگر سچ ہو جائے تو کیا دور

لہ "۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو انھوں نے جامع شاہ جہانی پر بھی قبضہ کر لیا تھا، کیوں کہ وہاں سے بھی نمازیوں کے ایک گروہ نے انگریزوں پر شدید حملہ کیا تھا۔ بعض انگریزوں کی یہ تجویز تھی کہ مسجد ڈھادی جائے۔ بعض کہتے تھے کہ اسے گرجے میں تبدیل کر دیا جائے۔ کئی سال کے بعد انگریزوں نے اسے واگزار کر دیا اور انتظام کے لیے ایک کمیٹی بنا دی ———— جس میں انگریز اپنے معتمد علیہ مسلمانوں کو نامزد کرتے۔"

(مولانا غلام رسول مہر، ایضاً)

ہے۔ شاہِ اودھ کی املاک بھی واگزاشت کی خبر مشہور ہے[1]۔"

(مجروح، ۲۰ر نومبر ۱۸۶۲ء)

"مسجد جامع واگزاشت ہوگئی۔ چیلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دُکانیں بنالیں۔ انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگا ہے۔ عشرۂ مبشرہ یعنی دس آدمی مہتمم ٹھہرے: مرزا الٰہی بخش، مولوی صدرالدین، تفضل حسین خاں تین یہ، سات اور۔"

(مجروح، ۱۶ر دسمبر ۱۸۶۲ء)

"کیسی صاحب زادوں کی سی بات کرتے ہو۔ دلّی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو، جیسی آگے تھی؟ قاسم جان کی گلی میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں، اگر آبادی ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خاں کی حویلی ہسپتال ہے اور ضیاء اللہ خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالی شان انگلستان تشریف رکھتے ہیں۔ ضیاء الدین خاں، اور ان کے بھائی مع قبائل و عشائر لوہارو ہیں۔ لال کنوئیں کے محلّے میں خاک اُڑتی ہے... لکھمی کی دُکان پر کتّے لوٹتے ہیں۔"

(مولوی عزیز الدین، ۱۸۵۸ء)

---

۱ "یہاں شہر ڈھے رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار: خاص بازار اور

---

[1] "یعنی شاہِ اودھ کی وہ املاک جو دہلی میں تھیں، ان کے لیے اودھ سے خاص منتظم مقرر ہو کر دہلی آتا تھا۔" (مولانا غلام رسول مہر، ایضاً)

اُردو بازار اور خانم بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا اب پتا بھی نہیں کہ کہاں تھے ؟ صاحبانِ امکنہ و دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دکان کہاں تھی ؟"

(چودھری عبدالغفور سرور، ستمبر ۱۸۶۰ء)

"جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں، حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ (درس گاہ) دارالبقا فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ، شاہ بولا کے بڑ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑا چل رہا ہے۔"

(مجروح، ۸ رنومبر ۱۸۵۹ء)

"چوک (چاندنی) میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے، حوض کے پاس جو کنواں تھا، اس میں سنگ و خشت ڈال کر بند کر دیا۔ بلّی ماروں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔"

(مجروح، ۲۲ ردسمبر ۱۸۵۸ء)

"یہاں دو سڑکیں دوڑتی پھرتی ہیں: ایک ٹھنڈی سڑک، ایک آہنی سڑک (ریلوے لائن)، محل ان کا الگ الگ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا پارک بھی شہر میں بنے گا اور قلعے کے آگے جہاں لال ڈگی ہے، ایک میدان نکالا جائے گا۔ جنوب کی دکانیں، بہیلیوں کے گھر، فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچے کے دروازے سے قلعے کی خندق تک سوائے لال ڈگی اور دو چار کنووں کے آثارِ عمارات باقی نہ رہیں گے ـــ آج جان نثار خاں کے چھتّے کے مکان ڈھینے شروع ہو گئے ہیں۔ کیوں میں دِلّی

کی ویرانی سے خوش نہ ہوں؟ جب اہلِ شہر نہ رہے، شہر کو لے کے کیا چولھے میں ڈالوں؟"

(یوسف میرزا، ۲۶ رجولائی ۱۸۵۹ء)

"وہ شور و غل تھا کہ سڑکیں نکلیں گی اور گوروں کی چھاونی بنے گی، کچھ بھی نہ ہوا۔ مر پٹ کر ایک جاں نثار خاں کے چھتے کی سڑک نکلی۔"

(یوسف میرزا، ۱۸راگست ۱۸۵۹ء)

"تم آتے ہو، چلے آؤ۔ نثار خاں کے چھتے کی سڑک، خان چندن کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھینا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز میدان نکلنا سُن جاؤ، غالبِ افسردہ دل کو دیکھ جاؤ، چلے جاؤ۔"

(مجروح، ۲ر دسمبر ۱۸۵۹ء)

"فیل خانہ، فلک پیرا، لال ڈگی کے محاذی کے مکانات، سب گرائے گئے۔ بلاقی بیگم کا کوچہ التوا میں ہے۔ اہلِ فوج ڈھانا چاہتے ہیں، اہلِ قلم (سول حکام) بچاتے ہیں۔ پایانِ کار دیکھیے کیا ہو۔"

(حسین میرزا، ۱۶ر دسمبر ۱۸۵۹ء)

"کشمیری کٹرا بگڑ گیا ہے۔ ہائے! وہ کیا اونچے اونچے دَر اور وہ بڑی بڑی کوٹھریاں دو رویہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں؟"

(مجروح، نہم جنوری ۱۸۶۰ء)

"لکھنؤ کی ویرانی پر دل جلتا ہے، مگر تم کو یاد رہے کہ وہاں بعد اس فساد

کے ایک کون ہوگا (بگاڑ کے بعد بناؤ کی صورت نکلے گی) یعنی راہیں وسیع ہو جائیں گی، بازار اچھے نکل آئیں گے۔ جو دیکھے گا، وہ داد دے گا اور دلّی کے فساد کے بعد کون نہیں ہے۔ یہاں فساد در فساد چلا جائے گا شہر کی صورت، سوائے اُس بازار کے جو قلعے کے لاہوری دروازے سے شہر کے لاہوری دروازے تک ہے سراسر بگڑ گئی ہے اور بگڑتی جاتی ہے۔"

(میاں داد خاں سیّاح، ۱۱ر جون ۱۸۶۰ء)

"قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنویں یک قلم کھاری ہو گیے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ جامع مسجد ہوتا ہوا، راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک، بے مبالغہ ایک صحرا لق ودق۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا، وہ اب باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اُٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹڑا، دھوبی واڑا، رام جی گنج۔ سعادت خاں کا کٹڑا، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتا نہیں چلتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا، اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہرِ نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔" (مجروح، ۱۸۶۱ء)

"(ان دنوں) شہر چپ چاپ، نہ کہیں پھاوڑا بجتا ہے، نہ سرنگ لگا کر کوئی مکان اُڑایا جاتا ہے نہ آہنی سڑک آتی ہے، نہ کہیں دمدمہ بنتا ہے۔ دلّی شہر، شہرِ خموشاں ہے۔"

(مجروح، ۲۲ ستمبر ۱۸۶۱ء)

"غلّے کی گرانی، آفتِ آسمانی۔"

(انور الدولہ شفق، ۲۴ اگست ۱۸۶۰ء)

"غلّہ گراں ہے، موت ارزاں ہے۔ میوے کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر، باجرہ سولہ سیر، گیہوں تیرہ سیر، چنے سولہ سیر، گھی ڈیڑھ سیر، ترکاری مہنگی۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، ستمبر ۱۸۶۰ء)

"گرانی اور ارزانی اُمورِ عامّہ میں سے ہے۔ دنیا کے کام خوش دناخوش چلے جاتے ہیں۔ قافلے کے قافلے آمادۂ رحیل ہیں۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، نومبر ۱۸۶۰ء)

"یہاں کا حال یہ ہے کہ مسلمان امیروں میں تین آدمی: نواب حسن علی خاں نواب حامد علی خاں، حکیم احسن اللہ خاں، سو اُن کا حال یہ ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں۔ سوائے ساہوکاروں کے یہاں کوئی امیر نہیں ہے۔ وہ لوگ اس (اخبار کی خریداری) کی طرف کیوں توجہ کریں گے؟ تم اِدھر کا خیال دل سے دھو ڈالو۔" (شیو نرائن آرام، ۱۲ جون ۱۸۵۹ء)

"یہاں آدمی کہاں ہے کہ اخبار کا خریدار ہو؟ مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں، وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں۔ بہت سخی ہوں گے تو جنس پوری تول دیں گے۔ کاغذ (بطورِ اخبار) روپے مہینے کا کیوں مول لیں گے۔"

(شیونرائن آرام، ۱۸۵۸ء)

"مہر کے واسطے صاحب، زمرد کا نگینہ اور پھر چنے کی دال کے برابر اور ہشت پہلو، اس اُجڑے شہر میں کہاں ملے گا۔؟"

(شیونرائن آرام، ۱۸ر دسمبر ۱۸۵۹ء)

"بادشاہ (ظفر) کی تصویر کی یہ صورت ہے کہ اُجڑا ہوا شہر، نہ آدمی، نہ آدم زاد، مگر ہاں دو ایک مصوروں کو آبادی کا حکم ہوگیا ہے، وہ رہتے ہیں، سو وہ بھی بعد اپنے گھروں کے لٹنے کے آباد ہوئے ہیں، تصویریں بھی اُن کے گھروں سے لٹ گئیں۔ جو کچھ رہیں، وہ صاحبانِ انگریز نے بڑی خواہش سے خرید لیں۔ ایک مصور کے پاس ایک تصویر ہے، وہ تیس رُوپے سے کم کو نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ تین تین اشرفیوں کو میں نے صاحب لوگوں کے ہاتھ بیچی ہیں، تم کو دو اشرفی کو دوں گا۔ ہاتھی دانت کی تختی پر وہ تصویر ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کی نقل کاغذ پر اُتار دے، اس کے بھی بیس رُوپے مانگتا ہے۔۔۔۔ میں نے دو ایک آدمیوں سے کہہ رکھا ہے، اگر کہیں سے ہاتھ آجائے گی تو لے کر تم کو بھیج دوں گا۔ مصوروں سے خرید کرنے کا نہ مجھے مقدور، نہ تمھارا نقصان منظور۔"

(شیونرائن آرام، ۲۳ر اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"دلّی کے تمام مال ومتاع و زروگوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔"

(میر مہدی مجروح ، ۷ مارچ ۱۸۵۹ء)

"دہلی کی اجنٹی کا دفتر فرد فرد لُٹ گیا۔ کوئی کاغذ باقی نہیں رہا۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، فروری، مارچ ۱۸۵۹ء)

"دلّی علاقہ لفٹنٹ گورنر سے انقطاع پا گئی اور احاطۂ پنجاب کے تحت حکومت آگئی۔"

(انورالدولہ شفق، نہم مارچ ۱۸۵۹ء)

"اب یہ شہر پنجاب احاطہ میں مل گیا۔ پنجاب کا نواب لفٹنٹ گورنر بہادر یہاں کا صدر ٹھہرا۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، فروری، مارچ ۱۸۵۹ء)

"زنہار کبھی یہ گمان نہ کیجیے گا کہ دلّی کی عمل داری میرٹھ اور آگرہ اور بلادِ شرقیہ کی مثل ہے۔ یہ پنجاب احاطے میں شامل ہے۔ نہ قانون، نہ آئین۔ جس حاکم کی جو رائے میں آوے، وہ ویسا ہی کرے۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، موسم گرما ۱۸۵۸ء)

"قواعد عمل داری کے برہم ہو گئے، نئے نئے دستور ہیں۔"

(مجروح، ۱۸۶۲ء)

"نہ وہ حکام ہیں، جن کو میں جانتا تھا۔ نہ وہ عملہ ہے جس سے میری

ملاقات تھی۔ نہ وہ عدالت کے قواعد ہیں جن کو پچاس برس میں نے دیکھا ہے۔ ایک کونے میں بیٹھا ہوا نیرنگ روزگار کا تماشا دیکھتا ہوں "یا حافظ" "یا حفیظ" وردِ زبان ہے۔"

(کاشف، ۱۳ رمئی ۱۸۶۳ء)

"ہر شخص کی سرنوشت کے مطابق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے، نہ قاعدہ ہے۔ نہ نظیر کام آئے، نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضیٰ خاں بن مرتضیٰ خاں کی پوری دو سو روپے کی پنشن کی منظوری کی رپورٹ آگئی اور ان کی دو بہنیں سو سو روپے مہینہ پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چوں کہ تمھارے بھائی مجرم تھے، تمھارا پنشن ضبط! بہ طریق ترحم دس دس روپے مہینہ تم کو ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کیا قہر ہو گا؟ میں خود موجود ہوں اور حکام صدر کا روشناس، پشم نہیں اکھیڑ سکتا۔ ترپن برس کا پنسن، تقرر اس کا بہ تجویز لارڈ لیک اور بہ منظوری گورنمنٹ، اور پھر نہ ملا ہے، نہ ملے گا، خیر احتمال ہے ملنے کا۔"

(یوسف میرزا، ۱۵ رجولائی ۱۸۵۹ء)

"ایک لطیفہ پرسوں کا سنو: حافظ ممّو بے گناہ ثابت ہو چکے، رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں، املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا، صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہوئے، مثل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا:

"حافظ محمد بخش کون؟"

عرض کیا کہ "میں"

پھر پوچھا کہ "حافظ ممّو کون؟"

عرض کیا کہ: "یوں، اصل نام میرا محمد بخش ہے، ممّو ممّو مشہور ہوں۔"
فرمایا کہ: "یہ کچھ بات نہیں، حافظ محمد بخش بھی تم۔ حافظ ممّو بھی تم، جو دُنیا میں ہے۔ وہ بھی تم، ہم مکان کس کو دیں؟"
مِثل، داخلِ دفتر ہوئی، میاں ممّو اپنے گھر چلے آئے۔"

(یوسف میرزا، جون ۱۸۵۹ء)

"جو تدبیر وثیقے[1] کے بارے میں تم نے کی ہے، وہ بہت مناسب ہے بشرط پیش ہونے کے اور ولایت پہنچنے کے، سجّاد میرزا اور اکبر میرزا اپنی پیرانہ سری میں اس پر قابض ہو رہیں گے[2]۔ انشاء اللہ العظیم۔"

---

[1] "وثیقے کی کیفیت یہ ہے کہ شاہان و بیگماتِ اودھ کا ایک دستور یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو جو ہندوستان کے مختلف حصّوں پر مسلط ہو چکی تھی، بڑی بڑی رقمیں بہ طور قرض دے دیتے اور ان کے سود کی رقم اپنے عزیزوں، متوسّلوں یا ملازموں کے نام لکھ دیتے تھے۔ کمپنی کی حکومت کے خزانے سے سود کی رقمیں متعزہ لوگوں کو ملتی رہتیں۔ حسین میرزا اور ان کے بھائی مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں کے لیے بھی وثیقے مقرر تھے، جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ضبط ہو گئے۔ مظفر الدولہ بیچارے تو الور سے پکڑے آئے اور اُس گروہ کے ساتھ شہید کر دیے گئے، جنھیں مقدمہ چلائے اور تحقیق کیے بغیر گوڑگانوا میں شہید کر دیا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسین میرزا وثیقے کی بحالی کے لیے مقدمہ ولایت تک لے جانا چاہتے تھے۔ یقیناً انھیں اس کا پورا حق حاصل تھا، کیوں کہ وثیقہ، قرض دی ہوئی رقم کا سود تھا، یا رقم واپس ملتی یا سود ادا ہوتا رہتا۔ یہ انگریزوں کا عطیہ نہ تھا کہ اسے ضبط کر لینا جائز ہوتا۔" (مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب جلد دوم، ۱۹۶۹ء ص ۴۰۹)

[2] "میرزا غالب نے لکھا ہے کہ بے شک، مقدمہ دائر کر دو، لیکن نتیجہ شاید اس وقت برآمد ہو، جب آپ کے فرزند (سجاد میرزا اور اکبر میرزا) بوڑھے ہو جائیں گے۔"

(مولانا غلام رسول مہر، ایضاً)

"جس حکم کی نقل کے واسطے تم لکھتے ہو، وہ اصل کہاں ہے جس کی نقل لوں؟ ہاں زبان زدِ خلق ہے کہ قدیم نوکروں سے باز پرس نہیں، مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔"

(یوسف میرزا، جون ۱۸۵۹ء)

"ہمشیر کی درخواست کیوں کر گزرے؟ جب وہ خود آئیں اور درخواست دیں اور منظور ہو اور مکان ملے تو اس تمام شہرستانِ ویران میں سے ایک حویلی ملے گی اور ان کو یہاں رہنا ہوگا۔ کیوں کر اس ویرانے میں تنہا رہیں گی؟ سہم کر دم نکل جائے گا۔ مانا کہ جبر اختیار کر کر رہیں، کھائیں گی کہاں سے؟ بہرحال...... نقل حکم لینی اور پھر مرافعہ کرنا اور پھر اس حکم کی نقل لینی، یہ امور ایسے نہیں کہ جلد فیصل ہو جائیں، حکام بے پروا، مختار عدیم الفرصت۔"

(حسین میرزا، ۹ر نومبر ۱۸۵۹ء)

"بھائی فضلو... آئے ہوئے ہیں۔ دوڑتے ہیں، عرضیاں دیتے پھرتے ہیں، کوئی سنتا نہیں۔"

(یوسف میرزا، ۱۸ر اگست ۱۸۵۹ء)

"تم اب تک سمجھے نہیں ہو کہ حکام کیا سمجھتے ہیں اور نہ کبھی سمجھو گے... کیسی نقل حکم، کیسا مرافعہ، جو احکام کہ دلّی میں صادر ہوئے ہیں، وہ احکام قضا و قدر ہیں، ان کا مرافعہ کہیں نہیں۔"

(حسین میرزا، ۲۱ر دسمبر ۱۸۵۹ء)

"ایک محکمہ لاہور میں معاوضۂ نقصان رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے اور یہ حکم ہے کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے، البتہ اس کا معاوضہ بہ حساب دہ ایک سرکار سے ہوگا، یعنی ہزار روپے مانگنے والے کو سو روپے ملیں گے اور جو گوروں کے وقت کی غارت گری ہے، وہ ہدر اور بحل (مباح اور معاف) ہے، اس کا معاوضہ نہ ہوگا۔"

(حسین میرزا، ۲۱ر دسمبر ۱۸۵۹ء)

"بھائی یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ سمجھ میں کسی کے نہیں آتا کہ کیا طور ہے۔ اوائل ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہوتی تھی۔ آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہوجاتی تھی۔ اس مہینے میں برابر وہی صورت رہی، آج ۲۷ر مارچ کی ہے۔ پانچ چار دن مہینے کے باقی ہیں آنچ ویسی ہی تیز ہے۔ خدا اپنے بندوں پر رحم کرے۔"

(مجروح، ۲۷ر مارچ ۱۸۵۹ء)

"یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے، اُس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔"

(مجروح، ۲ر فروری ۱۸۵۹ء)

"آج کل یہاں پنجاب احاطے کے بہت حاکم فراہم ہیں۔ پون ٹوٹی (ٹاؤن ڈیوٹی یعنی محصول چونگی) کے باب میں کونسل ہوئی، پرسوں، نومبر کو جاری

ہو گئی ..... غلے اور اُپلے کے سوا، کوئی جنس ایسی نہیں کہ جس پر محصول نہ ہو۔"
(حسین میرزا، ۵ نومبر ۱۸۵۹ء)

"پون ٹوٹی - کوئی چیز ہے، وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں، جس پر محصول نہ لگا ہو۔"
(مجروح، ۸ نومبر ۱۸۵۹ء)

"سنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجہ (الور) کو اختیار ملے گا، مگر وہ اختیار ایسا ہوگا جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا، آدمی کو بدنام کیا ہے۔"
(مجروح، ۲۶ ستمبر ۱۸۶۲ء)

"حضرت یہاں دو (ایک) چیزیں مشہور ہیں۔ اُن کے باب میں آپ سے تصدیق چاہتا ہوں ... لوگ کہتے ہیں، آگرہ میں اشتہار جاری ہو گیا ہے اور ڈھنڈورا پٹ گیا ہے کہ کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا اور بادشاہی عمل ہندوستان میں ہو گیا۔ سچ ہونا (اس) کا آپ کے خط لکھنے پر منحصر ہے۔"
(مہر، ۲۱ ستمبر ۱۸۵۸ء)

"حکم ہوا ہے کہ دوشنبے کے دن پہلی تاریخ نومبر کو رات کے وقت سب خیرخواہانِ انگریز اپنے اپنے گھر میں روشنی کریں اور بازاروں میں اور صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی کوٹھی پر بھی روشنی ہو گی۔ فقیر بھی اس تہی دستی میں کہ اٹھارہ مہینے سے پنسن مقرری نہیں پاتا اپنے مکان پر روشنی کرے گا اور قطعہ پندرہ بیت کا لکھ کر صاحب

کمشنر شہر کو بھیجا ہے۔"

(آرام، ۱۰ / اخر اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"یہاں پہلی نومبر کو (دوشنبہ) کے دن حسب الحکم حکّام کوچہ و بازار میں روشنی ہوئی اور شب کو کمپنی کا ٹھیکا ٹوٹ جانا اور قلمرو ہند کا بادشاہی عمل میں آنا سنایا گیا۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر کو ملکہ معظمہ انگلستان نے فرزندِ ارجمند کا خطاب دیا اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم کیا۔ میں قصیدہ اس تہنیت میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں:

تانہال دوستی کے بردہد　　حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

(انورالدولہ شفق، پنجم نومبر ۱۸۵۸ء)

"حکم عفوِ تقصیر عام ہو گیا ہے۔ لڑنے والے آتے جاتے ہیں اور آلاتِ حرب و پیکار دے کر توقیعِ آزادی پاتے ہیں۔"

(تفتہ، ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء)

"صاحب، تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملاتِ مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے... ناگاہ، نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط، بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی... میں جس شہر میں ہوں، اس کا نام بھی دلّی اور اس محلے کا نام بھی بلّی ماروں کا محلہ ہے لیکن ایک

دوست اُس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔"

(تفتہ، ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء)

"اس چرخِ کج رفتار کا بُرا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ ملک و مال اور جاہ وجلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر ہنس بول لیتے تھے:

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا، اے فلک!

اور تو یاں کچھ نہ تھا، ایک مگر دیکھنا

(مجروح، اپریل ۱۸۵۹ء)

"درخت جگہ سے اُکھڑ کر بہ دشواری جمتا ہے۔ خلاصہ میری فکر کا یہ ہے کہ اب بچھڑے ہوئے یار کہیں قیامت ہی کو جمع ہوں تو ہوں، سو وہاں کیا خاک جمع ہوں گے؟ سُنّی الگ، شیعہ الگ، نیک جُدا، بد جُدا۔"

(مجروح، ۷ ستمبر ۱۸۵۸ء)

"وہی بالاخانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر کہ وہ میر مہدی آئے، وہ یوسف میرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا، بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گئے ہیں۔ اللہ اللہ! ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں، میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا؟ ..... کیا مجمع برہم ہوا ہے! مجھ کو کیسا غم ہوا ہے۔"

(میر سرفراز حسین، ۱۸۵۸ء)

"تمھارا شہر میں ہونا موجبِ تقویتِ دل تھا۔ گو، نہ ملتے تھے، پر ایک

شہر میں تو رہتے تھے۔ بھائی! ایک سیر دیکھ رہا ہوں۔ کئی آدمی طیورِ آشیاں گم کردہ کی طرح، ہر طرف اُڑتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے دو چار بھولے بھٹکے کبھی یہاں بھی آجاتے ہیں۔"

(نواب امین الدین احمد خاں، ۲۲ر جون ۱۸۶۴ء)

"آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے، بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے؟ غمِ مرگ، غمِ فراق غمِ رزق، غمِ عزت ... غمِ فراقِ حسین مرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب، خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے، وہاں خوش ہوتے! گھران کے بے چراغ، وہ خود آوارہ، سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔"

(یوسف میرزا، ۲۸ر نومبر ۱۸۵۹ء)

"میرن صاحب کو، جب تک تم کہو، میں دلّی نہ بلاؤں، گویا اُن کے عاشق تمھیں ہو، میں نہیں۔ بھائی ہوش میں آؤ، غور کرو یہ مقدور مجھ میں نہیں کہ اُن کو یہاں بُلا کر ایک الگ مکان رہنے کو دوں اور اگر زیادہ نہیں تو تیس رُوپے مہینہ مقرر کروں کہ بھائی یہ لو اور دریبہ اور چاوڑی اور اجمیری دروازے کا بازار اور بلاقی بیگم کا کوچہ اور خان دوراں خان کی حویلی کے کھنڈر گنتے پھرو۔ اے میر مہدی! تو در ماندہ و عاجز پانی پت میں پڑا رہے۔ میرن صاحب وہاں پڑے ہوئے دلّی دیکھنے کو ترسا کریں۔ سرفراز حسین نوکری ڈھونڈتا پھرے اور میں ان غم ہائے جاں گداز کی تاب لاؤں؟ مقدور ہوتا

تو دکھا دیتا کہ میں نے کیا کیا:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

(مجروح، ۸ دسمبر ۱۸۶۰ء)

"غم مرگ میں قلعۂ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہل شہر کو گنتا ہوں: مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، میرزا عاشور بیگ، میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد میرزا، اُنیس برس کا بچہ، مصطفےٰ خاں ابن اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں، مرتضیٰ خاں، قاضی فیض اللہ، کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا؟ اے لو، بھول گیا حکیم رضی الدین احمد خاں، میر احمد حسین میکش، اللہ، اللہ، ان کو کہاں سے لاؤں؟ - کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے، مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔"

(یوسف میرزا، ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء)

"احمد حسین میکش کا حال کچھ تم کو معلوم ہے یا نہیں؟ مخنوق ہوا، پھانسی پائی، گویا اس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں۔"

(غلام نجف خاں، اپریل ۱۸۵۸ء)

"طالع یار خاں کے دو بیٹے رُخصت لے کر آئے تھے، غدر کے سبب نہ جا سکے، یہیں رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں، زندہ ہیں، پر یقین ہے کہ مُردے سے بدتر ہوں گے۔"

(انور الدولہ شفق، ۱۸۶۰ء)

"ہے ہے، کیوں کر لکھوں؛ حکیم رضی الدین خاں کو قتلِ عام میں ایک خاکی نے گولی ماردی اور احمد حسین خاں ان کے چھوٹے بھائی، اُسی دن مارے گئے ..... میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی۔"

(انورالدولہ شفق، ۱۸۶۰ء)

"اُمرائے اسلام میں سے اُموات گنو: حسن علی خاں، بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو رُوپے روز کا پنسن دار، سو روپے مہینے کا روزینہ خوار بن کر نامرادانہ مرگیا۔ میر نصیرالدین، باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ، مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بخشی محمد علی کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے، بیمار پڑا، نہ دوا، نہ غذا، انجام کار مرگیا، تمہارے چچا کی طرف سے تجہیز و تکفین ہوئی، احبا کو پوچھو، ناظر حسین مرزا کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا۔"

(علائی، ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء)

"ہائے میجر جان جاکوب[1] کیا جوان مارا گیا ہے۔ سچ اس کا شیوہ یہ تھا

---

[1] "میجر جان کوب، اکبرآباد (آگرہ) سے دہلی میں وارد ہوئے۔ مرزا اسداللہ خاں غالب نے رفاقتِ قدیم کے سبب سے مہمان داری اور استقبال کی رسومات کو شان و شوکت کے ساتھ انجام دیا اور نواب صاحب ضیاءالدین خاں کے مکان میں جو پہلے ہی سے مہمان داری کا انتظام کیا گیا تھا، ٹھہرایا۔ دو دن کے بعد میجر صاحب نے ٹامس مٹکاف بہادر اور دیگر اشخاص سے ملاقات فرمائی۔ دہلی میں آپ کی خاطر و مدارات بہت دھوم دھام سے ہوئی۔"

سراج الاخبار، دہلی: احسن الاخبار، دہلی ۱۴۔ ماہ دسمبر ۱۸۴۴ء۔

(بحوالہ حسن نظامی، بہادر شاہ کا روزنامچہ، طبع پنجم اکتوبر ۱۹۲۲ء ص ۲)

کہ اُردو کی فکر کو مانع آتا اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلاتا۔

بندہ پرور! یہ بھی اُنھیں میں ہے کہ جن کا میں ماتمی ہوں۔ ہزار ہا دوست مر گئے۔ کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں؟ جیوں تو کوئی غم خوار نہیں، مروں تو کوئی عزادار نہیں۔"

(مہر، اوائل ۱۸۵۸ء)

"انگریزی قوم میں سے جو اِن روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا اُمیدگاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے! جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو، اُس کو زیست کیوں نہ دُشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا، تو کوئی میرا رونے والا بھی نہ ہوگا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔"

(تفتہ، ۱۸۵۸ء)

"اس فتنہ و آشوب میں تو کوئی میرا جاننے والا نہ بچا ہوگا۔ اِس راہ سے مجھ کو جو دوست اب باقی ہیں، بہت عزیز ہیں۔ واللہ! دُعا مانگتا ہوں کہ اب ان احباب میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی کہ جو میں مروں تو کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ پر رونے والا بھی تو دُنیا میں ہو۔"

(غلام نجف خاں، اپریل ۱۸۵۸ء)

"مولانا (فضل حق خیرآبادی[1]) کا حال ..... کچھ تم مجھ سے معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا، بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا، اُن کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے، کیا ہوتا ہے! جو ہونا تھا، سو ہو لیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔"

(یوسف میرزا، جون ۱۸۵۹ء)

"ہاں خاں صاحب! اب جو کلکتے پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کرکے مجھ کو لکھو کہ اُس نے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جزیرے (انڈیمان) میں اس کا کیا حال ہے؟ گزارا کس طرح ہوتا ہے۔؟"

(میاں دادخاں سیاح، ۴ اکتوبر ۱۸۶۲ء)

"مولوی صدرالدین صاحب (آزردہ) بہت دن حوالات میں رہے کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبانِ کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف، جائیداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے ازراہِ ترحم نصف جائیداد واگزاشت کی، اب نصف جائیداد پر

---

[1] مولانا فضل حق خیرآبادی جن پر غلطی سے ایک ہم نام کے دھوکے میں مقدمہ قائم ہوا، اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی۔ اس فیصلے کے خلاف اپیل کی گئی مگر حکم سزا بحال رہا اور تاکید کی گئی کہ مولانا کو جلد انڈیمان بھیج دیا جائے۔"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد دوم، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۶۱۲)

قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں، کرایے پر معاش کا مدار ہے۔"

(احمد حسن مودودی، ۱۹؍ جنوری ۱۸۶۲ء)

"مصطفیٰ خاں (شیفتہ: جنھیں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شرکت کے بے بنیاد الزام پر سات سال قید کی سزا دی گئی) کا حال سُنا ہو گا خدا کرے مرافعے میں چھوٹ جائے۔ ورنہ حبسِ ہفت سالہ کی تاب اس نازپروردہ میں کہاں؟"

(غلام نجف خاں، اپریل ۱۸۵۸ء)

"نواب مصطفیٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے، سو اُن کی تقصیر معاف ہوئی اور اُن کو رہائی ملی۔ صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہاں گیرآباد کی زمیں داری اور دلّی کی املاک اور پنشن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ بہ مجرّد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا، اُن کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا، پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔"

(مجروح، ۲۰؍ فروری ۱۸۵۹ء)

"مصطفیٰ خاں (شیفتہ) کی رہائی کا حکم ہوا، مگر پنشن ضبط۔"

(یوسف میرزا، ۱۹؍ مئی ۱۸۶۰ء)

"کل یوسف میرزا کا خط لکھنؤ سے آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ نصیر خاں عرف نواب جان، والد اُن کا دائم الحبس ہو گیا۔ حیران ہوں کہ یہ کیا

آفت آئی۔ یوسف میرزا تو جھوٹ کاہے کو لکھے گا، خدا کرے اُس نے جھوٹ سُنا ہو۔"

(مجروح، اپریل ۱۸۵۹ء)

"مُبارک ہو کہ حکیم صاحب[1] (احسن اللہ خاں) پر سے وہ سپاہی، جو اُن کے اُوپر متعین تھا، اُٹھ گیا اور ان کو حکم ہو گیا کہ اپنی وضع پر رہو، مگر شہر میں رہو۔ باہر جانے کا اگر قصد کرو تو پوچھ کر جاؤ اور ہر ہفتے میں ایک بار کچہری میں حاضر ہوا کرو۔۔۔۔ صفدر میرے پاس آیا تھا، یہ اُس کی زبانی ہے۔"

(غلام نجف خاں، یکم اپریل ۱۸۵۸ء)

"حکیم صاحب (احسن اللہ خاں) کے دیکھنے کو جی چاہتا ہے مگر ازراہِ احتیاط جا نہیں سکتا۔"

(غلام نجف خاں، یکم اپریل ۱۸۵۸ء)

"جناب حکیم صاحب (احسن اللہ خاں) ایک روز ازراہِ عنایت یہاں آئے۔ کیا کہوں کہ اُن کے دیکھنے سے دل کیا خوش ہوا ہے۔ خدا اُن کو زندہ رکھے۔"

(غلام نجف خاں، اپریل ۱۸۵۸ء)

---

[1] "حکمت مآب، کمالات اکتساب، جامع نفائس علوم، مبانی مفہوم، حاکم، محاکم حکم حکیم مسیحادم محمد احسن اللہ خاں المخاطب بہ خطاب احترام الدولہ، عمدۃ الحکماء، معتمد الملک حاذق الزماں حکیم محمد احسن اللہ خاں بہادر ثابت جنگ۔"

(سرسید احمد خاں، آثار الصنادید، طبع اوّل: مطبع سید الاخبار ۱۸۴۶-۴۷ء، باب چوتھا)

"حکیم احسن اللہ خاں ۱۸۵۷ء میں درپردہ انگریزوں سے ملے ہوئے تھے۔" دیکھیے:

(غالب اور ابوالکلام، دہلی، ۱۹۶۹ء ص ۱۶۸-۱۶۷)

"حکیم احسن اللہ خاں کے مکانات پر اُن کو قبضہ مل گیا۔ زنانے مکان میں ..... ایک انگریز اُترا ہوا ہے۔ پینتیس روپے مہینہ اُن کو کرایہ دیتا ہے ... احسن اللہ خاں اپنے مکان میں جا رہے۔ دیوان خانے کو محل سرا بنایا، خود جہاں اصطبل تھا، وہاں بیٹھتے ہیں۔"

(حسین میرزا، ۲۸ر جولائی ۱۸۵۹ء)

"حکیم جی (احسن اللہ خاں) کو اُن کی حویلیاں مل گئی ہیں ..... اتنا حکم اُن کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں۔"

(تفتہ، ۵ر نومبر ۱۸۵۹ء)

"حامد علی خاں[1] کی ایک لاکھ تیس ہزار کئی سو روپے کی ڈگری بادشاہ پر ہو گئی۔" (مجروح، ۲۲ر ستمبر ۱۸۶۱ء)

"نواب حامد علی خاں کے مکانات سب ضبط ہو گئے۔ وہ قاضی کے حوض میں کرایے کے مکانات میں مع ممتوعہ کے رہتے ہیں۔ باہر جانے کا

---

[1] حامد علی خاں، میرزا غالب کے عزیز دوست اور اعتماد الدولہ میر فضل علی نائب السلطنت اودھ کے بھانجے اور داماد تھے۔ بیگم حامد علی خاں کو باپ کے ترکے سے نو لاکھ روپے ملے تھے۔ نواب لکھنؤ کے اُمراء میں منسوب تھے۔ اعتماد الدولہ کے انتقال پر حامد علی خاں دلی آگئے۔ روپیہ شاہی خزانے میں جمع کرا دیا اس کا سود ساڑھے چار ہزار ماہوار ملتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی مصیبتوں سے کسی قدر نجات ملی تو شاہی خزانے میں جمع کرائے ہوئے روپے کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ڈگری اسی سلسلے میں ہوئی، غالبؔ باقی روپے وہ پہلے لے چکے ہوں گے۔"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد دوم، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۳۹۲)

حکم ان کو بھی نہیں ہے۔
(حسین میرزا، ۹ر نومبر ۱۸۵۹ء)

"مکانات کو حامد علی خاں کا کہہ کر کیوں لکھتے ہو؟ وہ مدت سے ضبط ہو کر سرکار کا مال ہو گیا۔ باغ کی صورت بدل گئی۔ محل سرا اور کوٹھی میں گورے رہتے تھے۔ اب پھاٹک اور سرتاسر دکانیں گرا دی گئیں۔ سنگ و خشت کو نیلام کر کے روپیہ داخل خزانہ ہوا۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ حامد علی خاں کے مکان کا ملبہ بکا ہے۔ سرکار نے اپنا مملوکہ و مقبوضہ ایک مکان ڈھا دیا۔ جب بادشاہِ اودھ کی املاک کا وہ حال ہو تو رعیت کی املاک کو کون پوچھتا ہے۔"
(حسین میرزا، ۳۱ر دسمبر ۱۸۵۹ء)

"ناظر حسین میرزا ... اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے، مگر دیکھیے کہ چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔"
(علائی، ۱۶ر فروری ۱۸۶۲ء)

"ہے ہے حسین میرزا اور یہ کہے کہ میں کہاں جاؤں اور مجھ کم بخت سے اس کا جواب سرانجام نہ ہو سکے!"
(یوسف میرزا، ۲۹ر نومبر ۱۸۵۹ء)

"حال صاحب زادہ میاں نظام الدین کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر سے بھاگ گئے تھے، وہاں وہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑودہ میں رہے۔ اورنگ آباد میں رہے، حیدر آباد میں رہے۔ سالِ گزشتہ یعنی جاڑوں

ے معین الدولہ، عمدۃ الامراء، صفدر الملک، ذو الفقار الدین حیدر نظامت خاں بہادر ذو الفقار جنگ۔

میں یہاں آئے ۔ سرکار سے اُن کی صفائی ہوگئی ۔ لیکن صرف جان بخشی ۔ روشن الدولہ کا مدرسہ جو عقب کو توالی چبوترہ ہے، وہ اور خواجہ قاسم کی حویلی، جس میں مغل علی خاں مرحوم رہتے تھے وہ ، اور خواجہ صاحب کی حویلی ، یہ املاک خاص حضرت کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں نظام الدین کی قرار پاکر ضبط ہوئی اور نیلام ہوکر روپیہ سرکار میں داخل ہوگیا ۔" (انوار الدولہ شفق ، ۱۸۶۰ء)

" بڈھے[1] صاحب ، ساری املاک بیچ کر ، نوش جان کر کے ، بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گیے ۔" (علائی ، ۱۶ر فروری ۱۸۶۲ء)

" ضیا[2] الدولہ کی پانسو روپے کرایے کی املاک واگزاشت ہوکر پھر قرق ہوگئی ۔ تباہ و خراب لاہور گیا ، وہاں پڑا ہوا ہے ، دیکھیے کیا ہوتا ہے ۔" (علائی ، ۱۶ر فروری ۱۸۶۲ء)

" تمھارے ماموں ... کی جاداد کی واگزاشت کا حکم تو ہوگیا ہے .. دیکھیے

---

[1] بڈھے صاحب کا نام غلام محی الدین تھا اور نواب تھے ۔ دہلی کے سرکردہ روسا میں شمار ہوتے تھے ایک ہزار روپے ماہوار پنشن تھی ۔ تین سو روپے ریاست بھرت پور سے ملتے تھے اور پانسو روپے ماہانہ کرایہ آتا تھا ۔"

(مولانا غلام رسول مہر ، خطوط غالب ، جلد دوم ، ۱۹۶۹ء صفحہ ۲۶۷)

[2] " رکن الدولہ کے فرزند ۔ یہ بھی بڑے رئیس تھے ۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد پانی پت چلے گئے تھے ، وہاں سے پکڑے آئے ۔"

(مولانا غلام رسول مہر ، ایضاً ص ۲۶۷)

انجام کار کیا ہوتا ہے ... ہوتا کیا؟ اگر جا دادیں مل بھی گئیں تو قرض دار
دام دام ہیں گے۔" (یوسف میرزا، ۱۹ رمئی ۱۸۶۰ء)

"رُوپے کا نقصان اگرچہ جانکاہ اور جاں گزا ہے، پر بہ موجب "تلف المال
خلف العمر" عمر فزا ہے۔ جو روپیہ ہاتھ سے گیا، اُس کو عمر میں قیمت جانیے
اور اثباتِ ذات اور بقائے عرض و ناموس کو غنیمت جانیے۔"
(انوار الدولہ شفق، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"ہاں، غلام فخر الدین خاں[۱] کی رہائی، زندگی دوبارہ ہے۔ خدا تم کو مبارک
کرے۔" (غلام نجف خاں، جولائی اگست ۱۸۵۸ء)

"یہ دوسرا حادثہ مجھ کو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا۔ قضا و قدر کے اُمور
میں دم مارنے کی گنجایش نہیں ہے۔ کہیں جاگیر پر جانے کی اجازت
جلد ہو جائے تاکہ سب یک جا باہم آرام سے رہو[۲]۔"
(ثاقب، مارچ ۱۸۵۸ء)

---

[۱] "میرزا غالب کے برادرِ نسبتی علی بخش خاں کے فرزند اور میرزا غالب کی بھتیجی عزیز النسا بیگم کے شوہر
وہ اس لیے معرضِ بازپرس میں آ گئے تھے کہ بادشاہ کی جاگیر کوٹ قاسم کے ناظم و مہتمم تھے۔"
(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اوّل، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۵۰۲)

[۲] "ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے خاتمے پر اہلِ دہلی شہر چھوڑ کر نکلے تو امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں نے لوہارو
کا قصد کیا، مہرولی پہنچے تو ان کا سامان لوٹا گیا۔ دہلی میں ان کے مکانوں کو لوٹ کر آگ لگا دی گئی تھی، وہ
دوجانہ پہنچے تو وہاں سے پکڑے گئے اور خاصی مدت انگریزوں کی حراست میں لال قلعے کے اندر گزاری۔
آخر بے گناہ ثابت ہوئے اور انھیں جولائی ۱۸۵۸ء کے بعد لوہارو جانے کی اجازت ملی۔" (مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب،
جلد اوّل، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۳۱۹)

" امین الدین خاں کو جاگیر ملنے کا حال ..... کیوں کر لکھوں ..... اُن کو جاگیر اگست میں ملی " (مجروح، ۱۸۵۸ء)

" سنا ہے لوہارو بھی ان دونوں صاحبوں (امین الدین احمد خاں، اور ضیاء الدین احمد خاں) کو مل گیا۔ یہ بھی ایک تہنیت ہے، خدا سب کا بھلا کرے " (غلام نجف خاں، جولائی اگست ۱۸۵۸ء)

" نواب گورنر جنرل بہادر، ۱۵ر دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھیے کہاں اُترتے ہیں اور کیوں کر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیردار تھے (دہلی کے آس پاس سے سات چھوٹی چھوٹی ریاستیں) کہ اُن کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی لوہارو، چار معدوم محض ہیں[1]۔ جو باقی رہے، اُس میں دوجانہ و لوہارو، تحتِ حکومت ہانسی حصار، پاٹودی حاضر۔ اگر حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں (دوجانہ و لوہارو) کو یہاں لے آئے تو تین رئیس، ورنہ ایک رئیس ..... دربارِ عام والے مہاجن لوگ، سب موجود۔ اہلِ اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں:-

میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں، بلی ماروں

---

[1] " (چار:) جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ اور فرخ نگر۔ جھجر کے نواب عبدالرحمان خاں، بلب گڑھ کے راجہ ناہر سنگھ اور فرخ نگر کے رئیس احمد علی خاں کو بے گناہ پھانسی دے دی گئی اور اُن کی ریاستیں ضبطی میں آئیں۔ بہادر گڑھ کے رئیس بہادر جنگ کی ریاست ضبط ہو گئی اور انھیں پنشن دے کر لاہور بھیج دیا گیا "

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اوّل، ۱۹۶۹ء صفحہ ۲۶۸)

میں سگِ دُنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود و مطرود، محروم و مغموم:

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو، پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

(مجروح، ۲ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"قصّہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں... (اس) باب میں جو حرفِ مختصر میں نے لکھا ہے، اس کو... سچ جانو۔"

(علائی، ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء)

"مجھ کو رشک ہے جزیرہ نشینوں[1] کے حال پر اور رئیس فرخ آباد[2] پر خصوصاً کہ جہاز سے اُتار کر سرزمینِ عرب میں چھوڑ دیا۔ اہا ہا ہا:

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو۔"

(علائی، ۱۹ جون ۱۸۶۲ء)

---

[1] "وہ لوگ جنھیں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شرکت کی بنا پر انڈمان بھیج دیا گیا تھا۔"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اوّل، ۱۹۶۹ء صفحہ ۲۷۲)

[2] "نواب تفضل حسین خاں، رئیس فرخ آباد۔ ان پر بھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شرکت کا الزام لگا تھا اور ریاست ضبط کر لی گئی تھی۔ نواب کو، اُن کی خواہش کے مطابق حجاز بھیج دیا گیا ان کی زندگی کے باقی دن مکّہ مکرّمہ میں بسر ہوئے۔"

(مولانا غلام رسول مہر، ایضاً، صفحہ ۲۷۲)

"یہاں کا حال یہ ہے کہ مسلمان امیروں میں تین آدمی : نواب حسن علی خاں[1]
نواب حامد علی خاں، حکیم احسن اللہ خاں، سو اُن کا حال یہ ہے کہ روٹی ہے
تو کپڑا نہیں، مع ہٰذا یہاں کی اقامت میں تذبذب۔ خدا جانے کہاں
جائیں، کہاں رہیں۔ حکیم احسن اللہ خاں نے (اخبار) "آفتاب عالم تاب"
کی خریداری کر لی ہے۔ اب وہ مکرر "حالاتِ دربارِ شاہی" کیوں لیں گے؟
سوائے ساہوکاروں کے یہاں کوئی امیر نہیں ہے۔ وہ لوگ اس طرف
کیوں توجہ کریں گے؟ تم ادھر کا خیال، دل سے دھو ڈالو۔"

(آرام، ۱۲ر جون ۱۸۵۹ء)

"معزول بادشاہ (ظفر) کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپے
مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں، کٹنیاں اور جو جوان ہیں،
کسبیاں۔" (علائی، ۱۶ر فروری ۱۸۶۲ء)

"(بہ حقیقت) جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگماتِ قلعہ کو پھرتے
چلتے دیکھتے۔ صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائینچے لیرلیر،
جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں۔" (تفتہ، ۹ر اپریل ۱۸۶۱ء)

---

[1] "نجابت علی خاں والیِ جھجر کے چھوٹے بیٹے۔ اپنے بڑے بھائی نواب فیض محمد خاں کے عہدِ حکومت
میں جرنیل کے عہدے پر مامور رہے ... (مسند نشینی کے موقع پر) اختلافات شروع ہو گئے۔ آخر کار
سرکار انگلشیہ نے تصفیہ کرایا۔ حسن علی خاں کے لیے تین ہزار روپے ماہوار پنشن مقرر ہوئی جو ریذیڈنسی
کی معرفت ملتی تھی اور وہ دہلی میں رہنے لگے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ان پر بھی بڑی آفتیں
نازل ہوئیں۔"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اوّل، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۳۹۲)

"تاج محل (بہادر شاہ کی ایک بیگم)، مرزا قیصر (شاہ عالم ثانی کے چھوٹے بھائی، میرزا سلیمان شکوہ کے فرزند) مرزا جواں بخت کے ساٹ مرزا ولایت علی بیگ جے پوری کی زوجہ، ان سب کی الٰہ آباد سے رہائی ہو گئی تھی۔"

(مجروح، ۲۲ دسمبر ۱۸۵۸ء)

"بادشاہ (ظفر) کی روانگی کا حال کیوں کر (لکھوں)... بادشاہ اکتوبر میں گئے۔" (مجروح، ۱۸۵۸ء)

"بادشاہ، میرزا جواں بخت، میرزا عباس شاہ (بہادر شاہ ظفر کے ایک فرزند جو جواں بخت سے چھوٹے تھے) زینت محل، کلکتہ پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہوگی۔ دیکھیے کیپ[۲] میں رہیں یا لندن جائیں۔[۱]"

(مجروح، ۲۲ دسمبر ۱۸۵۸ء)

---

[۱] "مطلب یہ کہ انھیں اجازت مل گئی۔ چاہیں ہندوستان میں رہیں، چاہیں بادشاہ کے ساتھ جائیں۔"

(مولانا غلام رسول مہر، ایضاً، صفحہ ۲۴۷)

[۲] "کیپ سے بظاہر مراد (کیپ آف گڈ ہوپ) یعنی "راس اُمید" ہے، جو برّ اعظم افریقہ کے انتہائی جنوبی گوشے میں واقع ہے۔ اس زمانے میں ولایت جانے والے جہاز عموماً راس اُمید کا چکر لگا کر اوقیانوس میں داخل ہوتے تھے، اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں افواہ گرم تھی، بادشاہ کو یا تو راس امید میں رکھیں گے یا ولایت لے جائیں گے لیکن اس مظلوم کو رنگون میں رکھا گیا۔"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اوّل، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲۴۷)

"میرزا الٰہی بخش[1] جو شہزادوں میں ہیں، اُن کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے، اور وہ انکار کر رہے ہیں۔ دیکھیے کیا ہو؟"
(تفتہ، ۵ رنومبر ۱۸۵۹ء)

"میرزا الٰہی بخش کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے۔ اُنھوں نے زمین پکڑی ہے سلطان جی میں رہتے ہیں، عذر کر رہے ہیں۔ دیکھیے یہ جبراً اُٹھ جائیں یا یہ خود اُٹھ جائیں۔" (حسین میرزا، ۹ رنومبر ۱۸۵۹ء)

"اودھ اخبار" میں بادشاہ کے مرنے کی خبر دیکھی، مگر پھر کہیں سے تصدیق نہیں ہوئی۔" (مجروح، ۲۰ رنومبر ۱۸۶۲ء)

"۷ رنومبر، ۱۴ رجمادی الاوّل سال حال (۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء) جمعہ کے دن ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ و قیدِ جسم سے آزاد ہو گئے۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔" (مجروح، ۱۶ ردسمبر ۱۸۶۲ء)

---

[1] "بہادر شاہ ثانی کے دوسرے ولی عہد، مرزا فخرو کی شادی، مرزا الٰہی بخش کی بیٹی سے ہوئی اور شہزادہ ابوبکر اسی کے بطن سے تھا جسے ہاڈسن نے بہادر شاہ کے دو بیٹوں کے ساتھ دلّی دروازے کے باہر خونی دروازے کے پاس گولی مار دی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں میرزا الٰہی بخش انگریزوں کا مخبر بنا رہا۔ اسی کے مشورے کے مطابق بہادر شاہ نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کیا تھا اور شاہی خاندان کے اکثر افراد انتہائی بے دردی سے مارے گئے تھے۔ بعد میں میرزا الٰہی بخش کو تیموری خاندان کا سرخیل مان لیا گیا اور پنشن ملتی رہی۔" (مولانا غلام رسول مہر: ایضاً، صفحہ ۹۶)

انقلابِ ستاون اور غالب کا شعری رویہ

انقلابِ ستاون کی غارت گری کے اس المیے کی طرف غالب شناسوں کی نظر بالعموم نہیں گئی کہ اس نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا۔

Scanned by CamScanner

"فتح دہلی کے بعد جو عالم گیر و عدیم النظیر مصیبت اشراف و اعیانِ شہر پر نازل ہوئی اور جس طرح شاہجہاں آباد کی اُن سڑکوں پر جہاں کبھی صاحب قرانِ اعظم کی سواری کے لیے جمنا کے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا مسلمانوں کے خون کے فوارے بہے، مرزا غالب نے دہلی میں رہ کر اس کے تمام مناظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھے اور ان چیخوں کو اپنے کانوں سے سُنا جو عرصے تک دارالخلافے کی گلیوں اور کوچوں سے بلند ہوتی رہی تھیں :

فلا تسئلن عما جری یوم حصرہم
وذالک مما لیس یدخل فی حصر[1]

علی الخصوص قلعۂ معلیٰ کی بربادیاں جن کے لیے اگر تمام حیواناتِ ارضی کی آنکھیں اشک بار ہو جاتیں اور جن کے غم میں آسمان سے پانی کی جگہ خون برستا، جب بھی اُن کے ماتم کا حق ادا نہ ہوتا۔ وہ اجسادِ محترمہ و رفیعہ جو تیمور و بابر کی یادگار اور اکبرِ اعظم و صاحب قرانِ ثانی کے خونِ عظمت و جبروت کے حامل تھے، جنھوں نے چھ صدیوں سے متصل شہنشاہی و فرماں روائی کی گود میں پرورش پائی تھی، جنھیں حکومت و اجلال کے سوا کسی مصیبت کا کبھی تصور بھی نہیں ہوا تھا، اور جو ہمیشہ ان کروڑوں انسانوں کو جن کی آبادیاں کابل کے کوہستان سے لے کر آسام کے جنگلوں تک پھیلی ہوئی تھیں، اپنے سامنے سربسجود پاتے تھے، کون تھا جو سنگ و آہن کا دل و جگر پیدا کر کے بھی یہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح گلیوں میں مارے جائیں اور ان کی لاشیں اُس عظمتِ رفتہ کا ماتم سنائیں، جو چند روز پیشتر دُنیا میں صرف ان ہی کے لیے تھی .....

لیکن یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کے لیے مرزا غالب دہلی میں زندہ تھے، اور دیکھتے رہے۔ یہ وہ حوادث ہیں جن پر غیروں کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آتے ہیں، ممکن نہ تھا،

---

[1] ترجمہ: "ان کی محصوری کے دن جو کچھ پیش آیا، اس کے بارے میں نہ پوچھو۔ یہ وہ اُمور ہیں جو شمار میں نہیں آسکتے ہیں۔"

کہ مرزا غالب جیسے غم دوست شاعر" نے "یہ سب کچھ دیکھا ہوا اور اس کے دل و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو گئے ہوں"[1]
(مولانا ابوالکلام آزاد)

۱۸۵۷ء کا واقعہ ہماری تہذیبی اور سیاسی زندگی کا بہت سخت واقعہ سہی لیکن ہمارے ادبی اور تہذیبی اُفق کا یہ المیہ بھی بجائے خود کچھ کم تلخ حقیقت نہیں کہ "مرزا غالب جیسے غم دوست شاعر نے "یہ سب کچھ دیکھا" لیکن یہ سب کچھ اُن کا شعری تجربہ نہیں بن پایا۔

○

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں :-

"مرزا غالب نے اپنی فارسی اور اُردو تصانیفِ نظم و نثر میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ خونیں، پر جو کچھ لکھا ہے، اگر اُسے الگ کتاب کی شکل میں مرتب کیا جائے تو یقین ہے کہ ایک ضخیم مجلّہ تیار ہو جائے"[2]...

فارسی نثر میں اس موضوع پر غالب کی ایک مستقل کتاب ہے "دستنبو" یہ سراسر انگریز حکّام کی تائید و تحسین میں ہے اور ذاتی تحفظ اور فروغِ مراتب کی غرض سے لکھی گئی ہے۔ اس لیے اس کے مندرجات پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں انگریزوں سے سوچی سمجھی وفاداری کا اظہار کیا گیا ہے اور غالب کا سارا زورِ بیان انگریزوں کی وکالت اور اپنی مدافعت میں صرف ہوا ہے۔ فارسی نظم میں غالب کا آخری مجموعہ "سبدِ چین" مطبع محمدی، دہلی سے ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ / اگست ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ، غالب کے ان فارسی اشعار پر مشتمل ہے جو "کلیاتِ غالب" میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے یا اس کی طباعت (۱۸۶۳ء) کے بعد موزوں ہوئے۔ چالیس صفحات کے اس مختصر سے مجموعے میں دو قصیدے، ایک ترجیع بند، چھے قطعات، تین رباعیاں اور مفرد اشعار

---

[1] الہلال، کلکتہ، ۱۷ جون ۱۹۱۴ء بہ حوالہ: غالب اور ابوالکلام، عتیق صدیقی، دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۵۹-۶۱

[2] ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۵۳ء صفحہ ۴۔

کا اسّی (۸۰) فی صد سے متجاوز حصہ انگریز حکّام کی شان میں ہے۔ حامد اللہ ندوی نے ٹھیک کہا ہے کہ:

"غالب کی ان قصیدہ خوانیوں کے مقصد کو پانا کچھ مشکل نہیں۔ غالب ایک بڑے شاعر تھے۔ دلی کے روسا میں شمار ہوتا تھا۔ وہ بہادر شاہ کے نمک خوار رہ چکے تھے۔ ایسی صورت میں انگریزوں کی نظر میں اُن کا مُشتبہ ہونا کچھ بعید نہ تھا...... غالب کے لیے ضروری تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی ایسی صورت اختیار کرتے جس سے انگریزوں کے دل سے اس شک و شبہ کو دور کرنے میں مدد ملتی اور اس کے لیے قصیدوں سے اچھا اور کون سا ذریعہ ہو سکتا تھا، چنانچہ انھوں نے یہ قصیدے لکھے اور ان کو خاص اہتمام سے شائع بھی کیا۔ اس طرح "سبد چین" کو غالب کی فارسی شاعری میں وہی درجہ حاصل ہے، جو اُن کی فارسی نثر میں "دستنبو" کو ہے......"[1]

یہ دونوں کتابیں تاریخی اہمیت کی حامل ضرور ہیں، لیکن حاتِ تلی سے خالی ہیں۔ میر مہدی مجروح کے نام ۲ فروری ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں غالب نے دلی کی سرگذشت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

یہ شعر، غالب کے انتقال سے کوئی ساڑھے تین ماہ پہلے "عودِ ہندی" میں شائع ہوا (عودِ ہندی، طبع اوّل: مطبع مجتبائی، میرٹھ، ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء صفحہ ۸۲) اس واقعاتی شعر کے علاوہ، جو دیوانِ غالب سے خارج ہے، اُردو نظم میں غالب کے ہاں واقعۂ ستاون سے متعلق محض ایک نو شعری قطعہ ملتا ہے۔ یہ ۱۸۵۸ء کے ایک خط بہ نام علائی میں محفوظ ہے:

---

[1] شاعر، بمبئی۔ فروری، مارچ ۱۹۶۹ء صفحہ ۲۲۱

بسکہ فعّالِ مایرید ہے آج	ہر سلحشور[۱] انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے	زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے	گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دلی کا ذرہ ذرہ خاک	تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک	آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا؟	وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ	سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم	ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب	کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

۱۸۵۷ء کے بعد غالب کا اُردو دیوان، ان کی زندگی میں متعدد بار شائع ہوا۔[۳] لیکن اس قطعے کو دیوان کی کسی اشاعت میں جگہ نہیں ملی۔ یہ قطعہ اُن کے انتقال کے معاً بعد مارچ ۱۸۶۹ء میں، "اُردوے معلّا" کے ذریعے پہلی بار سامنے آیا۔[۴] اس ایک استثنا کے علاوہ، غالب کے کلام میں ہمیں ۱۸۵۷ء کے دل دوز سانحے کا کوئی تاثر یا احساس نہیں ملتا...... اور یہ اتنی غیر معمولی بات تھی کہ خود غالب کی زندگی میں سوال بن کر زبان پر آگئی تھی۔ غالب نے اس کا اچھا جواز پیش کیا ہے:

"ارے بھئی! مرثیہ لکھیں تو ایک کا لکھیں، نوحہ کیجیے تو دو کا کیجیے۔ جب تمام شہر برباد ہو کر بگڑ جائے تو کیا خاک بن آئے[۵]....."

---

۱ مختار کل ۲ سپاہی

۳ تفصیل کے لیے دیکھیے: اشاریۂ غالب، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۷۹ - ۸۲

۴ اُردوے معلّا، طبع اوّل: اکمل المطابع، دہلی، مارچ ۱۸۶۹ء صفحہ ۱۰۴

۵ سیرِ دہلی، شیخ محمد ریاض الدین امجد، مطبع حیدری، آگرہ ۱۸۶۱ء، صفحہ ۴ - بہ حوالہ: احوالِ غالب، ڈاکٹر مختار الدین احمد علی گڑھ، ۱۹۵۳ء، صفحہ ۴

"وفورِ احساس" بھی اس کا باعث ہو سکتا ہے، اسے بے بضاعتی اور بے حسی یا لاتعلقی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے، سبب خواہ کچھ بھی ہو رہا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کا سانحہ، غالب کے ہاں شعری تجربہ نہیں بنا..... انقلاب کے زمانے میں اور اس کے بعد تا آخر، غالب کا رویہ جدّ و جہدِ آزادی سے کسی جذباتی لگاؤ کو ظاہر نہیں کرتا.... اس صورتِ حال میں طرف دارانِ غالب کی یہ "وکالت" کچھ حقیقت نہیں رکھتی کہ گو غالب نے:

> "۱۸۵۷ء کی تباہی پر کوئی مرثیہ نہیں لکھا، لیکن متفرق طور پر ان کے کلام میں..... اس داستانِ الم کی جو تفاصیل اور اشارات ملتے ہیں، وہ کسی پُر درد مرثیے سے کم نہیں اور یہ اشارات اتنے واضح اور تفاصیل اتنی کافی ہیں کہ ہم مرثیے کے عدم وجود کا شکوہ نہیں کرسکتے"[1]

۱۸۵۷ء کے بعد سے غالب کے آخر عمر تک کے کلام پر نظر ڈالیے تو اس میں ہمیں ستاون کی داستانِ الم کا کچھ انعکاس نہیں ملتا۔ نہ کوئی درد، نہ اس کی طرف اشارہ نہ اس کی کوئی تفصیل۔ "فتنہ و فساد" کا یہ اثر ضرور ہوا کہ ذوقِ شعر گویا جاتا رہا اور شعر گوئی ایک طرح سے ترک ہی کر دی، لیکن کچھ کہا تو اپنی مدافعت اور نئے نظام کی مدحت میں۔

○

> "دلّی کا وہ ادبی حلقہ جس کو مرزا غالب سے ذہنی اور فنی بیر تھا، ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں پیش پیش رہا..... مولوی محمد باقر، ایڈیٹر اُردو اخبار، دہلی..... جنھوں نے ۱۸۴۷ء میں مرزا کی گرفتاری پر بغلیں بجائی تھیں اور کوتوال کی حمایت کی تھی، مئی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو برطانوی اقتدار کا خاتمہ اور مغل شہنشاہی کی بحالی سمجھ رہے

---

[1] ابو سلمان شاہ جہان پوری، العلم، کراچی، جنوری، مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱۰۵

تھے ..... پھر یہ کہ باغی فوج میں تنظیم کی کمی، سرشوری کی زیادتی اور اُن انگریزوں کا قتلِ عام، جن میں سے کوئی غالب کا دوست کا تھا، کوئی اُمیدگاہ تھا، کوئی قدردان تھا، کوئی مربّی تھا ..... اور اس کے سوا یہ بھی کہ غالب کو نظر آرہا تھا کہ آخر یہ بغاوت یا جنگِ آزادی، خود اپنی کمزوریوں کی بنا پر ناکام ہونے والی ہے۔ چنانچہ انھوں نے درپردہ اپنے ایک دوست اور اُمیدگاہ والیِ رام پور کو جو خفیہ خط لکھے اور سیاسی مشورے دیے، ان سے بھی پتا چلتا ہے کہ غالب کو باغیوں سے ویسی ہمدردی نہ تھی جیسی، اُن کے طبقے کے دُوسرے سربرآوردہ لوگوں کو رہی۔ چناں چہ ہندوستانی تاریخ کے اس عظیم الشان واقعے پر جو آنسو ہم ان کی تحریروں سے چھنتے ہیں، اُن میں غم تو ہے آگ نہیں ہے، مرنے والوں سے چاہے وہ کالے ہوں یا گورے اور لٹنے والوں سے چاہے، وہ غریب ہو یا امیر، اُن کو گہری ہمدردی ہے۔ ماتم سب کا ہے، لیکن کسی فریق کی حمایت یا تائید بالاعلان نظر نہیں آتی ہے[1]...“

ڈاکٹر ظ۔ انصاری

غالب کے تعلقات: ”حکّامِ انگریز سے ابتدا سے خوشامدانہ تھے۔ اُن کا وظیفہ، ان ہی کے ہاتھ میں تھا، اس کم بخت وظیفے کو واگذار کرانے کے لیے انھیں بیسیوں قصیدے انگریزوں کی مدح میں اس جوش سے لکھنے پڑے گویا اکبر و جہاں گیر کی مدّاحی ہو رہی ہے، پھر وقت بھی ایسا پُرآشوب تھا کہ مارشل لا جاری تھا اور سولی کے تختے اور درختوں کی ٹہنیاں ہمیشہ لاشوں سے بھری رہتی تھیں۔ ان حالات

---

[1] شاعر، بمبئی، فروری، مارچ ۱۹۶۹ء — صفحہ ۵۹۸، ۵۹۷ —

کی وجہ سے وہ بڑی مجبوریوں میں پھنس گئے تھے[1]....''

''ہندوستانی زبان کے علاقے کی قومی بغاوت سے غالب کی یہ بیگانگی اور بغاوت کی ناکامی پر انگریز گورنروں اور افسروں کے سامنے اپنے رویّے کی صفائی دیتے پھرنا، بظاہر ایک ایسے شاعر کے لیے نازیبا معلوم ہوتا ہے جو دربارِ شاہی کا منصب دار ہو اور اشرافیہ میں اعلیٰ مقام رکھنے کا آرزومند ہو..... جس کے کلام میں جا بجا آزادی، اور آزادہ روی کے دعاوی پائے جاتے ہوں اور جس نے بغاوت شروع ہونے تک بہادر شاہ ظفر اور واجد علی شاہ کی تعریف میں پے در پے فارسی قصائد لکھے ہوں اور جاں نثاری کے دعوے کیے ہوں، لیکن اس بہ باطن بیگانگی اور بہ ظاہر آشنائی کے پیچھے، جہاں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اقتدار پسند طبقے کی وفاداریاں سو سال پہلے سے بٹ چکی تھیں، غالب کے ددھیالی اور سسرالی خاندانوں میں بھی یہی رسم چلی آرہی تھی.... وہاں اس حقیقت پر بھی نظر جاتی ہے کہ واقعہ چاہے کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو، وہ کسی وقت بھی ہوش و حواس سے بے بہرہ نہیں ہوئے[2]....''

یہ صحیح ہے کہ "ضرورت واحتیاج نے انھیں انگریز حکام اور گورنروں کی چوکھٹوں پر گرا دیا تھا، اور مدحیہ قصیدے نظم و نثر میں لکھوائے تھے،" تاہم "مرزا صاحب مشفق و مہربان" کے خطابات اور ساٹھ ستّر روپے کی (پنشن اور) خلعت، اُس زخم کاری کا مرہم نہیں ہو سکتا تھا، جو حوادثِ غدر سے اُن کے دل پر لگا ہوگا۔ ایک ضعیف الارادہ انسان وقت اور احتیاج سے مجبور ہو کر صدہا باتیں اوپری دل سے کر بیٹھتا ہے، مگر کچھ اس سے

---

[1] الہلال، کلکتہ، ۷ر جون ۱۹۱۳ء، بہ حوالہ: غالب اور ابوالکلام، عتیق صدیقی، دہلی، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۶۲، ۶۳۔

[2] ڈاکٹر ظ۔ انصاری، شاعر بمبئی، فروری، مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ ۵۹۸

دل کے اصلی محسوسات و جذبات بٹ نہیں سکتے۔ علی الخصوص ایسے حادثۂ کبریٰ اور مصیبتِ عظمیٰ کے موقعوں پر جس کو دیکھ کر بڑے بڑے غدّار و ملت فروش دلوں سے بھی آہیں نکل گئی ہوں گی ۔[۱]...."

لیکن ۱۸۵۷ء کے "حادثۂ کبریٰ" اور "مصیبتِ عظمیٰ" پر غالب کے دلی جذبات اور اصلی و حقیقی محسوسات شعری پیکر میں نہیں ڈھلے۔ ان کا اظہار تو کچھ ان کے خطوں میں ہوا ہے جو اس موضوع پر غالب نے زیادہ تر اس احساس کے بغیر لکھے کہ یہ کبھی چھپیں گے بھی! خطوں میں انقلابِ ستاون سے متعلق غالب کے حقیقی جذبات اور ان کا سوزِ دروں چھلکا پڑتا ہے ..... اشعارِ غالب اس سے یکسر خالی ہیں ..... اس امر پر اصرار کہ کلامِ غالب میں اس داستانِ الم کی تفاصیل محفوظ ہیں، کسی طرح درست نہیں۔ اہلِ علم نے کلامِ غالب سے اس نوع کے نتائج اس صورت میں نکالے ہیں، جب انھوں نے غالب کے اشعار کو صحیح تناظر میں نہیں دیکھا اور شاعر کے کلام کا مطالعہ تاریخی اور زمانی ترتیب سے نہیں کیا۔

○

انقلاب ۱۸۵۷ء اور اس کے اثراتِ مابعد کے بارے میں کلامِ غالب سے استشہاد کی روایت پٹنہ کے ڈاکٹر سید محمود[۲] نے ڈالی، انھوں نے ۱۹۱۹ء میں دیوانِ غالب، نظامی ایڈیشن پر ایک مفصل مقدمہ تحریر کیا اور دو برس بعد ۱۹۲۱ء میں اس پر نظرِ ثانی کر کے اسے زیادہ دلچسپ بنا دیا۔ ڈاکٹر سید محمود نے بارہ تیرہ صفحات (ص ۳۲-۴۵) محض اس بحث کے لیے وقف کیے ہیں کہ: "انقلابِ ستاون کا غالب کی طبیعت پر بہت گہرا اثر ہوا، وہ سیاسی خیالات سے بے بہرہ نہیں تھے، انھیں ملکی د

---

[۱] الہلال، کلکتہ، ۱۷ جون ۱۹۱۴ء، بہ حوالہ: غالب اور ابوالکلام، ایضاً، صفحہ ۴۲۔

[۲] ڈاکٹر گیان چند کو التباس ہوا ہے کہ یہ ڈاکٹر سید محمود "سر سید کے صاحب زادے" تھے۔ (صحیفہ، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص ۷۰)

قومی تباہی کا بھرپور احساس تھا۔" اپنے اس موقف کی تائید میں ڈاکٹر سید محمود نے غالب کے تیس سے زیادہ اُردو اشعار پیش کیے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اس نکتہ آفرینی کی کچھ حقیقت اور وقعت باقی نہیں رہتی، جب یہ معلوم ہے کہ غالب کے جن اشعار کو سند میں پیش کیا گیا ہے، وہ بیش تر ۱۸۵۷ء سے ۲۵ تا ۳۱ سال پہلے کے ہیں جب غالب کی عمر ۱۸ سے ۲۴ سال کی رہی ہوگی۔ ان اشعار میں سے کسی ایک کا بھی انقلاب ستاون سے کچھ تعلق نہیں۔ اگلے صفحات میں ڈاکٹر سید محمود کے مقدمے[1] کے متعلقہ اقتباسات و اشعار کو راقم الحروف کے حواشی کی روشنی میں ملاحظہ کیجیے۔

"اکثر صاحبان نے یہ اعتراض کیا ہے کہ غالب سیاسی خیالات سے بے بہرہ تھے اور ان کو ملکی و قومی تباہی کا بالکل احساس نہ تھا۔ میرے عزیز دوست سید راس مسعود صاحب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"غالب کی اکثر تحریرات میرے پاس موجود ہیں، جن میں انھوں نے انگریزوں کی اور انگریزی طرزِ حکومت کی بہت سی تعریفیں کی ہیں۔"

مجھے اس سے انکار نہیں۔ لیکن کسی غیر ملکی حکومت یا طرزِ حکومت کی تعریف و توصیف کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ شاعر ملکی و قومی جذبات سے بے بہرہ ہے۔ اس لیے میں نے اس تحریر میں جا بہ جا خود مرزا (کے اشعار اور) عبارتیں نقل کر دی ہیں تاکہ تاریخی حیثیت سے بھی پتا چل جائے کہ وہ ان حالات سے کس درجہ متاثر تھے ان کو اپنے ملک کی مٹی ہوئی عظمت کا کتنا گہرا احساس تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غالب نے کچھ تو اس زمانے کے حالات کے اعتبار کے باعث، اور کچھ خود اُردو شاعری کے خاص طرزِ بیان کی وجہ سے اگر ملکی و قومی جذبات کو الفاظ میں چھپایا ہے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تعجب کا کیا مقام ہے۔"

(مقدمہ ص ۴۴)

---

[1] مقدمہ: اُردو دیوانِ غالب مع شرح نظامی، نظامی پریس، بدایوں طبع ششم ۱۹۲۷ء، صفحہ ۹-۷۴۔

"اُس زمانے میں جو حالات تھے اُس کے اعتبار سے صاف صاف الفاظ میں ان خیالات کا اظہار کرنے سے وہ معذور تھے اور مجبوراً ایسے خیالات کا اظہار نہایت گہرے اور پوشیدہ معنوں ہی میں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں ملک کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں"۔ اور پھر کہتے ہیں:۔

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع[1]

اور پھر کہتے ہیں:

آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے! اگر معرضِ اظہار میں آوے[2]

ایک اور جگہ جتایا ہے:

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں، کہ میری بات سمجھنی محال ہے[3]

(مُقدمہ: ۴۲)

"ہندوستانیوں کی زندگی کا خاتمہ بہ حیثیت ایک قوم کے ۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامے سے پہلے ہو چکا تھا اور اُس وقت کے شعرا اور صاحبانِ سیاست دونوں نے اسے محسوس کیا۔

---

[1] بیاضِ غالب (نقوش، لاہور، شمارہ ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، نسخۂ عرشی زادہ، دہلی، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۴۰) میں یہ شعر موجود ہے۔ یہ بیاض خود غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اور ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء میں مرتب ہوئی۔ ظاہر ہے یہ شعر ۱۸۵۷ء کی ملکی تباہی سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔

[2] یہ شعر نسخۂ رام پور ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۳ء میں موجود ہے (نسخۂ عرشی، ص ۲۲۳) اسے بھی ۱۸۵۷ء کی تباہی سے کوئی نسبت نہیں۔

[3] یہ شعر نسخۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) میں شامل ہے۔ دیکھیے نسخۂ حمیدیہ، مرتبہ: پروفیسر حمید احمد خاں، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۲۲۔

اہلِ سیاست کے احساس کا نتیجہ ہنگامہ ہوا اور شعرا نے مختلف طریقوں سے اس پر نوحہ کیا۔ مرزا غالب کا احساس گہرا تھا اور انھوں نے نہایت پُر درد پیرایہ میں اس کا اظہار کیا ہے:

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل؟
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں[1]

پھر کہتے ہیں:

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے[2]

(مقدمہ: ص ۳۳، ۳۴)

"ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد دلّی اور نواحِ دلّی پر جو آفتیں ٹوٹیں، انھوں نے ہزارہا بندگانِ خدا کو بے خانماں اور تباہ کر دیا۔ شہزادے اور شہزادیاں جنگلوں میں مارے مارے

---

[1] ۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ م ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو غالب قلعۂ معلّیٰ سے متعلق ہوئے، شاہِ دہلی نے انھیں خطاب اور خلعت دیا اور سلاطینِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے کی خدمت، اُن کے سپرد ہوئی تو غالب نے طرزِ تازہ پر ایک غزل لکھی: دیکھیے: مکاتیبِ غالب عرشی طبعِ دوم، متن، ص ۵۲)۔ یہ شعر اسی غزل کے ہیں۔ ہنگامۂ ستّاون، اِن اشعار کے کہے جانے کے سات برس بعد وقوع میں آیا۔ اس لیے اِن اشعار کو ۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامے کا پُر درد نوحہ خیال کرنا ہنسی کی بات ہے۔

[2] یہ شعر بیاضِ غالب (۱۸۱۶ء) میں موجود ہے (نقوش، ص ۲۲۴-۲۲۵؛ نسخۂ عرشی زادہ ص ۸۹) یعنی ہنگامۂ ستّاون سے چالیس سال سے بھی زیادہ پہلے کا!۔

پھرتے تھے۔ دلی اُجڑ گئی اور شُرفا کے مکان ویران و برباد کر دیے گیے ۔۔۔۔ ان واقعات کو مرزا غالب نے بہ چشمِ خود دیکھا تھا، غالباً اسی کے متعلق فرماتے ہیں:

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں[1]

(مقدمہ: ص ۳۴)

آپنے ملک و شہر کے لوگوں پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں، ان پر مرزا خون کے آنسو بہاتے ہیں ۔۔۔۔۔ خاص کر مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے، وہ ناقابلِ بیان ہیں۔ مرزا لکھتے ہیں ۔۔۔۔۔

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

دل نہیں ورنہ دکھاتا تجھ کو داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا[2]

(مقدمہ، صفحہ ۳۵، ۳۶)

---

[1] یہ شعر نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) میں شامل ہے۔ دیکھیے: نسخۂ شیرانی، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۹ء ورق ۳۴ ب (حاشیہ) اس لیے یہ یقیناً ۱۸۵۷ء کے واقعات سے متعلق نہیں۔

[2] یہ اشعار نسخۂ حمیدیہ میں دیکھے جا سکتے ہیں (صفحہ ۷۳) مقطع، بیاضِ غالب (۱۸۱۶ء) میں شامل ایک غزل کے مقطع (نقوش، ص ۹۶ - ۹۷ و نسخۂ عرشی زادہ، ص ۲۵) کی ترقی یافتہ صورت ہے، ۱۸۵۷ء سے ۳۵ ۔۴۰ برس پہلے کے ان اشعار سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ۱۸۵۷ء میں "اپنے ملک و شہر کے لوگوں پر (بقیہ اگلے صفحے پر)

"جو مصائب اہلِ ہند پر ۱۸۵۷ء کے کچھ پہلے اور پھر اُس کے بعد نازل ہوئے، وہ بجائے خود آئندہ کے لیے ایک سبق تھے، جس کو مرزا نے کس خوبی سے ادا کیا ہے اور ان کی خواہش ہے کہ ان کے ہم وطن، اُن سے سبق حاصل کریں اور آئندہ کے لیے متنبہ ہوں :

اہلِ بینش کو ہے، طوفانِ حوادث، مکتب
لطمۂ موج، کم از سیلیِ اُستاد نہیں[1]

(مقدمہ ۲۶)

"دلّی فتح ہونے کے بعد نہ صرف اہلِ دلّی نے بلکہ تقریباً تمام ملک نے انگریزی سرکار کی اطاعت قبول کر لی اور طرح طرح سے اپنی وفاداری کا اظہار کرنے لگے، لیکن حکّامِ انگریزی کا جوشِ انتقام کم نہ ہوا۔ ہنگامے کے حالات اُن کو فراموش نہ ہوئے۔ لوگوں کو سزائیں دی گئیں۔ اُمرا کی جاگیریں ضبط ہوئیں۔ غربا کے مکانات مسمار کر دیے گیے۔ مرزا ان حالات کا ذکر...

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) جو مصیبتیں نازل ہوئیں، اُن پر مرزا خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ یا یہ ادعا کرنا کہ ان اشعار میں "اُن مظالم" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ۱۸۵۷ء میں خاص کر مسلمانوں پر توڑے گئے کسی طرح صحیح نہیں۔

[1] یہ شعر نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے ورق ۳۴ ۔ ب پر موجود ہے، یعنی ۱۸۵۷ء سے تیس سال سے بھی زیادہ پہلے کا ہے۔ اس کی بنا پر یہ حکم لگانا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے کہ "۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے اور اس کے بعد اہلِ ہند پر جو مصائب نازل ہوئے" غالب نے انھیں خوبی سے شعر میں ادا کیا ہے؟ یا یہ کہ غالب کی خواہش یہ تھی کہ اُن کے ہم وطن ان مصائب سے سبق حاصل کریں اور آئندہ کے لیے متنبہ ہوں۔؟؟"

شکایت کے پیرایے میں یوں کرتے ہیں :

دلِ محرومیٔ تسلیم و بدا حالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں[1]

(مقدمہ: ۳۶)

"ایک اور جگہ رقم فرماتے ہیں: "بھائی، بُری آ بنی ہے"..... اور پھر جو سزائیں دی گئیں، ان کی سختی کی گویا یوں شکایت کرتے ہیں:

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں[2]

(مقدمہ ۳۶، ۳۷)

"ایک دوست کو لکھتے ہیں: بھائی ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا لاکھوں مر گئے، جو زندہ ہیں، اُن میں سینکڑوں گرفتارِ بند بلا ہیں" ایک دوسری جگہ شاہی خاندان کی تباہی کا ذکر..... کرتے ہیں..... حقیقت یہ ہے کہ دُنیا کی تاریخ میں بہت کم فاتحین نے اپنے مغلوب حریف کے اہل و عیال و نسل کے ساتھ اس قسم کا سخت برتاؤ کیا ہوگا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندوں نے بہادر شاہ کے خاندان کے ساتھ روا رکھا۔ ان تمام خیالات کے

---

[1] یہ شعر بھی نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) میں شامل ہے (ورق ۴۳ ـ ب) اس لیے یہ کہنا کسی طرح درست نہیں، کہ اس میں اُس ہنگامے کے حالات کا ذکر شکایت کے پیرایے میں ہوا ہے جو بجائے خود اس شعر کے کامل اکتیس برس بعد ظہور پذیر ہوا۔

[2] یہ شعر، غالب کی اُس غزل کا ہے جو غالب نے بہادر شاہ ظفر سے خطاب و خلعت اور خدمت پانے پر طرزِ تازہ میں ۴ جولائی ۱۸۵۰ء یا اس کے معاً بعد لکھی، اسے واقعۂ ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں دیکھنا درست نہیں۔

ہجوم سے مرزا غالب اس قدر متاثر ہیں کہ جس کا اندازہ مشکل سے کیا جا تا ہے اپنے دردِ دل کا اظہار ذیل کے اشعار میں کس خوبی سے اور کتنے پُردرد الفاظ میں کرتے ہیں :

گلشن میں بند و بست بہ رنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس، کمندِ شکارِ اثر ہے آج [1]

(مقدمہ ۳۸)

---

[1] پہلا شعر، بیاضِ غالب (۱۸۱۶ء) میں موجود ہے (نقوش، ص ۱۰۶-۱۰۷، نسخۂ عرشی زادہ، ص ۳۰) اور دُوسرا شعر، نسخۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) صفحہ ۹۲ کے حاشیے پر موٹے قلم سے شکستہ خط میں تحریر ہوا ہے۔ گویا دونوں شعر، ۱۸۵۷ء سے ۳۵، ۴۰ سال پہلے کے ہیں، اس لیے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ غالب نے یہ شعر اہلِ ہند کی تباہی اور بہادر شاہ کے اہل و عیال پر انگریز حکام کے ظالمانہ سلوک سے متاثر ہو کر قطعاً نہیں لکھے۔ غالب کے ایک جدید شرح نگار نے بھی ان اشعار کی توجیہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے پس منظر میں کی ہے۔ اس کا یہاں درج کر دینا لطف اور عبرت سے خالی نہ ہوگا: "غالب کا یہ شعر غالباً ان ایام میں لکھا گیا جب کہ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء واقع ہوا، یا بعد میں مگر اشارہ انھیں حالات کی طرف ہے، جو اس ہنگامے میں دہلی والوں پر گزرے یہاں "گلشن" سے مُراد دہلی سے ہے اور "قمری" دہلی والوں سے۔ اس وقت دہلی کی تمام آبادی باستثنے چند جن کی رعایت انگریزوں کو منظور تھی، سب دہلی سے نکال دی گئی تھی۔ گھر کی محبت کس کو نہیں ہوتی اور بالخصوص جب بے سروسامانی کی حالت میں باہر پڑے ہُوئے ہوں۔ باہر نکالے ہوئے لوگ رات کے اندھیرے میں چوری چھپے شہر میں داخل ہوتے اور پہرے داروں سے بچ کر اگر گھر پر پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے تو حکومت کا تالا لگا ہوا دیکھ کر مایوسی کی وجہ سے چوکھٹ پر سر ٹکا دیتے۔ اس زمانے میں کنڈا، زنجیر عام طور پر نیچے چوکھٹ میں ہی لگائی جاتی تھی۔ ان حالات کا بیان غالب اس شعر میں کرتے ہیں...... دُوسرا شعر بھی اسی تاثر کے تحت لکھا گیا ہے۔"

(صاحب زادہ احسن علی خاں، مفہومِ غالب، مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۳۴ ۱۲)

"غالب کے دیوان میں جگہ جگہ ایسی مثالیں ملتی ہیں، جن سے اُن کے حُبِّ وطن کا اظہار ہوتا ہے اور وہ بار بار اپنے ملک کی بدنصیبی پر روتے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:...

ہندوستان سایۂ گل، پائے تخت تھا
جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بُتاں نہ پوچھ
ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے
عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ[1]

(مقدمہ: ۲۹)

"ایک خط میں لکھتے ہیں: خدا ذرا کیا تم دلّی کو آباد اور قلعے کو معمور اور سلطنت کو بہ دستور سمجھے ہوئے ہو؟ بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں۔"

"ایک دُوسرے خط میں لکھتے ہیں: "ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گزری، اَموال کیا ہوئے، اشخاص کہاں گئے۔ خاندانِ شجاع الدولہ کے زن و مرد کا کیا انجام ہُوا؟..... ان تمام واقعاتِ دل خراش پر روتے ہیں اور فرماتے ہیں:

---

[1] یہ اشعار بیاضِ غالب (۱۸۱۶ء) سے ماخوذ ہیں (نقوش، ص ۱۹۲-۱۹۳، نسخۂ عرشی زادہ ص ۲)، یعنی ۱۹ برس کی عمر کے غالب کے اور انقلاب ۱۸۵۷ء سے ۴۱ برس پہلے کے۔ اوّل الذکر شرکی سند کے ساتھ دور آفریدی نے بھی لکھا ہے کہ:

"غدر میں ہندوستانیوں کی ناکامی اور انگریزوں کی کامیابی کے بعد دلّی پر جو کچھ گذری، اس پر غالب کا دل رو پڑا۔"

(دور آفریدی، ادبی اقدار، اُردو ریسرچ اکاڈمی، رام پور۔ ۱۹۷۳ء ص ۶۰)

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں[1]

کس قدر معنی خیز شعر ہے۔" (مقدمہ: ۳۹)

"اگر مرزا غالب کے دیوان کو بہ غور پڑھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اُن کو اپنے مُلک سے کس درجہ محبّت ہے۔ اپنے ضائع شدہ قومی وقار کا کس درجہ رنج ہے اور اپنی کھوئی ہوئی ملکی آزادی پر اُن کے آنسو کبھی نہیں تھمتے۔ فرماتے ہیں:-

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں[2]

(مُقدمہ: ۳۹-۴۰)

"اس وقت تک کی جو حالت تھی، اُسے یاد کر کے کہتے ہیں:

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے[3]

(مُقدمہ: ۴۰)

---

[1] [2] یہ اشعار غالب کی اس غزل کے ہیں جو دہلی اُردو اخبار جلد ۱۳، نمبر ۳۲ مورخہ ۱۲ شوال ۱۲۶۸ھ مطابق ۲۸ اگست ۱۸۵۲ء میں اس تمہید کے ساتھ شائع ہوئی تھی کہ یہ اس ہفتے کا کلام ہے (نسخۂ عرشی ص ۲۲۷) ظاہر ہے یہ اشعار اس وقت کے ہیں جب دلّی آباد، قلعہ معمور، سلطنت بہ دستور اور ملکی آبادی موجود تھی!

[3] یہ شعر ۱۸۵۷ء سے چالیس سال سے بھی زیادہ پہلے کا ہے اور بیاضِ غالب (۱۸۱۶ء) میں موجود (بقیہ اگلے صفحے پر)

"اپنی ملکی آزادی کے جانے پر ہر چند صبر کرنا چاہتے ہیں، لیکن ضبط نہیں ہوتا اور بے اختیار چیخ اُٹھتے ہیں:

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں[1]

(مُقدمہ: ۴۰)

"جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا اور سلطنت کے مالک بن بیٹھے اُس وقت سے برابر ان کا یہی دعویٰ رہا کہ وہ ہندوستان میں صرف ہندوستانیوں کے مفاد کی غرض سے حکومت کر رہے ہیں، اور یہ کہا گیا کہ ملکِ ہندوستان کی حکومت، ہندوستانیوں کو رفتہ رفتہ دی جائے گی۔ یہاں تک کہ ایسا وقت آئے گا جب حکومت کی ساری ذمّے داری اہلِ ہند کے سپرد کر دی جائے گی۔ مرزا غالب کہتے ہیں اور حسرت و مایوسی کے ساتھ کہتے ہیں:

آہ کو چاہیے اک عُمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گُہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک[2] (مقدمہ: ۴۱)

(حاشیۂ گذشتہ سے پیوستہ) ہے (نقوش، ۲۶۶، ۲۶۷، نسخۂ عرشی زادہ، ۱۱۰۱)

[1] یہ شعر ملکی آزادی کے جانے سے کئی برس پہلے (اگست ۱۸۵۲ء) کا ہے!

[2] یہ اشعار نسخۂ حمیدیہ ۱۸۲۰ء میں شامل ہیں (نسخۂ حمیدیہ، ص ۱۲۸) اور کوئی متعین سیاسی پس منظر نہیں رکھتے۔

"۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد فاتح کے جوشِ انتقام نے مفتوح کے ملک و دولت ہی پر قناعت نہ کی بلکہ اُن کے سرمایۂ ناز کارنامے اور فن و کمال یہاں تک کہ ان کی تہذیب کو مٹانے اور برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ مرزا غالب جیسے باکمال شاعر اور صاحبِ دل پر اس کا اثر نہ ہوتا۔ چنانچہ جس پوشیدہ مگر دردناک پیرایے میں انھوں نے اس کا مرثیہ لکھا، وہ حقیقتاً دل ہلا دینے والا ہے اور ہندوستان کی مٹی ہوئی عظمت کو یاد دلا کر خون کے آنسو رُلواتا ہے۔ اس کے چند اشعار نقل کیے بغیر دل نہیں مانتا:

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سور نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
ایک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے[1]

(مقدمہ: ۳۶، ۳۸)

---

[1] غالب کی یہ غزل ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے اکتیس برس پہلے کی زائدۂ فکر ہے یہ نسخۂ شیرانی [illegible]

حقیقت یہ ہے کہ اشعارِ غالب کا واقعاتِ ستاون پر انطباق اور اشعارِ غالب کے لیے سنہ ستاون کے پر کھٹے یا پس منظر کی فراہمی، تاریخی غلطی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے سیاق و سباق میں کلامِ غالب کی توجیہ دراصل متیجہ ہے۔ غالب کے کلام کی زمانی ترتیب سے صرفِ نظر کا ...... اور یہ خرابی بالخصوصیت ڈاکٹر سید محمود ہی سے خاص نہیں، جب اور جہاں غالب کے مفسروں نے اس کا لحاظ نہیں رکھا استنباطِ نتائج میں ٹھوکر کھائی ہے ...... اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں عہدِ موجود تک چلا آتا ہے:

"غالب، ابھی مکتب ہی میں تھا کہ اُس نے شاعری شروع کر دی۔ لیکن اس کا کمال، ۱۸۵۷ء کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔"

(بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق)

"مغلیہ سلطنت کے جانے سے جو صدمہ غالب کو ہُوا، اُس کا اثر غالب کے کلام میں درد و سوز سے پایا جاتا ہے۔"

(بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق)

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) (۱۸۲۶ء) کے ورق ۶۱ - ب پر مندرج ہے۔ اس غزل کو، ۱۸۵۷ء کے حوالے سے "دل ہلا دینے اور خون کے آنسو رُلا دینے والا دردناک مرثیہ" قرار دینا تاریخی اعتبار سے صریح غلطی ہے۔ دورآفریدی نے بھی اس قطعہ بند غزل کے حوالے سے لکھا ہے کہ "یہ مابعد غدر" غالب کی حد درجہ حسرت سامانیوں پر مظہر ہے۔

(ادبی اقدار، اُردو ریسرچ اکاڈمی، رام پور، ۱۹۷۲ء ص ۶۰)

لے اور ٹے (۹) ہم قلم، کراچی، اگست ۱۹۶۲ء، ص ۹۶

(ب) اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۶ء، جلد ۲، ص ۴۴

یہ کہنا صحیح نہیں کہ غالب کا شعری کمال ۱۸۵۷ء کے بعد ظاہر ہوا۔ اس فتنہ و فساد کے بعد تو خود غالب کے بہ قول :

"شعر کو مجھ سے اور مجھ کو شعر سے ہرگز نسبت باقی نہیں رہی ۔"

(بہ نام سرور، ۱۸۵۹ء)

"بعدِ غدر ذوقِ شعر باطل اور دل افسردہ ۔ ۔ ۔ ۔ دو تین غزلیں فارسی، ہندی لکھی ہیں ۔" (بہ نام کلب علی خاں، ۱۰ ستمبر ۱۸۶۶ء)

اور انقلابِ ستاون کے بعد کی یہ چیزیں غالب کے کمالِ شعری پر دال نہیں اسی طرح مغلیہ سلطنت کے جانے کے کسی صدمے کا کوئی انعکاس یا اثر بھی درد یا سوز کے ساتھ کلامِ غالب میں نہیں ملتا ۔

○

ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال، چودھری محمد حسین مرحوم کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ غالب کے :

"سارے کلام میں صرف ایک شعر ہندی اسلام کے دورِ تنزل کی عکاسی کرتا ہے جو بہادر شاہ ظفر کے متعلق ہے : اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے ۔"

(مے لالہ فام، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۲۰۶)

یہ شعر بہادر شاہ ظفر سے متعلق نہیں، انقلاب ستاون سے تیس اکتیس برس پہلے، یہاں تک کہ ظفر کی تخت نشینی سے بھی دس گیارہ سال قبل کا ہے، دیکھیے : نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء)، ورق ۶۱ - و

○

"غالب کے عہد میں ہم پر جو وقت پڑا تھا، اُس کا شعور اور اُس کی ترجمانی غزلیاتِ (غالب) میں عمومیت اور آفاقیت کے انداز میں ہے

جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد جب انگریزوں کی وحشت و بربریت کی یلغار زوروں پر ہے، ہر طرف کشت و خون اور شکست و ریخت کا ہنگامہ گرم ہے، غالب گہرے دُکھ کے ساتھ سوچ رہے ہیں:

دل تا جگر، کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب　　اس رہ گذر میں جلوۂ گُل آگے گرد تھا

ہے موجزن اک قلزمِ خوں، کاش! یہی ہو　　آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

(فتح محمد ملک، صحیفہ، لاہور اکتوبر ۱۹۶۹ء ص ۸۱)

سند اور تائید میں غزلیاتِ غالب سے جو دو شعر پیش کیے گئے ہیں، اُن میں سے پہلا نسخۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) سے ہے، یعنی جنگِ آزادی سے چھتیس برس پہلے کا اور دُوسرا شعر نسخۂ رام پور، جدید (۱۸۵۵ء) میں موجود ہے، ان اشعار کو جنگِ آزادی میں ناکامی انگریزوں کی وحشت و بربریت کی پُرزور یلغار اور ہمہ جہتی کشت و خون اور شکست و ریخت کے ہنگامۂ گرم پر غالب کے گہرے دُکھ اور فکر سے تعبیر کرنا درست نہیں۔

○

غالب کے شعری رویے پر انقلابِ ستاون کے اثرات کا کچھ اندازہ خطوطِ غالب کے حوالے سے ممکن ہے، اشراف داعیان ہی انقلاب کا شکار نہیں ہوئے، یہ سیلابِ بلا ہمارے بیش قیمت علمی اور تہذیبی سرمایے کو بھی بہا لے گیا، قلمی نسخے مِٹ گئے، کتابیں لُٹ گئیں:

"انصاف کرو، کتاب کوئی سی ہو اس کا پتا کیوں کر لگے؟ لُوٹ کا مال چوری چوری کونے کھتروں میں بِک گیا اور اگر سڑک پر بھی بِکا تو میں کہاں دیکھوں؟ صبر کرو اور چپ ہو رہو۔"

(ثاقب، ۸ر فروری ۱۸۵۸ء)

"آپ مرزا صابر (قادر بخش) کا تذکرہ (گلستانِ سخن) مانگتے ہیں۔ اس کا حال یہ ہے کہ غدر سے پہلے چھپا اور غدر میں تاراج ہو گیا۔ اب

ایک مجلّد اس کا کہیں نظر نہیں آتا۔"

(بنام حبیب اللہ ذکا ۱۶ مئی ۱۸۶۶ء)

"خداوند! کیا تم دلّی کو آباد اور قلعے کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہوئے ہو جو حضرتِ شیخ (کلیم اللہ جہاں آبادی) کا کلام ... اور صاحب زادہ قطب الدین بن مولانا فخر الدین علیہ الرحمہ کا حال پوچھتے ہو؟ "این دفتر را گاو خورد، گاو را قصاب برد و قصاب در راہ مرد"۔ بادشاہ (ظفر) کے دم تک یہ باتیں تھیں۔ خود میاں کالے صاحب مغفور (بہادر شاہ ظفر کے مُرشد) کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو پھیر دی۔ کاغذ کا پُرزہ، سونے کا تار، پشمینہ کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا مقبرہ اُجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ اُن کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہو گا کہ کہاں ہیں۔ اُن کے پاس شیخ کا کلام بھی تھا۔ کچھ تبرّکات بھی تھے۔ اب جب لوگ ہی نہیں تو کس سے پوچھوں؟ کیا کروں؟ کہیں سے یہ مدّعا حاصل نہیں ہو سکے گا۔"

(احمد حسن مودودی، یکم ستمبر ۱۸۶۲ء)

لے مرزا قادر بخش صابر کا "تذکرہ" "گلستانِ سخن"، ۱۲ مئی ۱۸۵۵ء میں مکمل ہوا اور اسی سال مطبع مُرتضوی، دہلی سے پہلی بار شائع ہوا۔ طبع اوّل کا ایک نسخہ انجمن ترقی اُردو، پاکستان (کراچی) کے کُتب خانۂ خاص میں موجود ہے اور ایک مجلّد مجلس ترقی ادب، لاہور کے کتاب خانے کی زینت ہے۔

خود غالب کے سرمایۂ علمی کا ایک بڑا حصّہ، ۱۸۵۷ء کے فتنہ و فساد میں غارت ہُوا اس آفت کا ذکر انھوں نے اپنے خطوں میں اکثر بڑے درد اور حُزن و رقّت کے ساتھ کیا ہے:

"حضرت! اِس غریب کا مجموعۂ نظم و نثر غدر میں لُٹ گیا۔"

(نواب کلب علی خاں، ۲۴ستمبر ۱۸۶۶ء)

"غدر میں میرا گھر نہیں لُٹا، مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لُٹتا۔ بھائی ضیاء الدین خاں بہادر اور ناظر حسین مرزا ہندی اور فارسی نظم اور نثر کے مسوّدات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے، سو اُن دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی، نہ اسباب رہا۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں؟"

(یوسف علی خاں عزیز، نومبر ۱۸۵۹ء)

"میرا کلام، کیا نظم، کیا نثر، کیا اُردو، کیا فارسی، کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسوّدات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو اُن کے لاکھوں روپے کے گھر لُٹ گئے جس میں ہزاروں روپے کے کتاب خانے بھی گئے اس میں وہ مجموعہ ہائے پریشان بھی غارت ہُوئے۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، جولائی ۱۸۵۹ء)

"میرا کلام کیا نظم، کیا نثر، کیا اُردو، کیا فارسی، کبھی میرے پاس فراہم نہیں ہُوا۔ دو چار دوستوں کو اس کی فکر تھی، وہ مسوّدات مجھ سے لے کر جمع کرتے تھے۔ سو اُن دوستوں کا، زمانۂ غدر میں گھر ہی

لُٹ گیا۔ نہ کتاب رہی، نہ اسباب رہا، پھر میں اپنا کلام نظم و نثر کہاں سے لاؤں؟"

(تمنا مرزا پوری، ۱۳ جولائی ۱۸۶۷ء)

"میرا ایک سببی بھائی ہے نواب ضیاء الدین خاں سلّمہ اللہ تعالیٰ، وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا تھا..... سب نسخے اس کے کتب خانے میں تھے۔ وہ کتاب خانہ، ڈر کر عرض کرتا ہوں، بیس ہزار روپے کی مالیت کا ہوگا، لُٹ گیا، ایک ورق نہیں رہا۔"

(صاحب عالم، جولائی ۱۸۶۱ء)

"کیا کہوں تم سے، ضیاء الدین خاں جاگیردار لوہارو، میرے سببی بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں، جو نظم و نثر میں، میں نے کچھ لکھا، وہ انھوں نے لیا اور جمع کیا۔ چنانچہ "کلیات نظم فارسی" چوّن پچپن جز، اور "پنج آہنگ" اور "مہر نیم روز" اور "دیوان ریختہ" سب مل کر سو، سوا سو جز، مُطلّا اور مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ، کوئی ڈیڑھ سو دو سو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب یک جا فراہم ہے۔ پھر ایک شہزادے نے اس مجموعۂ نظم و نثر کی نقل لی، اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور شہر لُٹے۔ وہ دونوں جگہوں کا کتاب خانہ، خوانِ یغما ہو گیا۔ ہر چند میں نے آدمی دوڑائے، کہیں سے، اُن میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔ وہ سب قلمی ہیں..... اگر کہیں ان میں سے کوئی نسخہ بکتا ہوا آ دے، تو اس کو میرے واسطے خرید کر لینا اور مجھ کو اطلاع کرنا، میں قیمت بھیج کر منگوالوں گا۔" (آرام، ۱۱ دسمبر ۱۸۵۸ء)

"یہ شہر بہت غارت زدہ ہے۔ نہ اشخاص باقی، نہ امکنہ۔ کتاب فروشوں سے کہہ دوں گا، اگر میری نظم و نثر کے رسالوں سے کوئی رسالہ آجائے گا تو وہ مول لے کر خدمت میں بھیج دیا جائے گا۔"

(جنوں، ۲۲ر فروری ۱۸۶۱ء)

یہی نہیں کہ غالب کا سرمایۂ علمی، کیا نظم، کیا نثر، کیا اُردو، کیا فارسی ۱۸۵۷ء کے فتنہ و فساد کی نذر ہوا۔ اس سے بھی کہیں بڑھ کر ستم یہ کہ اس غارت گری کے نتیجے میں غالب کا ذوقِ شعر باطل اور دل افسردہ ہو گیا، سخن سنجی اور جوہر فکر کی رخشندگی جاتی رہی۔ قوتِ ناطقہ پر تصرّف باقی نہ رہا اور وہ شعر سے بیزار ہو گئے:

"بھائی ضیاء الدین خاں کا مجموعۂ نثر و نظم فارسی اور اُردو سَراسر دیکھا ہوا میرا، جو اُن کے کتاب خانے میں تھا، غدر میں لُٹ گیا۔ بعدِ غدر ذوقِ شعر باطل اور دل افسردہ..... دو تین غزلیں فارسی، ہندی..... لکھی ہیں۔"

(نواب کلب علی خاں، ۱۰ر ستمبر ۱۸۶۶ء)

"شعر کو مجھ سے اور مجھ کو شعر سے ہرگز نسبت باقی نہیں رہی۔ اس فتنہ و فساد (۱۸۵۷ء) کے بعد ایک قصیدہ جو "دستنبو" (نومبر ۱۸۵۸ء) میں ہے اور ایک قصیدہ (مارچ، اپریل ۱۸۵۹ء) نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر غرب و شمال (جارج ایڈمنسٹن) کی مدح میں ایک اور قصیدہ (مارچ ۱۸۵۹ء) نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب (سَر رابرٹ منٹگمری) کی مدح میں اور دو بیت کا ایک قطعہ اور ایک رُباعی، اس نظم کے سوا، اگر کچھ لکھا ہو تو مجھ سے قسم لیجیے۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، ۱۸۵۹ء)

"فارسی کیا لکھوں، یہاں ترکی تمام ہے۔ اخوان و احباب یا مقتول، یا مفقود الخبر ہزاروں کا ماتم دار ہوں۔ آپ غم زدہ اور غم گسار ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں، مرنا سر پر کھڑا ہے، پابرکاب ہوں" (جنوں بریلوی، ۸ ستمبر ۱۸۵۹ء)

"میں اموات میں ہوں، مُردہ شعر کیا کہے گا؟ غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں، جو غزل کی روش ضمیر میں آوے؟ رہا قصیدہ، ممدوح کون ہے؟..... گورنمنٹ کے دربار میں ہمیشہ سے میری طرف سے قصیدہ نذر گزرتا ہے..... خلعت (وغیرہ)..... مجھ کو ملا کرتا ہے۔ اب نواب گورنر جنرل بہادر یہاں آتے ہیں، دربار میں بُلائے جانے کی توقع نہیں، پھر کس دل سے قصیدہ لکھوں؟ صناعتِ شعر، اعضا و جوارح کا کام نہیں، دل چاہیے، دماغ چاہیے، ذوق چاہیے، اُمنگ چاہیے۔ یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں؟ چونسٹھ برس کی عمر، ولولۂ شباب کہاں؟ رعایتِ فن، اس کے اسباب کہاں؟ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔"

(چودھری عبدالغفور سرور ۱۸۵۹ء)

"اشعارِ تازہ مانگتے ہو، کہاں سے لاؤں؟ عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا، بھٹئی کرتا تھا، خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف، بھٹئی متروک، نہ غزل، نہ مدح، ہزل و ہجو، میرا آئین نہیں۔ پھر کہو کیا لکھوں؟ بوڑھے پہلوان کے سے پیچ بتانے کو رہ گیا ہوں۔ اکثر اطراف و جوانب سے اشعار آجاتے ہیں۔ اصلاح پا جاتے ہیں۔ یاد رکھنا اور مطابق واقعہ سمجھنا" (علائی ۲ جولائی ۱۸۶۰ء)

"میں شاعرِ سخن سنج اَب نہیں رہا۔ صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں کا ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیوں کر کہا تھا؟"

(تفتہ، ۱۱ر اپریل ۱۸۵۸ء)

"نثر کیا لکھوں گا اور نظم کیا کہوں گا۔ وہ نثر جو تم دیکھ گئے ہو وہی دو چار ورق (دستنبو) اور بھی سیاہ کیے گئے ہیں... جب آؤ گے اور مجھ کو جیتا پاؤ گے تو دیکھ لوگے"

(مجروح، ہفتم فروری ۱۸۵۸ء)

"نظم و نثر کا کام صرف پچاس برس کی مشق کے زور سے چلتا ہے، ورنہ جوہرِ فکر کی رخشندگی کہاں؟ بوڑھا پہلوان پیچ بتاتا ہے، زور نہیں دلوا سکتا"

(سید احمد حسن ۲۱ر ستمبر ۱۸۶۰ء)

"قصیدے کا قصد..... تو کر سکتا ہوں، تمام کون کرے گا؟ سوائے ایک ملکے کے کہ وہ پچاس برس کی مشق کا نتیجہ ہے، کوئی قوت باقی نہیں رہی۔ کبھی جو سابق کی اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے، مگر حیران رہتا ہوں کہ یہ نثر میں نے کیوں کر لکھی تھی اور کیوں کر یہ شعر کہے تھے؟"

(چودھری عبدالغفور سرور، ۱۹ر نومبر ۱۸۶۰ء)

"از دیریاز بہ نظم و نثر نمی گرایم۔ نظم خواہی پارسی، خواہی اُردو، خوابیست فراموش۔"

(رفعت بھوپالی، انشائے نور چشم ۱۳ اپریل ۱۸۶۱ء، بہ حوالہ: مقدمہ دیوانِ غالب، عرشی ص ۸۰)

"میاں! تمھاری جان کی قسم، نہ میرا اب ریختہ لکھنے کو جی چاہتا ہے، نہ مجھ سے کہا جائے۔ اس دو برس میں صرف وہ پچیس شعر بطریقِ قصیدہ، تمھاری خاطر سے لکھ کر بھیجے تھے (ایلین برون کے بیٹے کی ولادت کا اکیس شعری قصیدہ اُردو، جسے آرام نے غالب سے لکھوا کر ایلین برون کو پیش کیا) سوائے اس کے اگر میں نے کوئی ریختہ کہا ہو گا تو گنہ گار، بلکہ فارسی غزل بھی واللہ نہیں لکھی۔ صرف دو قصیدے لکھے ہیں کیا کہوں کہ دل و دماغ کا کیا حال ہے؟"

(شیو نرائن آرام، ۲۲ اپریل ۱۸۵۹ء)

"گمان زیست بود بر منت ز بے دردی
بداست مرگ، و لے بدتر از گمانِ تو نیست

مجھے زندہ سمجھتے ہو، جو نثر فارسی کی فرمائشیں کرتے ہو، غنیمت نہیں جانتے کہ مُردہ کچھ لکھ کر بھیج دیتا ہے؟"

(غلام نجف خاں (؟) ۸ جولائی ۱۸۵۸ء)

(خطوطِ غالب، مولانا غلام رسول مہر، جلد ۲، صفحہ ۴۴۵)

"میرا حال اس فن (شعر و سخن) میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے شعر سب بھول گیا۔ مگر ہاں، اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ جب

دل اُلٹنے لگتا ہے، تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے:

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!

پھر جب سخت گھبراتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چُپ ہو جاتا ہوں:

اے مرگِ ناگہاں، تجھے کیا انتظار ہے؟"

(چودھری عبدالغفور سرور، ۱۸۵۸ء)

"میاں کیا باتیں کرتے ہو؟ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا؟ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں..... کتابیں کیا چھپواؤں گا۔"

(مجروح، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"اگر مجھے قوتِ ناطقہ پر تصرّف باقی رہا ہوتا تو..... حضرت کی مدح میں ایک قصیدہ لکھتا۔"

(جنوں بریلوی، ۱۹ر جون ۱۸۶۳ء)

"اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔!"

(تفتہ، ۱۸۶۳ء)

"ادھر قصیدے کی فکر، اُدھر رُوپے کی تدبیر، حواس ٹھکانے نہیں شعر کا کام دل و دماغ کا ہے وہ رُوپے کی فکر میں پریشان۔"

(تفتہ، ۴ر مارچ ۱۸۶۳ء)

"سبحان اللہ! تم جانتے ہو کہ میں اب دو مصرعے موزوں کرنے پر قادر

ہُوں، جو مجھ سے مطلع مانگتے ہو!"

(تفتہ، جولائی ۱۸۶۳ء)

"تجب ہے تم اب تک یہ جانتے ہو کر غالب شعر کہتا ہے؟ یا کہہ سکتا ہے؟"

(نیر کاکوروی ۱۸ جنوری ۱۸۶۴ء)

ڈاکٹر رنظ۔ انصاری نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ:

"ساٹھ برس کی زندگی میں غالب کے ذہن اور زندگی پر یہ آخری اور سب سے بڑی ضرب تھی۔ اس زمانے میں اور اس کے بعد جب تک وہ زندہ رہے، ان کی توجہ نثر پر رہی۔ فارسی میں کم، اُردو میں زیادہ"

(غالب شناسی، بمبئی ۱۹۶۵ء، ص ۸۱)

انقلابِ ستاون نے غالب سے ولولۂ شعری چھین لیا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک کے درمیان غالب نے گنتی کے شعر کہے، سخن سنجی جاتی رہی اور صرف سخن فہمی رہ گئی تھی اسی لیے شیخ محمد اکرام کا خیال ہے کہ:

"غدر اور غدر کے بعد جو اشعار لکھے گئے..... دو تین اُردو غزلیں اور چند فارسی قصائد... ان سے ایک علیحدہ دورِ شاعری ترتیب دینے میں کوئی مصلحت نہیں۔ حقیقتاً یہ زمانہ مرزا غالب کی اُردو نثر کا تھا"

(غالب نامہ، طبع اوّل، ۱۹۳۶ء، ص ۱۷۱)

غالب نے اسی زمانے میں یہ جو لکھا ہے کہ: "اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار" یہ بے مبالغہ اور بیانِ واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ شیخ محمد اکرم کی اشعار شماری کے مطابق:

"چوتھے دور (۱۸۵۶ء — ۱۸۶۹ء) میں جس میں شاعر کا چودہ برس کا کلام درج ہے، مرزا غالب نے ایک قطعہ اور ایک غزل فقط دو نظمیں اُردو میں لکھی ہیں۔"

(غالب نامہ، طبع اوّل ۱۹۳۶ء، صفحہ ۱۶۳)

اکرام صاحب کے یہ اعداد و شمار قریب چالیس برس پہلے کے ہیں۔ اس دوران میں نئے مآخذ سے غالبیات میں اضافہ ہوا ہے۔ غالب کے خطوط یا دیگر ذرائع کی بنیاد پر، اب ہم غالب کے جن اُردو اشعار کو ہنگامۂ ستاون کے بعد سے آخر عمر ۱۸۶۹ء تک کے درمیان کا قرار دے سکتے ہیں، اُس کی تفصیل یہ ہے: سات غزلیں، گیارہ قطعات، چار قصائد، تین رُباعیات، ایک مرثیے کے تین بند، تین شعر مثنوی کی صنف سے اور کچھ مفرد اشعار! یہ ہے انقلاب اور اس کے بعد سے انتقال تک کے بارہ برسوں کا کل شعری اکتساب، اس کا بھی زیادہ حصہ غالب کے لفظوں میں "بلند رُتبہ نہیں"۔ ان میں سے بیشتر چیزیں فرمائشی، ہنگامی اور وقتی نوعیت اور اہمیت کی ہیں۔ انقلابِ ستاون کی غارت گری کے اس اَلمیے کی طرف غالب شناسوں کی نظر بالعموم نہیں گئی کہ اس نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا:

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی، لیکن اب اس میں دم کیا ہے

(بہ نام مہر ۱۸۵۸ء)

اس کے برعکس نثر نگار غالب کا ظہور انقلابِ ستاون کے بعد ہوا۔

"حقیقتاً یہ زمانہ (۱۸۵۷ء — ۱۸۶۹ء) مرزا غالب کی اُردو نثر کا تھا۔" (ڈاکٹر شیخ محمد اکرم)

۱

۱۔ غالب نامہ، طبع اوّل ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۷۱

"اس زمانے (۱۸۵۷ء) میں اور اس کے بعد جب تک وہ (مرزا غالبؔ) زندہ رہے، ان کی توجہ نثر پر رہی، فارسی میں کم اور اُردو میں زیادہ[1]"

(ڈاکٹر ظ۔ انصاری)

غالبؔ کی معروف اور ضخیم فارسی نثری کُتُب "پنج آہنگ" (۱۸۴۹ء) اور "مہر نیم روز" (۱۸۵۴ء) انقلاب سے پہلے کی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد فارسی نثر میں غالبؔ کی صرف دو مختصر کتابیں شائع ہوئیں: ایک "دستنبو" (۱۸۵۸ء) اور دوسری "قاطع بُرہان" (۱۸۶۲ء) جس کی دوسری اشاعت معمولی ردّ و بدل اور کچھ مزید فوائد و مطالب کے ساتھ "درفشِ کاویانی" کے اضافی نام کے ساتھ (۱۸۶۵ء) میں سامنے آئی۔ "دستنبو" براہِ راست انقلابِ ستاون سے متعلق ہے، جب کہ "قاطع بُرہان" کو ڈاکٹر شیخ محمد اکرم کے بہ قول: "دستنبو" کا ثمرِ معنوی سمجھنا چاہیے[2]۔"

اُردو نثر میں غالبؔ کی کوئی کتاب سرے سے ماقبل انقلاب شائع نہیں ہوئی۔ اُن کی نثرِ اُردو کی سب کی سب کتابیں ۱۸۵۷ء کے بعد چھپیں۔ مباحثۂ بُرہان کے سلسلے کی چار کتابیں: 'لطائفِ غیبی' (۱۸۶۴ء)، 'نامۂ غالبؔ' (۱۸۶۵ء)، 'سوالاتِ عبدالکریم' (۱۸۶۵ء) اور 'تیغِ تیز' (۱۸۶۸ء) تو لکھی بھی گئیں ۱۸۵۷ء کے بعد۔ یہ ایک سلسلے سے ایامِ انقلاب میں غالبؔ کی خانہ نشینی کا حاصل ہیں۔ خطوطِ غالبؔ کے سارے مجموعے بھی انقلاب کے بعد منظرِ عام پر آئے، دو اُن کی زندگی میں: "عودِ ہندی" (۱۸۶۸ء) "اُردوئے معلّیٰ" (۱۸۶۹ء) اور متعدد ان کی زندگی کے بعد؛

---

[1] غالب شناسی، طبع اوّل ۱۹۶۵ء، صفحہ ۸۱۔

[2] غالب نامہ: آثارِ غالبؔ، طبعِ چہارم، بمبئی، صفحہ ۱۶۷۔

"مکاتیبِ غالب" (۱۹۳۷ء) "نادراتِ غالب" (۱۹۴۹ء) "غالب کی نادر تحریریں" (۱۹۶۱ء) وغیرہ ...... ان خطوط کا اسّی فی صد سے متجاوز حصہ انقلابِ ستاون کے بعد کا ہے۔

اس عقب میں یہ کہنا بے جا نہیں کہ انقلاب ۱۸۵۷ء نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا، جب کہ نثر نگار غالب کا ظہور اِس انقلاب کے بعد ہوا۔ اور اُن کا کُل سرمایۂ نثرِ اُردو کسی نہ کسی سطح پر اس انقلاب ہی کی دین ہے۔

ضمیمۂ اوّل

مضمون اسداللہ خاں غالب در باب

تباہیِ شہرِ دہلی

مطبوعہ

(رسالۂ دہلی سوسائٹی، شمارۂ اوّل ۱۸۶۶ء ص ۲۲-۲۴)

رسالہ دہلی سوسائٹی، شمارۂ اوّل (مطبوعہ ۱۸۶۶ء در مطبع سراجی، دہلی) میں غالب کا ایک مضمون بہ عنوان "مضمون نواب اسداللہ خاں صاحب المتخلص بہ غالب" چھپا ہے (صفحہ ۲۲-۲۴) ختم مضمون پر غالب کا نام یوں درج ہے:

"راقم اسداللہ خاں شاعر، غالب تخلص، برادرزادہ نصراللہ بیگ خاں بہادر رئیس سونک سونسا مرقومۂ ۱۱ ماہِ اگست ۱۸۶۵ء"

یہ مضمون، غالب نے دہلی سوسائٹی کے دوسرے جلسے منعقدہ ۱۱ اگست ۱۸۶۵ء میں پڑھا: رسالہ دہلی سوسائٹی کے پہلے شمارے میں اس جلسے کی روداد چھپی ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ اس جلسے میں اوّل دو اصحاب کے مضامین پڑھے گئے:

"پھر صاحب کمشنر بہادر نے نواب اسداللہ خاں غالب سے فرمایا کہ میرزا صاحب! آپ نے بھی کوئی مضمون ہماری سوسائٹی کے لیے لکھا ہے؟ - نواب صاحب نے بیان کیا کہ میں نے کچھ لکھا ہے، مگر مجھ میں یہ طاقت نہیں کہ کھڑا ہو کر سناؤں - اگر اجازت ہو تو بیٹھے بیٹھے پڑھوں صاحب موصوف نے فرمایا بہت اچھا - نواب صاحب نے اسی وقت اپنی جیب میں سے ایک کاغذ نکال کر پڑھنا شروع کیا - اُس میں کچھ حال تباہیِ شہرِ دہلی اور کمیِ بارش کا تھا - سب حاضرینِ جلسہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور نواب صاحب کی بہت تعریف کی"

(رسالہ دہلی سوسائٹی، ۱: ۱۸۶۶ء صفحہ ۵)

رسالہ دہلی سوسائٹی کے تیسرے شمارے (مطبوعہ ۱۸۶۷ء، اکمل المطابع، دہلی) میں، اُن مضمونوں کی فہرست دی گئی ہے جو سوسائٹی کے جلسوں میں پڑھے گئے تھے۔ اس فہرست میں غالب کے مضمون کا ذکر ان لفظوں میں ہے:

"نواب اسداللہ خاں غالب در بابِ تباہیِ شہرِ دہلی"

(صفحہ ۲۹)

اس تحریر کا تعارف سب سے پہلے مالک رام نے کرایا (ادبی دُنیا، لاہور،

شمارہ ستمبر ۱۹۲۹ء)، پھر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اپنے ایک تحقیقی مقالے "دہلی سوسائٹی اور مرزا غالب" (مطبوعہ: علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۹۴-۹۳) میں غالب کی اس تحریر کو نقل کیا۔ "احوالِ غالب" (مختار الدین احمد، علی گڑھ جون ۱۹۵۳ء) میں بھی یہ تحریر صدیقی صاحب کے مقالے کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ غالب نے اپنے خطوں میں (۱۸۶۹-۱۸۳۰) اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اس سے الگ دہلی کی تباہی کے بارے میں غالب کی یہ واحد اردو تحریر ہے جو مطبوعہ صورت میں ہمیں ملتی ہے۔ اس اہمیت کے پیشِ نظر اسے اگلے صفحات میں پیش کیا جاتا ہے۔

"حکّامِ معدلت فرجام اور صاحبانِ والا مقام کی جناب میں، اور حاضرینِ انجمن اور دانندگانِ ہر علم و فن کی خدمت میں بلکہ جو شخص خدا پرست و حق شناس ہے، اس سے میرا التماس ہے کہ یاد کرو ۱۸۵۷ء میں دہلی کے رہنے والوں نے حاکموں پر شہر کا دروازہ بند کر دیا اور ایسے فرماندہانِ دادگر سے لڑائی کا قصد کیا، میگزین کا دروازہ کھلوایا اور انھیں کی گولی بارود سے، اُن پر آگ کا مینہ برسایا۔ چار مہینے چار دن ظلم کی آنچ کی تیزی رہی، قلعہ اور شہر اور باہر خوں ریزی رہی۔ ناگاہ قہرِ الٰہی[1] اس شدّت سے نازل ہوا کہ ہر جاندار کو جینا مشکل ہوا۔ قومِ انگریز کو خدا نے فتح عنایت کی

---

[1] "قہرِ الٰہی" کی تفصیل غالب نے مجروح کے نام ۲۹ جولائی ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں اس طرح رقم کی ہے:-

"برسات کا نام آگیا، سو پہلے مجملاً سنو: ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدامِ مکانات کا، ایک آفت وبائی، ایک مصیبت کال کی، اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے، آج اکیسواں دن ہے آفتاب

انھوں نے سیاست کے بعد رعیت کی رعایت کی۔ ہر چند حکام کو عفوِ جرائم منظور رہا، مگر قہرِ حاکمِ حقیقی بہ دستور رہا، نہ ملین کا پتا نہ مکان کے آثار، نہ وہ گلی کوچے، نہ وہ بازار۔ مانا کہ شہر کی صورت اب اس سے بہتر ہے، مگر وہ عمارت جس پر خدا کے قہر کی آندھی چلی تھی، وہ کدھر ہے؟۔ شعر:

سپس ہر آئینہ شہرے جدید خواہد بود
نہ آن کہ شاہِ جہاں ساخت در زمانِ قدیم

رفعِ فتنہ و فساد، ظہورِ امن و داد مسلم، لیکن قہرِ الٰہی سے کچھ پیش نہیں جاتی خلافِ تقدیر، تدبیر بن نہیں آتی۔۔۔۔ تین برس برابر کال رہا، ہر شخص خستہ و بدحال رہا۔ آب و ہوا کی ناسازگاری، طرح طرح کی مصیبت، رنگ رنگ کی بیماری کلیجوں کا تپ کی حرارت سے سلگنا، گھروں میں جا بہ جا آگ کا لگنا، ہوا شرارہ ریز، خاک شعلہ انگیز، دریا اور کنوئیں کا پانی زہر آب، مینہ کے پانی کی بوند گوہرِ نایاب، اساڑھ اور ساون، برسات کے دو مہینے تمام ہوئے۔ ساون کے آخر اور بھادوں کے

اس طرح نظر آجاتا ہے، جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ اُن کو جگنو سمجھ لیتے ہیں، اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سُنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا ہزار ہا مکان گر گئے، سینکڑوں آدمی جا بہ جا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر، وہ ان کال تھا کہ مینہ نہ برسا، اناج نہ پیدا ہوا، یہ پن کال ہے کہ پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہ گئے۔۔۔۔۔۔ جنھوں نے ابھی نہیں بویا، وہ بونے سے رہ گئے ـــــــــــــ سُن لیا دلّی کا حال! "

اول دو چار مہینے ہوئے، جس میں پانی اس قدر برسا کہ زمیں داروں نے حاصلِ فصلِ ربیع سے ہاتھ دھو لیے۔ پایانِ کار کا حال خدا جانے۔ خلق اُس کے اسرار کو کیا جانے۔ گرانی اور ارزانی ایک امرِ عام ہے، مجھے خاص اپنے عرضِ مدعا سے کام ہے۔ بوڑھا ہوں ناتواں ہوں۔ سچ اگر پوچھیے تو نیم جاں ہوں:

ضعف[1] نے غالب نکما کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

میں کہاں اور بزم نشینی کہاں۔ نظم و نثر میں وہ رنگینی کہاں۔ سرکار کی خدمت گزاری کا شائق ہوں مگر اب صرف دو کام کے لائق ہوں۔ اگر کسی امر میں بذریعہ خط مجھ سے کچھ پوچھا جائے، تو وہ لکھ سکتا ہوں جو میری رائے میں آئے۔۔۔۔۔ یا اگر تحریر نظم و نثرِ فارسی و اُردو کا حکم آدے تو لکھ کر بھیج سکتا ہوں۔ آئندہ حکام کے پسند نہ ہو یا مقبول ہو جاوے۔

۱۸۰۶ عیسوی سے جس کو آج ساٹھ برس ہوئے سرکار انگریزی کا نمک خوار ہوں اور ۱۸۵۵ء یعنی دس برس سے شہنشاہِ بحر و بر حضرتِ فلک رفعت ملکۂ معظمہ کا مدحت نگار ہوں۔ دو قصیدے میرے ولایت پہنچ گئے، اُن میں سے ایک کی رسید کی

---

[1] متداول دیوان میں "ضعف" کی جگہ "عشق" ہے، لیکن آخر عمر میں انھوں نے لفظ "عشق" کو "ضعف" سے بدل دیا تھا۔ مصنف "سیر دہلی" ریاض الدین امجد نے غالب سے اپنی ایک ملاقات مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۶۰ء کے حال میں لکھا ہے کہ غالب کے سامنے یہ شعر پڑھا:

"۔۔۔۔۔۔ جب یہ زبان پر لایا تو مرزا نے برجستہ یہ فرمایا کہ: "اے بھئی چُپ رہو۔" یوں کہو کہ "ضعف نے غالب نکما کر دیا۔" یا "دہر نے غالب نکما کر دیا" عشق کیسا، عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا۔"

(سیر دہلی، مطبع حیدری، آگرہ، ۱۸۷۱ء، ص ۲۶، ۲۷۔ بہ حوالہ: احوالِ غالب، ص ۵۰)

اطلاع مجھ کو آ گئی۔ تیسرا قصیدہ میرے مسودات میں موجود اور مطلع اس کا یہ ہے:

نامہ زد کشور یا چو نامور آمد — از افق نامہ آفتاب بر آمد[1]

یہ قصیدہ اس کے سزاوار ہے کہ ایران بھیجا جائے اور وہاں کے شعرا سے داد مانگی جائے۔ اب میں جناب صاحب کمشنر بہادر اور مجموعِ صاحبانِ عالی شان کو سلام کرتا ہوں اور نگارش کو تمام کرتا ہوں۔"

(۱۱ راگست ۱۸۶۵ء)

---

[1] ۱۶۵ اشعار کا یہ قصیدہ "کلیات غالب" میں "قصیدۂ سی ویکم ہم در مدح شہنشاہ" کے عنوان سے چھپا ہے (کلیاتِ غالب، طبع دوم، نولکشور، لکھنؤ ۱۸۹۳ء، ص ۲۹۳-۲۹۶) مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ: "اصل قصیدہ یا اس کا حصہ چند سال پیش تر بہادر شاہ کے لیے کہا گیا تھا۔ بعد ازاں اس میں تبدیلیاں کر دی گئیں۔ علی گڑھ کے مخطوطے میں بعض اشعار ایسے ملتے ہیں جن سے اس رائے کو تقویت پہنچتی ہے ...." مخطوطہ علی گڑھ میں اس شعر "نامہ زد کشور یا الخ" کی یہ صورت درج ہے:۔

شاہ و ولی عہد عین یک دگر آمد
فتح بہ معنیٔ مرادف ظفر آمد

(قصائد و مثنویاتِ فارسی، مرتبہ: مہر، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء، ص ۲۱۹، ۲۲۲)

ضمیمۂ دوم

ملکۂ وکٹوریہ کا اعلان اور بیگم حضرت محل کا فرمان

"...... ہندوستانی والیانِ ریاست کے ساتھ کمپنی نے اس وقت تک جتنے عہدنامے کیے ہیں، اُن کی سب شرطوں پر آئندہ ایمان داری کے عمل درآمد کیا جائے گا"

اعلانِ ملکہ وکٹوریہ، انگلستان

"اس اعلان میں لکھا ہے کہ کمپنی نے جو جو وعدے اور عہد و پیمان کیے ہیں، ملکہ انھیں منظور کرے گی۔ لوگوں کو چاہیے کہ اس چال کو غور سے دیکھ لیں۔ کمپنی نے سارے ہندوستان پر قبضہ کر لیا ہے، اور اگر یہ بات قائم رہی تو پھر اس میں نئی بات کیا ہوئی؟"

— فرمانِ بیگم حضرت محل، لکھنؤ

"آپ کو ہندوستان پر قبضہ کرنے کا اور مجھے سزا کا مستحق قرار دینے کا
کیا حق ہے ؟ ہندوستان پر حکومت کرنے کا آپ کو کس نے اختیار
دیا ؟ کیا آپ فرنگی لوگ بادشاہ ہیں اور ہم اپنے ملک کے اندر چور ہیں ؟"۔
(انقلابی رہنما : نانا صاحب ، بہ نام جنرل ہوپ گرانٹ، اپریل ۱۸۵۹ء)

"لوگ کہتے ہیں، آگرے میں اشتہار جاری ہوگیا ہے اور ڈھنڈورا پٹ گیا ہے کہ کمپنی کا ٹھیکا ٹوٹ گیا اور بادشاہی عمل ہندوستان میں ہو گیا۔"

(غالب، بہ نام مرزا حاتم علی بیگ مہر، ۲۱ ستمبر ۱۸۵۸ء)

"حکم ہوا ہے کہ دوشنبے کے دن پہلی تاریخ نومبر کو رات کے وقت، سب خیر خواہانِ انگریز اپنے اپنے گھر میں روشنی کریں اور بازاروں میں اور صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی کوٹھی پر بھی روشنی ہوگی۔ فقیر بھی اس تہی دستی میں کہ اٹھارہ مہینے سے پنسن مقرری نہیں پاتا، اپنے مکان پر روشنی کرے گا اور قطعہ پندرہ بیت کا لکھ کر[1] صاحب کمشنر شہر کو بھیجا ہے۔"

(غالب، بہ نام شیو نرائن آرام، اواخر اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"یہاں پہلی نومبر (۱۸۵۸ء) کو (دوشنبے) کے دن حسب الحکم حکام، کوچہ و بازار میں روشنی ہوئی اور شب کو کمپنی کا ٹھیکا ٹوٹ جانا اور قلمروِ ہند کا بادشاہی عمل میں آنا سنا گیا۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر کو ملکۂ معظمۂ انگلستان نے فرزندِ ارجمند کا خطاب دیا اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم کیا میں قصیدہ[2] اس تہنیت میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں۔"

(غالب، بہ نام انور الدولہ شفق، پنجم نومبر ۱۸۵۸ء)

---

[1] آرام کے نام اس خط میں پندرہ بیت کا یہ فارسی قطعہ (روزگار چراغاں، اشتہارِ چراغاں) درج ہے۔ "دستنبو" طبع دوم (۱۸۶۵ء) میں بھی یہ شامل ہے۔

[2] ساٹھ بیت کا یہ فارسی قصیدہ در مدح ملکۂ معظمۂ انگلستان (شمار یافت، روزگار یافت) "دستنبو" طبع اول کے آغاز میں چھپا ہے۔

"کمپنی کا راج اب ختم ہوا۔ اور اس کی جگہ پر ہندوستان کی حکومت کی باگ ہم نے اپنے ہاتھوں میں لے لی ہے۔ سوائے اُن لوگوں کے جو ہماری انگریزی رعایا کے قتل میں حصّہ لینے کے مجرم ہیں، باقی جو لوگ بھی ہتھیار رکھ دیں گے، ان سب کو معاف کر دیا جائے گا۔ ہندوستانیوں کی گود لینے کی رسم آئندہ سے جائز سمجھی جائے گی اور گود لیے لڑکوں کو باپ کی جائداد اور گدّی کا مالک مانا جائے گا۔ کسی کے مذہبی عقیدوں، یا مذہبی رسم و رواج میں کسی طرح کی مداخلت نہ کی جائے گی۔ ہندوستانی والیانِ ریاست کے ساتھ کمپنی نے اس وقت تک جتنے عہد نامے کیے ہیں، اُن کی سب شرطوں پر آئندہ ایمان داری کے ساتھ عمل درآمد کیا جائے گا۔ اس کے بعد کسی ہندوستانی رئیس کی ریاست یا اس کا کوئی حق نہ چھینا جائے گا۔ سارے ہندوستانیوں کے ساتھ ٹھیک اسی طرح کا برتاؤ کیا جائے جس طرح انگریزوں کے ساتھ...."

(ملکہ وکٹوریہ)

ہندوستانی والیانِ ریاست اور ہندوستانی رعایا کے نام ملکہ وکٹوریہ کا یہ اعلان یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہندوستان میں شائع کیا گیا۔ اسی دن لارڈ کیننگ نے خود الٰہ آباد میں دارا گنج کے نزدیک قلعے کے نیچے یہ اعلان، ہزاروں آدمیوں کو پڑھ کر سنایا..... ملکۂ انگلستان کی طرف سے اس اعلان کے شائع ہوتے ہی، اس کے جواب میں اودھ کے معزول بادشاہ واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل کی طرف سے رعایائے اودھ کے نام، حمیتِ ملّی اور غیرتِ قومی کا حامل ایک بصیرت افروز اور دلولہ انگیز اعلانِ عام شائع ہوا، جس کا ایک ایک لفظ بیگم حضرت محل کی بیدار مغزی، اور روشن ضمیری پر دلالت کرتا ہے۔ یہ اعلان اُردو میں تھا۔ یہاں اس کے کچھ جملے، اس کے سرکاری انگریزی ترجمے سے اُردو میں ترجمہ کر کے ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

".... پہلی نومبر ۱۸۵۸ء کا اعلان، جو ہمارے سامنے آیا ہے، بالکل صاف

ہے، اس لیے ہم ۔۔۔۔ بہت سوچ سمجھ کر موجودہ اعلان شائع کرتے ہیں۔" اگر مندرجہ بالا اعلان کے خاص خاص اصلی مقصد ظاہر ہو جائیں اور ہماری رعایا ہوشیار ہو جائے۔

اس اعلان میں لکھا ہے کہ ملک ہندوستان جو ابھی تک کمپنی کے سپرد تھا، اب ملکہ نے اپنی حکومت میں لے لیا ہے اور آئندہ سے ملکہ کے قانون کو مانا جائے گا۔ ہماری مذہبی رعایا کو اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ کمپنی کے قانون، کمپنی کے انگریز ملازم، کمپنی کے گورنر جنرل اور کمپنی کی عدالتیں وغیرہ سب جوں کی توں بنی رہیں گی تو پھر وہ نئی بات کون سی ہوئی جس سے عوام کو فائدہ ہو، یا جس پر ۔۔۔۔ وہ بھروسا کر سکیں؟۔

اس اعلان میں لکھا ہے کہ کمپنی نے جو جو وعدے اور عہد و پیمان کیے ہیں ملکہ انھیں منظور کرے گی۔ لوگوں کو چاہیے کہ اس چال کو غور سے دیکھ لیں۔ کمپنی نے سارے ہندوستان پر قبضہ کر لیا ہے، اور اگر یہ بات قائم رہی تو پھر اس میں نئی بات کیا ہوئی؟ ۔۔۔۔ کمپنی نے بھرت پور کے راجا کو پہلے اپنا بیٹا بتلایا اور پھر اس کا علاقہ لے لیا۔ لاہور کے راجا کو وہ لندن لے گئے اور پھر کبھی اسے ہندوستان لوٹنے نہ دیا۔ نواب شمس الدین خاں کو ایک طرف انھوں نے پھانسی پر لٹکا دیا، اور دوسری طرف اسے سلام کیا۔ پیشوا کو انھوں نے پونا اور ستارا سے نکال دیا، اور زندگی بھر کے لیے بٹھور میں قید کر دیا۔ بنارس کے راجا کو انھوں نے آگرے میں قید کر دیا۔ بہار، اڑیسہ اور بنگال کے راجاؤں کا انھوں نے نام و نشان تک نہیں چھوڑا۔ خود ہمارے قدیم علاقے انھوں نے ہم سے یہ بہانہ کر کے لے لیے، کہ فوج کو تنخواہیں دینی ہیں اور ہمارے ساتھ جو عہد نامہ کیا، اس کی دفعہ (۷) میں انھوں نے یہ قسم کھائی کہ ہم آپ سے اور زیادہ کچھ نہ لیں گے، اس لیے جو انتظام کمپنی نے کر رکھے ہیں، وہ اگر سب قائم رکھے جائیں گے، تو اس سے پہلے کی حالت میں اور اب اس نئی حالت میں کتنا فرق ہوا؟ ۔

یہ سب تو پرانی باتیں ہیں؛ لیکن حال میں بھی قسموں اور عہد ناموں کو توڑ کر،

اور باوجود اس بات کے، کہ انگریزوں نے ہم سے کروڑوں روپے قرض لے رکھے تھے انھوں نے بغیر کسی وجہ کے صرف یہ بہانہ لے کر کہ آپ کا برتاوا اچھا نہیں ہے، اور آپ کی رعایا غیر مطمئن ہے[1]، ہمارا ملک اور کروڑوں روپے کا مال ہم سے چھین لیا۔ اگر ہماری رعایا ہم سے پہلے کے نواب واجد علی شاہ سے غیر مطمئن تھی، تو وہ ہم سے مطمئن کیسے ہو گئی! اور کبھی کسی بھی فرماں روا کے لیے رعایا نے اپنی جان اور مال کو اس طرح قربان کر کے

---

[1] "ملک اودھ کی رعایا برباد ہو رہی ہے فوج تنخواہ سے محروم ہے۔ آئین و عدل کا نام و نشان نہیں، ڈاکوؤں کے غول علاقوں کو برباد کرتے ہیں۔ سرکار انگریز ان خرابیوں اور برائیوں کی زیادہ متحمل نہیں ہو سکتی اور اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ ملک اودھ کا تمام انتظام ہمیشہ کے لیے سرکار کمپنی کے سپرد کر دیا جائے۔"

— گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی

(نقل اشتہار گورنمنٹ انگریزی جو ہر تھانے پر لگایا گیا: ۷ فروری ۱۸۵۶ء)

(بہ حوالہ: نجم الغنی، تاریخ اودھ، جلد پنجم، صفحہ ۲۶۵ — ۲۷۰)

درحقیقت جو کچھ بد انتظامی یا بے اطمینانی اس وقت اودھ میں تھی، وہ انگریزوں کی جان بوجھ کر پیدا کی ہوئی تھی۔ لارڈ ہیسٹنگز لکھتا ہے:

"حقیقت میں اس طرح کا نظام حکومت قائم کرنے کی، جس سے رعایا خوش حال ہو، محض ایک ہی سچی اور کارگر ترکیب ہو سکتی تھی اور وہ یہ کہ انگریز ریزیڈنٹ کو واپس بلا لیا جائے، اور نواب اودھ کو اپنی ریاست کے انتظام میں پوری طرح آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اس طرح اس علاقے کی بے اطمینانی کا سارا گناہ کمپنی کے سر پر ہے۔"

Charles Ball : [1]

History of the Indian Mutiny, Vol. 1, P.152

(بہ حوالہ: پنڈت سندر لال، سنہ ستاون، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء صفحہ ۲۴)

اپنی وفاداری کا ثبوت نہیں دیا۔ جس طرح کہ ہماری رعایا نے ہمارے ساتھ کیا ہے، پھر

لے "ہم لوگوں میں یہ ایک رواج ہے کہ..... پہلے کسی ملکی راجا کا راج لے لیتے ہیں اور پھر تخت سے ہٹائے ہوئے راجا یا اُس کے ولی عہد کی جھوٹی برائیاں کرنے لگتے ہیں:

[Sir John Kay History of the Sepoy War, Vol. III, P. 361-362]

(بحوالہ سنہ ستاون، ص ۱۰۲)

"لارڈ ڈلہوزی کا بیان ہے کہ واجد علی شاہ کے مظالم سے اودھ کی رعایا دُکھی تھی، لیکن جس طرح ۱۸۵۷ء میں سارے اودھ کے زمین داروں، جاگیرداروں، راجاؤں، سپاہیوں، کسانوں، سوداگروں، غرض یہ کہ سب ہندو اور مسلمانوں نے مل کر واجد علی شاہ کو پھر سے اودھ کے تخت پر بٹھانے کے لیے دس دن کے اندر انگریزی حکومت کو اُکھاڑ کر پھینک دیا، اس سے واجد علی شاہ کی حکومت کی ہردل عزیزی اور کمپنی کی حکومت سے ناراضی، دونوں کا صاف پتا چل جاتا ہے۔ اودھ کے اندر اس وقت ایک گاؤں بھی ایسا نہ بچا ہوگا جس نے کمپنی کے جھنڈے کو پھاڑ کر نہ پھینک دیا ہو۔"

(پنڈت سندر لال، سنہ ستاون، صفحہ ۱۱۱)

"سارے اودھ نے ہمارے خلاف ہتھیار اُٹھالیے تھے۔ نہ صرف باضابطہ فوج ہی بلکہ تخت سے اُترے ہوئے نواب کی فوج کے ساٹھ ہزار آدمی، زمین دار، ان کے سپاہی، ڈھائی سو قلعے، جن میں سے بہتوں پر بھاری توپیں لگی ہوئی تھیں، سب کے سب ہمارے خلاف کھڑے ہو گئے۔ ان لوگوں نے کمپنی کی حکومت کو اپنے نوابوں کی حکومت کے ساتھ تول کر دیکھ لیا تھا اور قریب قریب رائے سے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ ان کے نوابوں کی حکومت، کمپنی کی حکومت سے بہتر تھی۔ جو پنشنر ہماری فوج میں کام کر چکے تھے، اُن تک نے صاف صاف ہماری حکومت کے خلاف فیصلہ دے دیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک بغاوت میں شامل تھا۔"

[Red Pamphlet, by G. B. Malleson]

(بحوالہ: سنہ ستاون، ص ۱۱۳) (بقیہ اگلے صفحے پر)

کیا کمی ہے کہ وہ ہمارا ملک ہمیں واپس نہیں دیتے؟

اس کے علاوہ، اس اعلان میں لکھا ہے کہ ملکہ کو اپنا علاقہ بڑھانے کی خواہش نہیں ہے پھر بھی وہ، ان ہندوستانی ریاستوں کو اپنی حکومت میں ملا لینے سے باز نہیں رہ سکتی۔

"اس اعلان میں لکھا ہے کہ عیسائی مذہب سچا ہے، لیکن اور کسی مذہب والوں کے ساتھ زیادتی نہ کی جائے گی اور سب کے ساتھ ایک طرح کا قانونی برتاؤ کیا جائے گا سچے نظام حکومت سے کسی مذہب کے سچے یا جھوٹے ہونے سے کیا تعلق ہے؟۔

سور کھانا اور شراب پینا، چربی کے کارتوس دانت سے کاٹنا اور آٹے، اور مٹھائیوں میں سور کی چربی ملانا، سڑکیں بنانے کے بہانے مندروں اور مسجدوں کو گرانا گرجا بنانا، گلیوں اور کوچوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کرنے کے لیے پادریوں کو بھیجنا۔ ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے لوگ کیسے یقین کر سکتے ہیں کہ ان کے مذہب میں دخل نہ دیا جائے گا۔؟

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ):

"اودھ کی رعایا نے قیدی نواب واجد علی شاہ کے بیٹے برجیس قدر کو لکھنؤ کے تخت پر بٹھا دیا، اور چوں کہ نواب برجیس قدر ابھی نابالغ تھا اس لیے نظام حکومت کی باگ برجیس قدر کی ماں حضرت محل کے ہاتھوں میں سونپ دی گئی۔ اودھ کے سب زمین داروں اور رعایا نے بڑی مسرت کے ساتھ بیگم حضرت محل کو اپنا حکمران منظور کر لیا۔ بیگم حضرت محل کی تعریف کرتے ہوئے رسل لکھتا ہے: "بیگم میں بڑی طاقت اور قابلیت دکھا دیتی ہے۔ بیگم نے ہمارے ساتھ لگاتار جنگ کرتے رہنے کا اعلان کر دیا ہے۔ ان ... کی ہمت اور طاقت کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ زنان خانے کے اندر رہ کر بھی یہ کافی زیادہ عملی اور دماغی قوت اپنے اندر پیدا کر لیتی ہیں۔" اودھ کے لوگ "اپنے ملک اور اپنے بادشاہ کے لیے دیش بھگتی کے جذبات سے متاثر ہو کر جنگ کر رہے تھے۔"

بہ حوالہ: سنہ ستاون، ص ۱۷۱ - ۱۸۹

اِس اعلان میں لکھا ہے کہ ۔۔۔۔۔ جن لوگوں نے قتل کیے ہیں یا قتلوں میں مدد دی ہے، اُن پر کوئی رحم نہ کیا جائے گا۔ باقی سب کو معاف کر دیا جائے گا۔ ایک بے وقوف آدمی بھی دیکھ سکتا ہے کہ اس اعلان کے مطابق قصوروار یا بے قصور کوئی آدمی بھی نہیں بچ سکتا۔۔۔۔۔ ایک بات اس میں صاف کہی گئی ہے وہ یہ کہ کسی بھی قصوروار آدمی کو نہ چھوڑا جائے گا۔ اس لیے جس گاؤں یا علاقے میں ہماری فوج ٹھہری ہے، اُس کے باشندے نہیں بچ سکتے۔۔۔۔۔ اس اعلان کو پڑھ کر جس میں کہ صاف دشمنی بھری ہوئی ہے، ہمیں اپنی رعایا کی حالت پر بہت افسوس ہے۔

اب ہم ایک صاف اور معتبر فرمان جاری کرتے ہیں کہ ہماری رعایا میں سے جن جن لوگوں نے بے وقوفی کر کے گاؤں کے مکھیوں کی حیثیت سے اپنے تئیں انگریزوں کے سامنے پیش کیا ہے، وہ پہلی جنوری ۱۸۵۹ء سے پہلے ہمارے کیمپ میں آ کر حاضر ہوں بلاشبہ اُن کا قصور معاف کر دیا جائے گا۔۔۔۔۔ آج تک کبھی کسی نے نہیں دیکھا، کہ انگریز نے کسی کا قصور معاف کیا ہو۔

ہماری رعایا میں سے کوئی انگریزوں کے اعلان کے دھوکے میں نہ آئے۔[لے]

—— بیگم حضرت محل

Charles Ball.

History of the Indian Mutiny, Vol. II

(بہ حوالہ: سنہ ستاون، صفحہ ۲۳۰۔۲۳۳)

لے "لکھنؤ کے زوال کے بعد کمپنی کی فوج نے لکھنؤ کے باشندوں کے ساتھ جس طرح کا سلوک کیا وہ "کھلے عام لوٹ اور قتلِ عام" ہی لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ لفٹیننٹ ماجنڈی لکھتا ہے کہ: لکھنؤ کے اندر اس وقت کے قتلِ عام میں کسی طرح کی تمیز نہیں کی گئی۔"

[Lieut. Majendie's Up among the Pandies. P.195-196]

قتل سے پہلے جس طرح کی سخت تکلیفیں لوگوں کو دی گئیں، اس کی کئی (باقی اگلے صفحہ پر)

(........ حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ :) مثالیں رسل نے اپنی کتاب میں دی ہیں، ان میں سے صرف ایک ہم نیچے نقل کرتے ہیں :

"کچھ سپاہی ابھی زندہ تھے اور اُن پر رحم کرکے انھیں مار ڈالا گیا، لیکن ان میں سے ایک کو کھینچ کر مکان سے باہر ریتیلے میدان میں لایا گیا۔ اُسے ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچا گیا، ایک سہولت کی جگہ لایا گیا، وہاں اس کو لٹا دیا گیا۔ کچھ انگریز سپاہیوں نے اس کے منھ اور جسم میں سنگینیں بھونک کر اُسے لٹائے رکھا۔ دوسرے لوگ لاش کو جلانے کے لیے لکڑی جمع کر لائے۔ جب سب تیار ہو گیا تو اُسے زندہ بھون دیا گیا! اس کام کے کرنے والے انگریز تھے اور کئی افسر کھڑے دیکھتے رہے، لیکن کسی نے مداخلت نہ کی! اس دوزخی ظلم وستم کی خوفناکی اس وقت اور زیادہ بڑھ گئی، جب اُس بدقسمت ستم زدہ نے اُدھ جلی اور زندہ حالت میں بھاگ کر بچنے کی کوشش کی یکایک کوشش کرکے وہ چتا سے کود پڑا۔ اُس کے جسم کا گوشت ہڈیوں سے لٹک رہا تھا وہ کچھ گز دوڑا، پھر پکڑ لیا گیا، پھر آگ پر رکھ دیا گیا اور جب تک راکھ نہ ہو گیا سنگینوں سے دبا کر رکھا گیا۔" [Russell's Diary, Vol. I, P. 302]

اس کے مقابلے میں انگریز قیدیوں کے ساتھ بیگم حضرت محل کا سلوک بالکل دوسری طرح کا تھا۔ شروع کے دنوں میں جب کہ لکھنؤ کے اندر انقلابیوں کا پلّہ بھاری تھا، کچھ انگریز مرد اور عورتیں لکھنؤ میں قید کر لیے گئے تھے، لیکن چھ مہینے تک اُن کی جان پر کوئی حملہ نہ کیا گیا۔ جس وقت کمپنی کی فوج نے شہر میں گھس کر قصوروار اور بے قصور سب کا ایک طرف سے قتلِ عام شروع کیا، کچھ جوشیلے انقلابیوں نے محل میں جاکر بیگم سے درخواست کی کہ انگریز قیدیوں کو ہمارے حوالے کر دیجیے۔ بیگم نے سات آٹھ انگریز مردوں کو ان کے حوالے کر دیا۔ انھیں فوراً گولی سے اُڑا دیا گیا۔ لیکن جب کچھ انقلابیوں نے ضد کی کہ قیدی انگریز عورتوں کو بھی مار ڈالا جائے تو بیگم نے انکار کر دیا۔ مؤرّخ چارلس بال لکھتا ہے :

"عورتوں کے بارے میں بیگم نے اُن لوگوں کی مانگ کو پورا کرنے سے زوردار کے ساتھ انکار کر دیا۔ بیگم نے فوراً محل کے زنان خانے کے اندر (بقیہ اگلے صفحے پر)

(.....حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ): ان انگریز عورتوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ بیگم کا یہ کام عورتوں کی شان اور آن کو بڑھانے والا تھا۔"

Charles Ball:

History of the Indian Mutiny; Vol.II, P. 94

(بہ حوالہ: پنڈت سندر لال، سن ستاون صفحہ ۱۹۳۔۱۹۴)

ضمیمۂ سوم :

نثر از قلم مرزا اسد اللہ خاں غالب، درباب

تحسین و تائید سرکارِ انگریزی

"ملک سراسر بے خس و خار ہو گیا ہے، قلمروِ ہند نمونہ گلزار ہو گیا ہے۔ بہشت اور بیکنٹھ جو مرنے کے بعد متصور تھا اب زندگی میں موجود ہے وہ احمق ہے، وہ ناقدر دان ہے جو انگریزی عمل داری سے ناخوشنود ہے۔"
(غالب)

مطبوعہ

(اودھ اخبار، لکھنؤ، ۲۲ اپریل ۱۸۶۲ء، صفحہ ۲۸۱)

اودھ اخبار، لکھنؤ کی اشاعت ۲۲ر اپریل ۱۸۶۲ء میں "ہندوستان کی سمجھ" کے تحت اخبار نے لکھا ہے کہ:

"افغانستان کا روزنامچہ مدتِ دراز سے سُنا جاتا ہے۔ دس برس سے زیادہ ہوئے کہ صحائف اخبار میں دیکھا جاتا ہے کہ غرض سالہا سال گذر گئے، سُنتے سُنتے کان بھر گئے، کسی امر کا ظہور نہ پایا۔ افسانے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ان دنوں بھی ویسی ہی باتوں نے شہرتیں پائیں۔ چاروں طرف لوگوں نے بے پر کی اُڑائیں۔ ہندوستانیوں کی سمجھ کے قربان، کیا کیا عقلیں ہیں۔ کیسے کیسے انسان نئے نئے باندھنو باندھے۔ تو طلے اُٹھائے، محض اپنے گمان پر سیکڑوں قیاس لگائے۔ اے بے فکرو، خدا سے ڈرو، ناحق عالم کو پریشان نہ کرو۔ معلوم نہیں کہ ۔۔۔ یہ بے اصل باتیں کون گھڑا کرتا ہے، خصوصاً وقائع نگارانِ انگریزی کو کون لکھا کرتا ہے ۔۔۔۔۔

آج کل دانائے روزگار، سرآمد اُولوالابصار، ارسطو صفت، فلاطون فطنت، جناب والاشان، عالی مناقب، مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نے جن کی سلامتِ ذہنِ مستقیم کی قسم کھائیے، استقامتِ رائے سلیم کے صدقے جائیے، نافہموں کی فہمائش میں ایک نثر تحریر فرمائی ہے، ہم اس کو درجِ اخبار کرتے ہیں ۔۔۔۔"

اس ادارتی نوٹ کے بعد "نثر" کے عنوان سے مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کا ایک نثر پارہ درج کیا گیا ہے جو سرتاسر حکام کی تائید و وکالت اور انگریزی عمل داری کی برکتوں اور نعمتوں کے "اعتراف" میں ہے۔ غالبؔ نے انگریز حکام کو "مؤید من اللہ" بتایا ہے اور یہ "گواہی" دی ہے کہ: "ملک سراسر بے خس و خار ہو گیا ہے۔ قلمروِ ہند، نمونۂ گلزار ہو گیا ہے ۔۔۔۔" اور بہشت جو مرنے کے بعد متصور تھا، اب زندگی میں موجود ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ ۝

غالب کی یہ نثر اوّل اوّل اکبر علی خاں عرشی زادہ نے اپنی زیر ترتیب کتاب "غالبیہ" کے تیسرے باب میں امیر حسن نورانی صاحب (لکھنؤ) کے شکریے کے ساتھ درج کی اور نگار، رام پور شمارہ جون ۱۹۶۳ء صفحہ ۴۱، ۴۲ میں شائع ہوئی۔ یہ قطعۂ عبارت اکبر علی خاں صاحب کے ایک قیمتی مضمون "غالب اپنے معاصر اخبارات میں" بھی شامل ہے[1]۔ یہاں انقلابِ ستاون کے بارے میں غالب کا یہ کم معروف نثری ٹکڑا بلا تبصرہ درج کیا جاتا ہے:

"یارب! دُنیا میں جتنے تیرے بندے ہیں، سب اپنا بھلا چاہتے ہیں۔ آیا کج فہم واقعہ طلب لوگ کیا چاہتے ہیں۔ فتنہ و فساد سے خوش اور امن و امان کے دشمن ہیں۔ گویا اپنے زن و فرزند و مال و جان کے دشمن ہیں۔ اگرچہ اس ہنگامے میں آپ بھی برباد ہوتے ہیں، لیکن جہاں ہنگامے کی خبر سنتے ہیں شاد ہوتے ہیں، سینکڑوں بھری کشتیاں اس دریا میں سرنگوں دیکھ چکے ہیں، یہ عافیت دشمن عبرت نہیں پکڑتے اور جو کوئی ان کو سمجھائے تو اس سے جھگڑتے ہیں۔ کابل کے اخبار پر کس رغبت سے کان دھرتے ہیں اور پھر اس اخبار پر کیا کیا آثار مرتب کرتے ہیں۔

سرکارِ انگریزی کی از بسکہ توجہ طرف رفاہِ عام کے ہے، ادھر کا خیال یا قصد جو کچھ ہے واسطے انتظام کے ہے بہ فرضِ محال اگر اس گروہ میں کسی نے کچھ بڑھ کر حوصلہ کیا اور صاحبانِ عالی شان، معدلت نشان کا مقابلہ کیا، بات صاف صاف ہے، جائے انصاف ہے، جن مؤید من اللہ حاکموں نے اپنی فوجِ باغی کو صرف اپنے حسنِ تدبیر و ضربِ شمشیر سے زیر کیا ہے، اب جو یہ فوجِ جرّار و لشکرِ بے شمار ساتھ ہے، مخالف کا دفع کرنا مشکل کیا ہے۔

---

[1] نقوش، لاہور، شمارہ ۱۱۱، غالب نمبر، فروری ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۲۷۔ ۱۲۸

ہندو، مسلمان جو اہلِ ہند اگلے فتنہ و فساد سے بچ رہے ہیں اور اس کے وبا اور قحط کے دُکھ سہے ہیں، وہ اپنی سلامتی و صحت پر خدا کا شکر بجالائیں۔ نیا پاکیزہ، سستا اناج فراغت سے کھائیں، اگن بوٹ اور ریل گاڑی کی صنعت کو دیکھیں، تار بجلی میں پیام کے پہنچنے کی سُرعت کو دیکھیں، مدرسوں کی رونق اور رواج علم کی کثرت ملاحظہ فرمائیں۔ حکام کی مہربانیاں اپنی نسبت ملاحظہ فرمائیں۔ ملک سراسر بے خس و خار ہو گیا ہے۔ بہشت اور بیکنٹھ جو مرنے کے بعد متصور تھا، اب زندگی میں موجود ہے۔ وہ احمق ہے، وہ ناقدرداں ہے جو انگریزی عمل داری سے ناخوشنود ہے۔ حکام کو ملک کی آبادی اور رعیت کی آسودگی منظور بہر صورت ہے اگر احیاناً کوئی اپنے حق کو نا پہنچے تو یہ اُس شخص کی خوبیِ قسمت ہے۔ آدمی رحمتِ خاص کو نہ دیکھے، رحمتِ عام پر نظر کرے اگر اس کا کوئی مدعا حاصل نہ ہو تو اپنے بخت و قسمت کا گلہ کرے ... امن و امان کا طالب، بخت و قسمت کا شاکی، غالب، فقط۔"

(اُودھ اخبار، لکھنؤ، ۲۳ اپریل ۱۸۶۲ء، صفحہ ۲۸۱)[1]

---

[1] آپ کے اخبارِ حق نگار، مطبوعہ ۲۲ اپریل سنہ رواں (۱۸۶۲ء) صفحہ ۲۸۱ میں عبارت نثر ریختہ قلم جواہر رقم ... جناب والا مناقب مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی ... کی درباب تنبیہ عوام و کج فہمانِ اہلِ ہند میری نظر سے گزری جس سے یہ مقصود ہے کہ افواہ جنگ ایرانیاں بہ افغاناں میں خام لوگ کیا کیا خیالِ خام ظاہر کرتے ہیں ... بہ طبیعت مضمونِ خیر اندیشی جناب مرشدنا و اُستادنا حضرتِ غالب ... عبادہ تنبیہ الجہال، نسبت شہرت جنگِ اہلِ ایراں بہ افغاناں، بحریر جناب ممدوح کی حق بیجا اور عین خیر اندیشیِ حاکم و محکوم ہے۔" (اُودھ اخبار، لکھنؤ، ۱۳ مئی ۱۸۶۲ء)

زمانے کا رنگ اور ہے کوئی حاکم کوئی سکرتر میرا آشنا نہیں بڑے میرے مربیّ قدر دان جناب
اڈمنسٹن صاحب۔ وہ بھی چیف سکرتری سے لفٹنٹ گورنر ہو گئے۔ وہ سکرتر رہتے
تو مجھ کو کچھ غم نہ تھا۔ اب تک میں اپنی کو یہ بھی نہیں سمجھا ہوں بے گناہ ہوں یا گنہگار
مقبول ہوں یا مردود۔ مانا کہ کوئی خیرخواہی نہیں کی جو کسی انعام کا مستحق ہوں
لیکن کوئی بے وفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستور قدیم کو برہم کر دے۔ بہرحال اس
کشمکش میں ہوں۔ راہ چارہ مسدود اور ترکِ ہم موجود عرفی خوب کہتا ہے ؎ مرا
زمانہ طناز دست بستہ و تیغ   زند بفرقم و گوید کہ ہاں سرے خارد
مرقومہ صبح یکشنبہ ۷ نومبر ۱۸۵۹ء